www.iqbalkalmati.blogspot.com

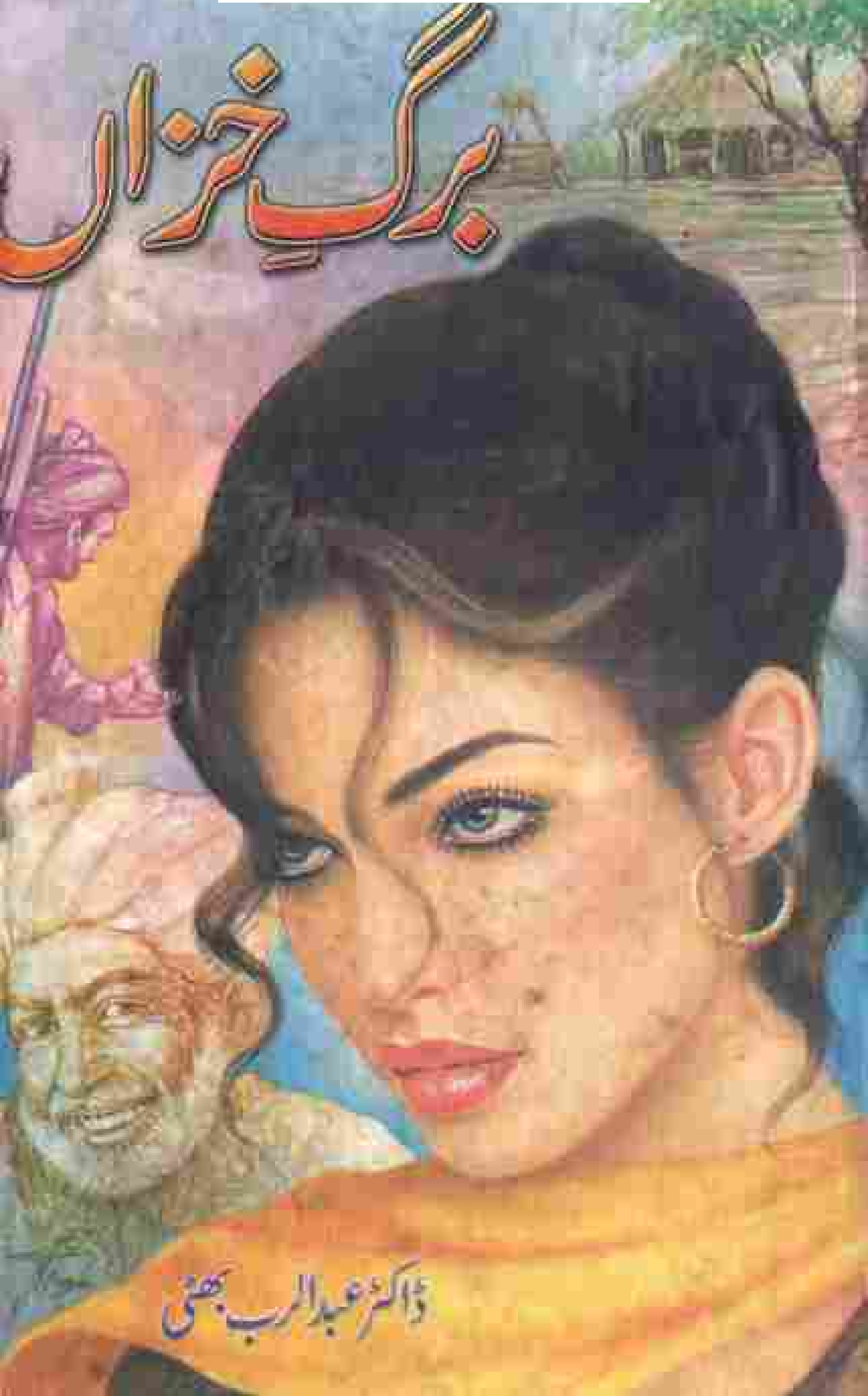

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عرضِ مصنف

برگِ خزاں کی کہانی ایک چومکھی حالاتِ زدگان کا فسانہ ہے۔ یہ ان نادار اور سسکتے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے جن کی دادرسی کسی نے نہ کی...... جو اپنے ہی نامساعد حالات کا شکار ہو کر ایڑیاں رگڑتے رہے۔

ان کے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔

یہ ایک ایسے کاروانِ دشت کے بے منزل ہونے کی داستان ہے جس کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔

جابر اور اپنی ظالمانہ ہٹ پر قائم رہنے والوں کے بھیانک چہرے...... جو معصوم مجبور اور بے کس لوگوں کو صرف اور صرف اپنی غلامی کی زنجیر میں جکڑنا چاہتے تھے۔

ظلم کی ان زنجیروں کو توڑنے والے دو مسیحاؤں کی کہانی...... جب انہوں نے ان کچلے ہوئے لوگوں کی دادرسی کرنا چاہی تو ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔

مہم جوئی، سنسنی خیز اور پے در پے، پل بہ پل بدلتی یہ داستانِ دراز یقیناً اپنا آپ منوانے کی کوشش کرے گی۔

آخر میں مَیں اپنے قارئین کرام کا مشکور ہوں جنہوں نے علی میاں پبلی کیشنز سے چھپنے والی میری پہلی کتاب ''بے پتوار'' کو پسند کیا اور مجھے نئی کتاب لانے کی جسارت بخشی...... بہت بہت شکریہ!

خیر اندیش

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تپتی ہوئی ریت پر پڑے ایک اونٹ کے پنجر کے قریب مردار خور گدھ پھدک پھدک کر آپس میں لڑ رہے تھے، سورج آگ برسا رہا تھا، جلتے سورج کی پُر تپش روشنی سے ریت آتشیں ذرات کی مانند آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ پینتالیس سالہ سائیں بخش آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا چھجا بنائے حدنگاہ تک پھیلے ہوئے تھر کے لق ودق صحرا کو دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شاید راستے کا تعین کرنا چاہتا تھا، اس کے عقب میں ایک عارضی پڑاؤ نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک بدحال کارواں تھا، یہ لوگ تھر کی اس سرزمین بھاگل پور کے باشندے تھے جو عمر کوٹ ہی کا ایک چھوٹا سا دیہات تھا، پچھلے کچھ عرصے سے اس خطے میں بڑا جان لیوا قحط پڑا تھا، جس کا سبب برسات کا نہ ہونا تھا اور جس سے پورا خطہ مسلسل خشک سالی کا شکار رہتا چلا آ رہا تھا۔ بھوک، پیاس نے مردار خور گدھوں کی طرح ڈیرے ڈال لئے تھے اور انسان کیا مرد، عورتیں اور بچے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر لبِ تر ساں واکئے بڑے کرب ناک انداز میں موت کو گلے لگا رہے تھے کہ ان کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، انسان جانوروں کی طرح مر رہے تھے اور جانوروں کی اموات کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا، ریت پر جابجا ایسے بھیانک مناظر بکھرے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جانوروں کے ادھڑے ہوئے پنجروں کے بیچ کبھی کسی انسان کا ڈھانچہ بھی نظر آ جاتا۔ کسی نے درست ہی کہا ہے مصیبتیں زیادہ تر غریبوں کو بھگتنا پڑتی ہیں اور چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی ہیں، خشک سالی اور قحط زدگی نے کیا ڈیرے ڈالے کہ وبائی امراض بھی پھوٹ پڑے گیسٹرو، ہیپاٹائٹس تو تھے ہی ان میں ایک اور پُر اسرار بیماری بھی پھوٹ پڑی تھی جس کی اس صحرائی خطے میں بڑی دہشت پائی جاتی تھی، اس میں سکے برابر سر کی جلد پر سفیدی مائل دھبہ سا ابھرتا تھا جو کھوپڑی تک کو گلا کر دماغ میں ایک خطرناک زخم کی صورت میں اتر جاتا تھا اور انسان مردے سے بھی بدتر زندگی گزارنے لگتا تھا۔

محکمہ صحت اس ضمن میں اپنے مقدور بھر اقدامات میں مصروف تھا اور کئی سرکاری وغیر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرکاری طبی وغیر طبی تنظیمیں اور حقوق انسانی کی فلاحی تنظیمیں بھی مصروف عمل تھیں مگر باوجود ان سب کاوشوں کے حالات قابو میں نہیں آ رہے تھے، ادویات اور خوراک کی ترسیل آبادی کے لحاظ سے کم ہی نہیں بلکہ استہزائیہ حد تک ناکافی تھی۔ بہرطور ایک بھیانک مذاق کے طور پر ان نادار اور قحط زدگان کی امداد کے نام پر خانہ پُری کی جا رہی تھی۔

اس لٹے پٹے کارواں کا پینتالیس سالہ سالار سائیں بخش اپنی آزیت کے جلتے ابلتے ذرات سے چندھیائی آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا چھجا بنائے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھر کے جلتے سلگتے صحرا کو دیکھنے میں مصروف تھا، وہ شاید راستے کے تعین کے ساتھ کسی امدادی کیمپ یا موبائل کیئر ایمپ کا بھی متلاشی تھا کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق کل 9 گھرانوں پر مشتمل اس کارواں کے پاس امدادی ٹیموں یا ہیلی کاپٹروں سے پھینکا ہوا سامان ختم ہونے کو تھا اور ان کی منزل ہنوز دلی دوراست کے مصداق ابھی بہت دور تھی، یہ لوگ چھرو کے راستے میر پور خاص پہنچنا چاہتے تھے، 9 گھرانوں پر مشتمل اس قافلے میں صرف عمر کوٹ کے دیہات سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی شامل نہ تھے بلکہ ان میں چیلر اور مٹھی کے دو خاندان تھے جبکہ ایک خاندان جھڈو کا تھا، ان میں چار خاندان چھرو تک کے سفر کا ارادہ رکھتے تھے باقی میر پور خاص اور حیدر آباد، ٹنڈو الہ یار جانا چاہتے تھے۔ ادھر سالار کارواں سائیں بخش کی ذمہ داری ان قحط زدگان گھرانوں کو بخیر و عافیت منزل مقصود تک پہنچانا تھا۔ جبکہ موجودہ حالات کی سنگین صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے اسے اپنا یہ عزم مصمم متزلزل سا ہوتا محسوس ہو رہا تھا لیکن ہمت اس نے بھی نہیں ہاری تھی، روٹی سے زیادہ اہم مسئلہ اس وقت پانی کا تھا، بڑوں کو صرف منہ گیلا کرنے کی اجازت تھی جبکہ چھوٹے بچوں کو ایک خاص مقدار میں پانی پلایا جا رہا تھا، ان بچوں میں ایسے معصوم اور لخت جگر بھی تھے جو گیسٹرو (اسہال) جیسی مہلک بیماری کا شکار تھے، بوڑھیوں اور عورتوں کو البتہ چند گھونٹ پانی پینے کی اجازت تھی، سائیں بخش جانتا تھا کہ اس کے پاس راستہ بھٹکنے کی شکل میں صرف موت کا ہی راستہ باقی بچتا تھا، ایک اذیت ناک موت۔ تاہم وہ اپنے کام میں ماہر تھا، وہ تو دن میں اڑتی ریت اور رات میں آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی مدد سے منزل کا پتہ چلا لیتا تھا، وہ اپنے گوٹھ کا کھیا تھا جسے مقامی زبان میں ''چنگا مڑس'' کہا جاتا تھا۔

''سائیں! ہم راستہ تو نہیں بھٹک رہے......؟'' اچانک سائیں بخش کے کانوں میں ایک نحیف سی آواز ابھری۔ یہ مٹھل تھا، ایک مدقوق سا بوڑھا، جھلسی ہوئی رنگت اور فاقہ زدہ چہرے پر جھریوں کا جال۔

''نہیں چاچا......! راستہ بھلا ہم کیسے بھول سکتے ہیں، میں تو امدادی ٹیموں کے خیمے کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' سائیں بخش نے بے کیف لہجے میں اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

مٹھل کے جھریوں بھرے چہرے پر بے بسی اور پریشانی کے آثار تھے، وہ میر کارواں کے بیزار کن جواب پر واپس اپنے خیمے کی طرف بڑھا۔ تین سالخوردہ سی چارپائیوں کو مثلث کے انداز میں آمنے سامنے کھڑا کر کے اس پر میلی چادریں اور رلیاں ڈال کر جھونپڑی نما خیمہ سا بنایا گیا تھا، وہ اس خیمے کے اندر آ گیا، گرم تپتی ہوئی ریت پر پھٹی پرانی اور بوسیدہ سی دری بچھی ہوئی تھی جس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چار افراد بیٹھے تھے، ان میں ایک عمر رسیدہ عورت مائی عجیباں، مٹھل کی بیوی تھی، دوسرا ایک سانولی رنگت کا مگر پُر وجیہہ نوجوان سارنگ تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک نوخیز دوشیزہ ملوکاں تھی جو سارنگ کی چھوٹی بہن تھی، ماں اور بیٹی نے خالصتاً مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا، میلا چیکٹ اور پیوند زدہ رنگ دار لاچا اور آدھی تنگ آستینوں والی پیلی کرتیاں...... سانولی کلائیوں سے کہنیوں تک سفید پلاسٹک کے کڑے چڑھے ہوئے تھے جو بادی النظر میں ہاتھی دانت کے بنے نظر آ رہے تھے۔ ناک میں ابلق اور کانوں کی دونوں کن پڑیاں (لویں) چھدی ہوئی تھیں جن میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیں جھنجنا رہی تھی، پیروں میں ریت سے اٹے ہوئے گھسے نما پرانے جوتے تھے، دونوں ماں بیٹیاں دبے دبے نقوش کی حامل تھیں البتہ نوجوان سارنگ نے گھیر دار شلوار اور اوپر صدری (واسکٹ) ڈال رکھی تھی، اس کے دونوں کانوں کی لودوں سے چھلے نما بالیاں جھول رہی تھیں، اس کے نقوش اگرچہ موٹے تھے مگر ان میں ایک خاص قسم کی مردانہ جاذبیت تھی، اس کی عمر بمشکل چوبیس پچیس سال رہی ہو گی، ان لوگوں کے چہرے بری طرح ستے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر سفید سفید خشک پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

''کیا کہہ رہا ہے بابا......! یہ اپڑاں سائیں بخش...... کیا راستہ بھول گیا ہے؟'' نوجوان سارنگ نے اپنے بوڑھے باپ مٹھل کو منہ لٹکائے اندر داخل ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

مٹھل ٹوٹے ٹوٹے انداز میں ایک کونے میں نڈھال سا بیٹھتا ہوا بولا۔

''راستہ تو نہیں بھولا پر کچھ پریشان نظر آتا ہے، کہہ رہا تھا کہ مدد کرنے والی ٹیموں کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

باپ کی بات سن کر نوجوان سارنگ کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بابا......! یہ ٹیمیں ہماری کیا مدد کریں گی، یہ تو دکھاوا کر رہی ہیں، ہمارا پیٹ دکھا کر یہ لوگ چندہ بٹور کر ہڑپ کر جاتے ہیں اور کسی ایک قافلے کو دیکھ کر کچے اناج کی ایک بوری پھینک دیتے ہیں، وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی...... ہونہہ......!'' اس کے جوان مگر تلخ لہجے میں صدیوں کے تجربوں کی تپش تھی۔

''ہاپٹ......! تُو صحیح کہتا ہے، پر دعا کر ہم کھیریت سے میر پور پہنچ جائیں۔'' مٹھل نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

سارنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے لگا تو اس کی بوڑھی ماں عجیباں نے سوکھے منہ سے پوچھا۔ ''کدھر جا رہا ہے پُٹ......؟''

''ابھی آتا ہوں۔'' کہہ کر سارنگ باہر نکل گیا، اس کے خیمے سے باہر نکلتے ہی مٹھل خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ''کدھر جائے گا، اڑیں چاچے سکھیو کی کھیریت پوچھنے اور کیا جیسے کھد بڑا مزے میں ہے...... سب جانتا ہوں یہ کیوں بار بار ہمیں چھوڑ کر سکھیو کے پاس بھاگتا ہے۔''

''اڑے سارو کے پیو......! کیوں اڑیں پٹ سے ساڑ کرتا ہے ڑے بھا سکھیو بھی تو آخر تیرا بھرا ہے۔'' مائی عجیباں نے کہا تو مٹھل منہ بسور کر رہ گیا۔

سارنگ اپنے خیمے سے نکل کر چند لمحے کے لیے کھڑا حدِ نگاہ پھیلے تپتے ریگ زار کو دیکھتا رہا، بادِ سموم کے تھپیڑوں سے اسے اپنا چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ گیا پھر ایک خیمے کے قریب پہنچ کر رک گیا، سورج آگ اگل رہا تھا، سارنگ کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، اس نے پہلے اپنے کاندھے پر دھری میلی چیکٹ اجرک سے اپنا چہرہ پونچھا، اسی وقت اندر سے کسی نے کھرکھراتی آواز میں پوچھا۔ ''کون ہے ڑے باہر...... اندر کیوں نہیں آتا پڑا ہے نا......؟'' اکھڑے سے لہجے میں اس آواز پر سارنگ نے غیر محسوس انداز میں تلخی سے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا اور وہیں کھڑے کھڑے با آواز بلند بولا۔ ''میں ہوں ادا سارنگ......!''

''آ جا ڑے پھر باہر کیوں کھڑا ہے عورتوں کی طرح...... کیا بابا نے بلایا ہے میکوں (مجھے)۔'' وہی بھتے سے اکھڑی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ خیمے کے آگے پردے کے طور پر جھولتی رلی کے میلے ٹاٹ کے روزنوں سے شاید سارنگ کو اندر سے دیکھ لیا گیا تھا۔

سارنگ ٹاٹ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا، سامنے گرم ریت والے خیمے کے فرش پر ایک دبلا پتلا اور چھریرا سانو جوان شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا ہاتھ کی بنی سوکھے پتے کی بیڑی مٹھی

میں دبائے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا، جیسے تا حبس زدہ ماحول کثیف ہو رہا تھا، یہ سارنگ کا بڑا شادی شدہ بھائی خالق داد خالقو تھا، اس کی جوان العمر بیوی اللہ وسائی اس کے قریب ہی چوکڑی مارے بیٹھی اپنی گود میں اپنے ڈیڑھ سالہ بچے منٹھار کو دودھ پلا رہی تھی، وہ خاصی قبول صورت تھی مگر قحط اور بھوک نے اس کے سلونے چہرے کی رعنائی چھین لی تھی۔

وہ بھی علاقائی طرز کا لباس پہنے تھی، اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر اپنے دیور سارنگ کی طرف ایک نظر دیکھا پھر وہ اپنے گود کے بچے کو دودھ پلانے لگی۔ ''پانی لینے آیا ہے تو واپس لوٹ جا...... اب تو اڑیں بالکے منٹھو کا گیلا کپڑا بھی میری زبان کی طرح سوکھ گیا ہے''۔ خالقو نے ایک کش لگا کر کہا۔

سارنگ نے کھڑے کھڑے ایک افسردہ سی نظر اپنی بھابی اللہ وسائی اور پھر اس کے بچے پر ڈالی جو اب مسلسل روئے جا رہا تھا، اس ننھی سی معصوم جان کو بھی شاید اس اذیت ناکی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اپنی زبان کی طرح سوکھی چھاتی اس کے منہ سے لگائے بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میں پانی لاتا ہوں ادا......!'' سارنگ کا دل بچے اور ماں کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا، اس لئے بھی شاید وہ ماں اور بچے کی آس بندھا کر واپس جانے لگا تو خالقو تمسخرانہ انداز میں قہقہہ بلند کر کے بولا۔

''اڑے سارو......! تُو کدھر سے پانی لائے گا ڑے...... کیا باہر سندھو دریا پھوٹ پڑا ہے یا اس نے سو سال بعد آ پڑاں راستہ پھیر لیا ہے...... ہا...... ہا...... ہا......''

بھوک، افلاس اور ہلاکت آمیز فلاکت نے شاید خالقو کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا، سارنگ خاموشی سے باہر آ گیا۔ اسے اپنے بڑے بھائی پر غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیسا مرد تھا جو بے فکری سے اندر بیٹھا بیڑی سونت رہا ہے، اس کے سامنے اس کا بچہ دودھ اور پانی کے لیے بلک رہا تھا، سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی سے بہت محبت تھی، سارنگ اسے بھابی کی بجائے ادی جیجل کہہ کر پکارتا تھا، وہ بھی اس کا بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو سارنگ کو وہ ماں کے روپ میں محسوس ہوئی تھی، سارنگ کو کبھی اپنی ماں سے پیار نہیں ملا تھا، اسے حقے کی شروع سے عادت تھی، یہ بھی اس کے شوہر مٹھل نے لگوائی تھی، سارنگ نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماں، باپ دونوں کو ہی خود سے دور پایا تھا، وہ اس طرح کہ مٹھل اور عجیباں اپنے گوپوں (تھر میں بنی سرکنڈوں کی جھونپڑیاں) سے بہت دور وڈیرے بشام خان کی زمینوں پر ''رہا کی'' (کھیت مزدوری) کرتے تھے اور رات گئے جب لوٹتے تھے تو

تھک کر نڈھال ہو جاتے تھے، ایسے میں اللہ وسائی کی ماں مائی خیراں جو مجیاں کی چھوٹی بہن اور سارنگ کی خالہ تھی، سارنگ اور ملوکاں کا بڑی بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی، وہ ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی، سارنگ کی اپنی بھابی اللہ وسائی سے انسیت کی وجہ یہی تھی اور پھر جب اللہ وسائی اس کی بھابی بن کر گھر آ گئی تو سارنگ اور ملوکاں بہت خوش ہوتے تھے، خیراں اس دوران مر چکی تھی، اللہ وسائی نہ صرف بہت اچھی بیوی اور بہو ہی نہیں تھی بلکہ بھابی بھی تھی مگر خالقو گرم طبیعت کا مالک تھا، خواہ مخواہ ہی اللہ وسائی سے بات بے بات پر جھگڑتا رہتا تھا، مٹھل اور مجیاں نے ساری عمر اپنی ہڈیاں گلا کر خود کمایا اور بچوں کو کھلایا تھا، وہ غریب بے چارے یہی سمجھے تھے کہ شاید ہم بڈھوں کی وجہ سے ان میں روز جھگڑا ہوتا ہے لہٰذا ان کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا اور خالقو کو الگ گوپہ بنا کر رہنے کا فیصلہ سنا دیا۔ خالقو نے اس کا الٹا مطلب لیا۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ ماں باپ اس سے بیزار ہو چکے تھے، ویسے بھی خالقو ایک ہڈحرام اور نکھٹو شخص تھا، وہ غصے میں آ کر الگ تو ہو گیا مگر کھانے کے لالے پڑ گئے مجبوراً اس نے مزدوری شروع کی تو اگلے ہی دن ہانپتا ہوا ایک رتیلے بھٹ پر اوندھے منہ پایا گیا پھر تب سے سارنگ اور ملوکاں تھوڑا بہت اناج اس کے گوپے میں ڈال آتے تھے مگر خالقو بھی ہٹ کا پکا تھا، اس کی حالت دیکھ کر سارنگ اور ملوکاں کی منت سماجت کرتا پھر مٹھل اور مجیاں اپنے نکھٹو بیٹے خالقو اور بہو اللہ وسائی کو واپس اپنے گوپے میں لانے کے لیے ان کے پاس گئے بھی تھے مگر خالقو بھی ایک ہٹیلا تھا، وہ نہ گیا تاہم پھر آہستہ آہستہ خالقو بھی کام پر جانے لگا پھر بھی وہ اتنا کام نہیں کرتا تھا جتنا اسے کرنا چاہئے تھا۔

یہی سبب تھا کہ سارنگ کو آج اپنی بھابی بلکہ ادی ہیجل کو اس حالت میں اس کے بیٹے سمیت دیکھ کر سخت دکھ ہو رہا تھا، وہ جب خیمے سے نکلا تو اللہ وسائی نے پژمردہ چہرہ اٹھا کر ایک آس بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی جیسے کہہ رہی ہو ''ادا سارنگ......! تیرا بھائی خالقو تو پہلے ہی کسی کام کا نہیں رہا تو ہی کچھ کر۔''

سارنگ کو ایک خیال سوجھا، وہ جلدی سے دو خیمے چھوڑ کر ایک میں داخل ہو گیا، اسے پوری امید تھی کہ یہاں اسے پانی کے چند گھونٹ نہیں تو گیلا کپڑا ضرور مل جائے گا۔

☆======☆======☆

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس جلتے سلگتے اور آگ برساتے لق و دق صحرا میں ایک پل بھی نہ ٹھہرتا بلکہ ٹھہرنا تو درکنار وہ ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا حالانکہ یہ بات اس کے پیشے کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلاف جاتی تھی مگر پھر بھی وہ محکمہ صحت کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر تھرپارکر بھیجی جانے والی سرکاری طبی امدادی ٹیموں میں سے ایک کا انچارج یعنی میڈیکل آفیسر بن کر یہاں آ گیا تھا، اس پانچ رکنی ٹیم میں دو ڈاکٹر، ایک میڈیکل ٹیکنیشن، دو ڈسپنسر تھے، دوسری ایک لیڈی ڈاکٹر لنیقہ فوزیہ تھی اور خود ڈاکٹر جواد احمد کے یہاں کام کرنے کی دوسری اہم وجہ یہی تھی۔ یہ دونوں کلاس فیلو تھے، ایک ساتھ ہاؤس جاب کیا تھا اور پھر ایک ہی ساتھ دونوں نے سندھ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات پاس کئے، مقابلے کا یہ امتحان پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر جواد احمد ایم او اور ڈاکٹر لنیقہ فوزیہ نے ڈبلیو ایم او کی حیثیت سے شہر کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں ڈیوٹی جوائن کی تھی، ڈاکٹر جواد احمد نے اسکن کا دو سالہ کورس بھی کیا تھا، یہ لوگ تھر میں وبائی امراض کے انسداد کے لیے آئے تھے جو یہاں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے پھوٹے تھے تاہم ان میں ایک پُراسرار بیماری کا بھی بہت چرچا تھا، اسہال اور الٹیاں تو یہاں کا معمول تھا ہی مگر ایک پُراسرار جلدی مرض بھی یہاں پھوٹا تھا جس کی میڈیکل سائنس ہنوز کوئی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر تھی، اب تک آنے والی طبی ٹیموں نے اس پُراسرار بیماری کی وجہ کا پتہ چلا لیا تھا جو ان کے خیال کے مطابق گندے جوہڑ میں نہانے سے لگتی تھی، اس پُراسرار مرض میں سب سے پہلے سر کی جلد میں زخم کی طرح کا نشان ابھرتا تھا پھر یہی زخم سر کی جلد پھاڑ کر اندر دماغ میں داخل ہو جاتا تھا۔ اگرچہ اس پُراسرار بیماری کو ہنوز کوئی نام نہیں دیا جا سکا تھا لیکن اسے ٹیٹنس سے ملتے جلتے وائرس کا غیر معروف نام ضرور دیا گیا تھا، ان کے میڈیکل کیمپ کو یہاں لگے آج تیسرا دن تھا اور مریضوں کی کافی اور دوائیوں کی ناکافی تعداد نے اسے ہی نہیں بلکہ پورے امدادی اسٹاف کو خاصا پریشان کر دیا تھا، اکثر پیچیدہ کیسز شہر کے ہسپتالوں میں بھیج دیئے جاتے تھے، لوگ مر بھی رہے تھے اور مر کر جی بھی رہے تھے اور جو مر کر جی رہے تھے وہ نہ زندوں میں تھے نہ مردوں میں......بس وہ تھے اور موت کی پروانہ وار جھپٹ تھی۔

یہ میڈیکل کیمپ عمرکوٹ اور جیمس آباد کے درمیانی صحرائی گوٹھوں میں واقع تھا اور ایک کیمپ کے تین حصے کئے گئے تھے۔ دو تو رہائشی حصے تھے جبکہ ایک خاصا بڑا حصہ علاج معالجے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر لنیقہ فوزیہ اپنے ساتھ اپنی ایک گھریلو ملازمہ کو بھی ساتھ لائی تھی۔

ڈاکٹر جواد احمد پچیس چھبیس سالہ ایک خوبرو نوجوان تھا، وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا، ڈاکٹر لنیقہ سرو قد اور خوبصورت لڑکی تھی

تاہم اس کے دل میں ڈاکٹر جواد سے کچھ زیادہ ہی نادار مریضوں کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا اور وہ تین دن گزر جانے کے باوجود ہنوز بڑی تندہی کے ساتھ مریضوں کی خدمت میں مصروف تھی البتہ ڈاکٹر جواد سخت بیزار نظر آنے لگا تھا۔

''جواد...... ! تم تو ہر دوسرا مریض شہر بھیج دیتے ہو، آخر تمہیں مریض کے اندر ایسی کون سی پیچیدگی نظر آتی ہے؟'' ڈاکٹر لطیفہ نے ایک مریض کی میڈیکل سلپ پر دستخط اور تاریخ ڈالتے ہوئے قریب کھڑے ڈاکٹر جواد سے کہا۔

جواد نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اسٹیتھو اسکوپ کو گلے میں ڈال کر کہا۔ ''اوہو بھئی...... اس مریض کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، اسے ایک قیمتی اینٹی بائیوٹک دوا کی ضرورت ہے جو تمہیں معلوم ہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں عنقا ہے البتہ شہر کے میڈیکل اسٹوروں سے کوئی فلاحی تنظیم دلوا دے تو ٹھیک ہے، اس لیے میں نے اسے شہر کے بڑے ہسپتال روانہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔''

''مگر جواد...... ! یہ غریب تو راستے میں ہی دم توڑ دے گا، اس کی حالت تو دیکھو۔''

ڈاکٹر لطیفہ اپنا سفید ایپرن درست کرتے ہوئے سامنے پرانے اسٹریچر پر دراز ایک انتہائی خستہ حال مریض کی نبض ٹٹولنے لگی۔ اس مریض کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا، بس کی تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں پھر وہ اپنے ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کے بوڑھے ماں باپ اور دو جوان بہنیں قریب کھڑے سسک رہے تھے، ڈاکٹر فوزیہ جو فطرتاً نرم اور ہمدرد دل کی تھی، اس نوجوان کو خطرناک حالت میں دیکھ کر کڑھ رہی تھی، اس نے اگرچہ ڈاکٹر جواد کے ایماء پر فائنل ریمارکس میڈیکل سلپ میں درج کر دیے تھے مگر وہ پھر بھی اس نوجوان مریض کو شہر بھیجنے کے حق میں نہیں تھی، اس کے خیال کے مطابق شہر پہنچتے پہنچتے یہ مریض ملک عدم سدھار جائے گا۔

ڈاکٹر لطیفہ فوزیہ اور ڈاکٹر جواد احمد کی گفتگو قریب کھڑے جاں بہ لب مریض کے ماں باپ نے بھی سن لی تھی لہٰذا مریض کی بوڑھی ماں ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈاکٹر لطیفہ فوزیہ کے قریب آئی اور پھر اپنی میلی چیکٹ اور دریدہ اجرک کی چادر کو اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے گڑگڑا کر بولی۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! میرے بچڑے کو بچالو، ہم اسے کدھر شہر لے جائیں، تیرے کو اللہ سائیں کا واسطہ...... !''

اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ڈاکٹر لطیفہ فوزیہ کا دل پسیج گیا، ڈاکٹر جواد احمد بھی اس کی گریہ وزاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''اماں! آپ دعا کرو، اللہ سائیں بہتر کرے گا، ہم کوشش کر رہے ہیں، شفاء اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے ہی الفاظ روایتی اور حبس زدہ سے لگے لیکن اس نے یہ جملے پورے خلوص کے ساتھ ادا کیے تھے، عورت کو قدرے تسلی ہوئی۔

فوزیہ نے فوراً ڈسپنسر اشرف علی کو دواؤں کے بارے میں تفصیلی ہدایت دی۔

''جی بہتر میڈم...... میں ابھی یہ سب چیزیں تیار کرتا ہوں۔'' اشرف نے جواب میں مستعدی سے کہا۔

کیمپ قناتوں اور شامیانوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا، صبح ہی سے مریضوں کا رش لگ جاتا تھا، سورج غروب ہونے تک اس میں کوئی کمی نہ آتی، رات گئے تک مریضوں کی چیخ و پکار جاری رہتی تھی، ڈاکٹر جواد کا تو ان تین دنوں میں دماغ جھنجنا گیا تھا، کچھ مریض ''ان'' بھی کرنے پڑے تھے، ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد تھوڑی دیر کے لیے کیمپ کے ایک مختصر سے اندرونی گوشے میں آ گئے جو بوقت ضرورت ریسٹ روم کے طور مستعمل تھا۔

''جواد...... ! تم اس قدر بیزار سے کیوں نظر آ رہے ہو، لگتا ہے تمہارے دل و دماغ پر کچھ زیادہ ہی بوجھ سوار ہو رہا ہے۔'' ریسٹ روم میں ایک جانب رکھی المونیم کی فولڈنگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ نے ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جواد بھی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''ایسی بات نہیں فوزی...... ! ہمارا تو پروفیشن ہی ایسا ہے کہ ہمیں ہر دم خدمت انسانیت انجام دینی ہے اور یہ ہمارا فرض بھی ہے لیکن مجھے صرف اس وقت پریشانی ہوتی ہے جب بعض مریضوں کے جذباتی رشتے دار ہماری مجبوری سے شیئر نہیں کرتے اور بدتمیزی پر اتر آتے ہیں، کیا تم کل والا واقعہ بھول گئیں فوزی...... کس طرح لعل بخش نامی لڑکا اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا، دل تو میرا چاہا تھا کہ اس کمینے کو......''

''ریلیکس جواد...... ! یہ بے چارے لوگ حالات کے ستائے ہوئے ہیں، ان کی دادرسی بھی نہیں کی جا رہی، ہم تو انہیں خیرات بھی صحیح طریقے سے نہیں دے رہے۔''

ڈاکٹر فوزیہ نے اسے سمجھایا، جواد بدستور بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے یہ تو خدائی آفات ہیں، اس میں بھلا ہمارا کیا قصور، ان لوگوں کو ہماری مجبوریاں بھی سمجھنی چاہئیں، اگر ہمارے پاس دواؤں کی ذرا بھی کمی ہو جاتی ہے تو یہی حالات کے ستائے ہوئے مریض کس طرح گلے کو آنے لگتے ہیں اور ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں، یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ہم اتنی دور شہر سے گھربار چھوڑ کر ادھر ان کے دکھوں میں شریک ان کی دادرسی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لئے آئے ہیں۔"

"اچھا بابا! بحث چھوڑو، یہ بتاؤ پیشنٹ Stable تو ہو جائے گا ناں......؟"

ڈاکٹر جواد نے فوزیہ کی بات سن کر ایک گہری ہنکاری بھری پھر بولا۔ "ہاں...... ! کچھ امید ہو چلی ہے، میں پھر جا کر دیکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ آلہ سنبھالے باہر چلا گیا اور ڈاکٹر فوزیہ کے نرم لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ رقصاں ہوگئی، یوں لگتا تھا جیسے وہ جواد کی فطرت سے واقف ہو، وہ زبان کا کڑوا ضرور تھا مگر دل کا شیریں تھا بس بعض لوگوں کے تلخ رویے کے ردعمل پر وہ بھڑک جایا کرتا تھا معاً اشرف دوڑتا ہوا آیا، ڈاکٹر فوزیہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی۔

"مم...... میڈم! جلدی چلیں گیسٹرو والے نوجوان مریض کی حالت بہت نازک ہے۔"

ڈاکٹر فوزیہ جلدی سے اپنا اسٹیتھو اسکوپ سنبھالے ادھر دوڑی۔

☆======☆======☆

اندر داخل ہوتے ہی سارنگ کی سب سے پہلے میراں پر نظر پڑی، وہ اپنی اجرک کی چادر کے گیلے کونے کو منہ میں ڈالے چوس رہی تھی۔

اس سے اس کا سلونا حسن کملایا ہوا تھا، اس کے نقوش بڑے معصوم اور صبیح تھے، ایک عجیب سا حسن تھا، سترہ سالہ میراں کے ملیح چہرے پر جو بہرحال سارنگ کے لئے اجنبی نہ تھا۔

"میراں...... ! چاچا، چاچی کدھر ہیں؟" سارنگ نے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا اور اس سے میراں کی خستہ حالی دیکھ کر اس کا دل کڑھنے لگا۔

"وہ ابھی ابھی باہر گئے ہیں شاید پپ...... پانی لینے۔" میراں نے پژمردہ سی آواز میں کہا تو سارنگ کے دل کو گھونسا لگا۔ وہ خود پانی کی آس لئے یہاں آیا تھا، اب کیا کہتا لہٰذا جب وہ خاموشی سے واپس لوٹنے لگا تو میراں نے اسے جاتے دیکھ کر پکارا۔ "سس...... سارنگ...... !"

"ہاں! بول......" سارنگ ٹھہرا۔

"تت...... تیرے کو پانی چاہئے، یہ لے میری چادر کا دوسرا کونا بھیگا ہوا ہے۔" میراں نے اپنی اجرک کا دوسرا کونا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

سارنگ کا جگر چھلنی ہونے لگا، پژمردگی سے بولا۔ "نہیں...... ! میں ویسے ہی آیا تھا،

چلتا ہوں۔" وہ باہر آ گیا۔

دھوپ کی شدت اور گرمی سے روزِ محشر کا سا گماں ہو رہا تھا، میراں اس کی چچازاد تھی، سکھیو، سارنگ کا چاچا لگتا تھا جو میراں کا باپ تھا، نجانے وہ کس خیمے سے پانی کا بندوبست کرنے گیا تھا، یہاں تو سب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ سارنگ نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا کہ وہ کس خیمے کا رخ کرے، اتنے میں اسے اپنا چاچا سکھیو آتا نظر آیا، وہ بھی خاصا مضطرب الحال دکھائی دے رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سے کپڑے کا ٹکڑا تھا جو گیلا تھا، جانے وہ کہاں سے اپنے کپڑے کا کونا گیلا کر کے لایا تھا، وہ اسے ہی چوس رہا تھا۔

"اڑے یہ سائیں بخش کدھر ہے چھورا...... ! ذرا پوچھو تو اب کتنی دور ہے ہماری منزل......؟" سکھیو نے سارنگ کو دیکھ کر پوچھا۔

سارنگ جواباً بولا۔ "میں اور بابا، سائیں بخش کے پاس گئے تھے، وہ کہہ رہا تھا منزل زیادہ دور نہیں اب......" سارنگ نے تشفی کی خاطر دروغ گوئی سے کام لیا پھر یکدم پوچھا۔

"چاچا سائیں...... ! چاچی کدھر ہے نظر نہیں آ رہی؟"

"اڑے کدھر ہوگی وہ غریب، گئی ہوگی کسی کے پاس اپنی قمیض کا کونا گیلا کرنے...... اللہ سائیں رحم کرے...... لگتا ہے ادھر ہی ہماری لاشوں کو گدھ نوچ رہے ہوں گے۔"

"نہیں چاچا...... ! اللہ سائیں بہتر کرے گا، کیوں ایسی مایوسیوں والی باتیں کرتا ہے، اچھا یہ بتا تو کس کے خیمے سے کپڑا گیلا کر کے لایا ہے، وہ میری بھابی کا بچہ ہے ناں منٹھار...... وہ رو رہا ہے۔" سارنگ نے کہا۔

"وہ ہے ناں اپڑاں کریم داد دو خیمے چھوڑ کر...... وہاں چلا جا، اس کے پاس تھوڑا بہت پانی ہے...... جا۔" یہ کہہ کر سائیں سکھیو اپنے کپڑے کا گیلا کونا چوستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سارنگ، کریم داد کے خیمے کے قریب پہنچ کر زور سے پکارا۔ "چاچا کریما...... ! تھوڑا پانی تو دے...... ایک گود کے بچے کا منہ گیلا کرنا ہے۔"

"آ جا خود چھوکرا اندر...... لے لے پانی...... !" اندر سے ایک کھردری آواز ابھری۔ سارنگ خوش ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو بے چارہ کریم داد، ایک بڑا سا آب خورا پکڑے اس کا منتظر تھا...... اندر کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے۔

سارنگ نے جھجکی جھجکی نظروں سے قدرے شرمسار لہجے میں کہا۔ "چاچا...... ! رہنے دے، تیرے اپنے بھی تو پیاسے ہوں گے۔"

اس کی بات سن کر پچاسی سالہ بوڑھا کریم داد فراخ دلی سے بولا۔ "اڑے کوئی بات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں...... بچے سب کے برابر ہوتے ہیں...... یہ لے جا سارا پانی...... لے...... میرے پاس ہے اور......'' اس نے مٹی کا آب خورا سارنگ کی طرف بڑھایا۔

سارنگ نے جھجکتے ہوئے اس سے آب خورا لے لیا۔ اس کے اندر بہت قلیل مقدار میں پانی تھا مگر اس وقت سارنگ کو وہ کسی تالاب سے کم نہ لگا۔ وہ کریم داد کا شکریہ ادا کر کے سب سے پہلے اپنے چاچا سکھیو کے خیمے کی طرف آیا اور اندر داخل ہو کر میراں کے پاس پہنچا۔ ''یہ لے میراں......! ایک دو گھونٹ بھر لے۔'' سارنگ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ کر آب خورا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

دو غمگین نگاہیں چار ہوئیں تو جذبۂ محبت سے تڑپتے دلوں میں گرمی نے عجیب سی پیاس بھڑکا دی...... یہ پیاس زبان نہیں بلکہ چشم تر کرنے والی تھی...... شوقِ دیدار کی پیاس تھی۔ سارنگ نے میراں کے نیم وا لبوں سے آب خورہ لگا دیا۔ میراں نے لرزتے ہونٹوں سے دو گھونٹ پانی پیا تو سارنگ کی طرف نگاہیں اٹھا کر بولی۔ ''تو بھی تو پی لے۔''

''نہیں میراں...... بھابی اللہ وسائی کے بچے کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر سارنگ اٹھ کر جانے لگا تو ایک طرف نڈھال سے بیٹھے چاچا سکھیو نے سارنگ کو نحیف سی آواز میں پکارا۔

''اڑے چھوکرا......! مجھے بھی تو پلاتا جا ایک گھونٹ......!'' سارنگ لمحے بھر کو رکا، وہ متذبذب تھا۔ اتنے میں میراں کی آواز اسے سنائی دی۔ وہ اپنے باپ سے بولی۔

''بابا......! تو اپنا کپڑا گیلا کر تو لایا ہے پھر کیوں ایک معصوم اور ننھی جان کے حق کو چھینتا ہے۔''

''اچھا بابا...... جا...... چھوکرا...... پھر زیادہ دیر نہ کھڑا ہو یہاں...... پانی کے ایک گھونٹ پر کہیں مجھ بڈھے کا دل بے ایمان نہ ہو جائے۔''

سارنگ اس بے چارگی پر دل مسوس کر رہ گیا پھر تیزی کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اپنی بھابی اللہ وسائی کے قریب بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے پانی سے دونوں ماں، بیٹے سیراب ہو رہے تھے۔ سارنگ کا بڑا بھائی یعنی اللہ وسائی کا شوہر، سارنگ سے بولا۔ ''اڑے سارو......! ذرا میرے لئے بھی تھوڑا پانی مانگ لا کسی سے......''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر سے ایک آواز ابھری۔ ''بابا...... ! سب لوگ باہر آؤ، قطار لگاؤ آ کر...... سائیں بخش کا حکم ہے۔'' یہ کہہ کر صدا لگانے والا آگے بڑھ گیا۔

سارنگ اور خالقو دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ''اب کیا ہو گیا...... جب چلے تھے اس وقت بھی تو سائیں بخش نے ہماری قطار بنا کر ہی قافلے میں ہمیں شامل کیا تھا پھر......؟'' خالقو بڑبڑایا۔

''ہو گی ادا کوئی بات...... چلو چل کر دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے آخر......!'' سارنگ نے بھائی سے کہا تو خالقو قدرے بیزار کن انداز میں کسمسا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

سورج کی پُرتپش تمازت جسم میں اتر کر رگِ جاں تک کو برمائے دے رہی تھی۔ اس پر مستزاد بادِ سموم کے گرم تھپیڑے چہروں کو جھلسائے دے رہے تھے۔ قافلے کے سارے لوگ نڈھال سی حالت میں دو دو کی قطار بنائے کھڑے تھے، ان کے مضطرب چہروں سے بیزاری اور تھکان اُمڈ رہی تھی مگر وہ سب میرِ کارواں سائیں بخش کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ایک قطار عورتوں اور بچوں کی تھی جبکہ دوسری قطار بوڑھے، جوان مردوں کی تھی۔ ایسے میں میرِ کارواں سائیں بخش نے تیز دھوپ میں کھڑے ہو کر خطاب کرنے کے انداز میں کہا۔

''ہم سب جس کٹھن گھڑی سے گزر رہے ہیں، اللہ سائیں کرے گا، ہم بہت جلد ان جہنمی حالات سے نجات پالیں گے، میرا مقصد تم لوگوں کو تنگ کرنا نہیں بلکہ بخیر و عافیت اپنی منزل تک پہنچانا ہے...... تم لوگوں کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ ہم لوگ اس دھرتی پر صرف قحط اور خشک سالی کا ہی شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ مختلف خطرناک وبائی بیماریوں نے بھی ہمیں دبوچ لیا ہے اور یہ خطرناک بیماریاں ایک آدمی سے دوسرے آدمی کو منتقل ہوتی ہیں...... تم لوگ نہیں بھولے ہو گے جب میں تم سب کو اکٹھا کر کے قافلے کی شکل میں روانہ ہونے کے لیے تیار کر رہا تھا تو روانہ ہونے سے پہلے میں نے سب کا معائنہ کروایا تھا تاکہ جب ہم لوگ سفر پر روانہ ہوں تو کوئی جان لیوا بیماری ہمارے ساتھ سفر نہ کر رہی ہو۔'' میرِ کارواں سائیں بخش ذرا رکا۔ لوگوں میں بے چینی سی پھیل گئی...... یہ دہشت زدہ ہو گئے کہ کیا ان کا یہ مختصر قافلہ کسی خطرناک وبائی مرض کا تو شکار نہیں ہونے والا...... سب سے زیادہ بے چینی خالقو کی بیوی اللہ وسائی کو تھی، وہ خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔

''پوری طرح تسلی کرنے کے بعد میں نے روانگی کا حکم دے دیا تھا۔'' سائیں بخش نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''مگر ابھی مجھے قافلے ہی کے کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ ہمارے قافلے میں ایک خطرناک بیماری موجود ہے...... اس بیماری کا تعلق دست، الٹیوں سے نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے بلکہ یہ خطرناک بیماری ہے، جس سے تم سب لوگ اچھی طرح واقف ہو...... یہ بیماری کیونکہ فوری طور پر ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے اسی لئے میں ہی نہیں بلکہ تم لوگ بھی چاہو گے کہ جس عورت یا مرد کو یہ بیماری ہو، اس کے ہمارے قافلے سے جدا ہونے میں ہی سب کی بہتری ہے...... یہ بیماری سر کی جلد کا وہ ناسور ہے، جو رفتہ رفتہ دماغ میں اتر کر انسان کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے...... اس بیماری کو ہم نے مقامی زبان میں ''چین بلا'' کا نام دیا ہے۔'' میر کارواں سائیں بخش کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اچانک لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''میرے اپنے بیوی، بچے بھی اسی قافلے میں شامل ہیں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ ان میں سے کسی کو بھی یہ بیماری ہوئی تو میں اسے بھی قافلے سے نکال باہر کروں گا۔'' سائیں بخش کی آواز میں عجیب سا ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔ ''بھائیو اور بہنو......! تم لوگ یقیناً میرا ساتھ دو گے اور اپنی بھلائی چاہو گے لہٰذا اب براہ مہربانی تم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر خاموش کھڑے رہو تا کہ سب لوگوں کا ایک بار پھر معائنہ ہو سکے۔'' اتنا کہہ کر میر کارواں نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ہم عمر شخص اور ایک عورت کو اشارہ کیا پھر مرد نے مردوں کی قطار کا رخ کیا اور عورت، عورتوں اور بچوں والی قطاروں کی طرف بڑھ گئی...... قافلے کے لوگ دم بخود ہو کر کھڑے تھے۔ معائنہ کرنے والے مرد کا نام حضور بخش اور عورت کا نام مائی حنیفاں تھا...... یہ لوگ قطار میں کھڑے ایک ایک شخص کو جھکا کر اس کے سر اور بالوں کا معائنہ کرنے لگے۔ ماحول پر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا...... ہر کوئی اپنی جگہ خوف زدہ تھا کہ کہیں اس کے خاندان کے کسی فرد کو یہ منحوس بیماری نہ ہو ورنہ سب کو اس کے ساتھ ہی قافلے سے خارج ہونا پڑتا۔ ظاہر ہے اس بدنصیب کو تنہا تو اس جلتے سلگتے صحرا میں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ معائنہ جاری تھا، دونوں عمر رسیدہ بھائیوں مٹھل اور سکھیو کا خاندان بھی قطار میں شامل تھا، مٹھل کا بڑا بیٹا خالقو، اس کی بیوی اللہ وسائی بھی کھڑی تھی، اس کی گود میں دودھ پیتا ننھا منٹھار ہمک رہا تھا، سارنگ بھی موجود تھا، میراں بھی عورتوں والی قطار میں کھڑی تھی۔ وہ مرد بالخصوص عورتیں سخت خوف زدہ تھیں، جنہیں ذرا بھی اپنے سر میں خارش محسوس ہو رہی تھی مگر انہوں نے اس خارش کو مٹی، گرد یا جوں وغیرہ کی کارستانی سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی مگر اب انہیں اس دہشت ناک اندیشے نے آلیا تھا کہ کہیں وہ اس پُراسرار مرض ''چین بلا'' کا شکار تو نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ حالت اللہ وسائی کی غیر ہو رہی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلے کافی روز سے اپنے سر کی جلد میں خارش محسوس کر رہی تھی مگر وہ اسے

بالوں کی خشکی ہی سمجھی تھی، یہ خارش متواتر محسوس ہوتی رہی تھی بلکہ ایک دن تو وہ بیٹھی مسلسل اپنا سر کھجا رہی تھی کہ قریب بیٹھے اس کے شوہر خالقو نے قدرے خونخوار لہجے میں تنگ آ کر اس سے کہا تھا۔ ''اڑی......! تیرے کو یہ سر میں اتنی کھجلی کیوں ہو رہی ہے، کیا ''چین بلا'' تو نہیں چمٹ گئی ہے تیرے کو...... یاد رکھنا، اگر یہ بیماری تیرے کو لگی تو میں تجھے گھر سے باہر نکال دوں گا۔''

خالقو کے یہ تنبیہی الفاظ بے چاری اللہ وسائی کے دماغ میں چکرانے لگے اور وہ اس روح فرسا خیال سے ہی لرز اٹھی تھی کہ اگر اسے یہ بیماری ہو گئی تو...... تو کیا اسے قافلے سے نکال دیا جائے گا اور کیا اس کا شوہر خالقو بھی اسے صحرا میں تنہا چھوڑ دے گا، اس کا بچہ منٹھار بھی اس سے چھین لیا جائے گا...... کہاں جائے گی...... اس کا تو دنیا میں خدا اور مجازی خدا کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔

''نہیں...... نہیں......! ایسا نہیں ہو گا۔'' عالم سراسیمگی میں پریشان کن خیالوں میں گم غیر ارادی طور پر اللہ وسائی کے کپکپاتے لبوں سے نکلا اور اس کے پیچھے کھڑی عورتوں نے بیزاری سے اسے گھورتے ہوئے جھڑکا۔

''اڑی کیا ہوا...... پاگل ہو گئی ہے کیا......؟'' اور اللہ وسائی چپ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

قافلے کے ایک ایک فرد کا بغور معائنہ کرنے والے وہ دونوں مرد اور عورت یعنی حضور بخش اور مائی حنیفاں تجربہ کار تھے، وہ نصف سے زیادہ لوگوں کو جھکا جھکا کر ان کے سر اور بالوں کا معائنہ کر چکے تھے مگر ابھی تک ''چین بلا'' جیسا مرض انہیں کسی کے سر میں نہیں نظر آیا تھا۔ جب مائی حنیفاں گھبرائی گھبرائی اللہ وسائی کو جھکا کر اس کا سر جوئیں دیکھنے کے انداز میں بال اِدھر اُدھر ہٹا کر دیکھنے لگی تو اچانک مائی حنیفاں سیدھی ہو کر زور سے چلائی۔ ''اس چھوکری کو ''چین بلا'' ہے''۔

☆======☆======☆

جونو جوان مریض شدید قسم کے اسہال کا شکار تھا، اس کا نام رموتھا۔ اشرف نے جیسے ہی ڈاکٹر فوزیہ کو مریض کی بگڑتی ہوئی طبیعت کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر فوزیہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، ڈاکٹر جواد، مریض رمو کو مصنوعی تنفس دینے کی کوشش کر رہا تھا، رمو کے بوڑھے ماں، باپ اور دیگر عزیز دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، رمو بالکل ہاتھ، پیر چھوڑ چکا تھا، ڈاکٹر فوزیہ بھی ڈاکٹر جواد کی مدد کو پہنچی، اس نے ایک معالج کی حیثیت سے اپنے چہرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے تاثرات پر قابو پا رکھا تھا اور متعلقین کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہی تھی مگر وہاں تو جاں بہ لب مریض کے گرد دوسرے لوگوں کا بھی ہجوم جمع ہو گیا تھا۔

ایسی صورت حال اچھے بھلے ڈاکٹروں کو بھی گھبرا کر رکھ دیتی تھی۔ یہی حال فوزیہ اور جواد کا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ مریض چل بسا تو انہیں ایک بار پھر ایک تلخ تجربے سے گزرنا پڑے گا بلکہ ڈاکٹر فوزیہ اب پچھتانے لگی تھی کہ کاش وہ اس مریض کو شہر میں روانہ کر دیتی، اسے ڈاکٹر جواد کی بات رد نہیں کرنی چاہئے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ فوزیہ نے اسے بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر ہی شہر نہیں روانہ کیا تھا کیونکہ اس بات کا صاف مطلب موت تھا...... شہر کا ہسپتال یہاں سے میلوں دور تھا۔ بہرطور ان لوگوں نے اپنے تئیں رمو کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود...... مریض کے دن پورے ہو چکے تھے، وہ اپنی زندگی کی گھڑیاں گن چکا تھا۔

رمو کی جواں مرگ پر وہاں کہرام مچ گیا، ماں اپنا سینہ پیٹتی غش کھا کر گر گئی، ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہروں پر دکھ سے زیادہ پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے، مریض کے لواحقین نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''تم...... تم لوگوں نے رمو غریب کو شہر کیوں نہیں بھیجنے کا بندوبست کیا۔''

''تم لوگ قاتل ہو، مدد کے نام پر امداد کی رقم ہڑپ کرتے ہو۔'' غرض ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف سے بھی لوگ الجھ گئے، لوگوں نے مشتعل ہو کر کیمپ کے تنبو گرا دیئے تھے، ڈاکٹر جواد ان سے الجھ گیا تھا مگر ڈاکٹر فوزیہ اسے گھسیٹ کر پرے لے گئی تھی پھر مریضوں ہی میں سے دوسرے ذرا سلجھے ہوئے لوگوں نے مشتعل لوگوں کو سمجھایا بجھایا، وہ خاموش تو ہو گئے تھے مگر لاش اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے، وہ اب مطالبہ کر رہے تھے کہ اس کے کفن دفن کا بھی کیمپ والوں کو بندوبست کرنا پڑے گا۔

''بھگت لیا ناں تم نے انسانی ہمدردی کا نتیجہ......!'' ڈاکٹر جواد نے زچ ہو کر ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ ''میں نے تو اسے بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔''

''محترمہ لئیقہ فوزیہ صاحبہ......! جس کی موت خدا نے لکھ دی ہو، اسے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم بھی نہیں بچا سکتی، تم نے بلاوجہ مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی، مجھے دور دراز کے دیہاتوں کی سرکاری ڈسپنسریوں کا خاصا تجربہ ہے، ان کا کوئی مریض اگر مر جاتا ہے تو یہ لوگ ڈاکٹر کو ڈرا دھمکا کر اس سے ایک خطیر رقم کی صورت میں ہرجانہ تک طلب کر لیتے ہیں۔''

ڈاکٹر جواد اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ پھر وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''میں اب میڈیکل کیمپ کو وائنڈ اپ کروا دوں گا اور سیکرٹری ہیلتھ کو ایک لیٹر لکھوں گا کہ وہ اگر ہمیں ان دور دراز علاقوں میں بھیج رہے ہیں تو ہماری سیکورٹی کا بھی بندوبست کرے۔'' اس کی بات سن کر فوزیہ چپ رہی۔

پھر خاصی دیر بعد شور شرابہ تھما اور ڈسپنسر اشرف نے آ کر بتایا کہ صورت حال قابو میں ہے اور باہر دوسرے لوگوں نے متوفی مریض کے لواحقین کو سمجھا بجھا کر لاش انہیں دفنانے کے لئے آمادہ کر لیا ہے۔ اس اطلاع پر ڈاکٹر جواد احمد اور ڈاکٹر فوزیہ نے بے اختیار گہری اور طمانیت بھری سانس لی۔

پھر خیمے درست کئے گئے، جو سامان اور طبی آلات اس طوفان بدتمیزی کا شکار ہو گئے تھے، انہیں درست جگہوں پر سیٹ کیا گیا، مریض دیکھنے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا مگر اب ڈاکٹر جواد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور فوزیہ کو بھی ذرا تھکن اتارنے کی غرض سے ریسٹ روم میں ہی اپنے ساتھ بیٹھے رہنے دیا۔ اس تلخ اور ناخوشگوار واقعہ نے دونوں کو اعصابی طور پر سخت مضمحل کر دیا تھا، اب باہر کیمپ میں مریض دیکھنے کا فریضہ پیرامیڈیکل اسٹاف ہی انجام دے رہا تھا اور ڈاکٹر جواد کی طرف سے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی بھی سیریس کیس ڈیل کرنے کی بجائے اسے موبائل امدادی ٹیم کی طرف بھیج دیا جائے۔

رفتہ رفتہ مریضوں کا رش کم ہونے لگا، صحرا میں شام اترنے لگی، حدنگاہ تک ریتیلے ٹیلے نظر آ رہے تھے، ڈاکٹر فوزیہ لطیف مزاج کی لڑکی تھی، ڈاکٹر جواد کی طرح وہ بیزار بیزاری نہیں رہتی تھی بلکہ وہ کٹھن سے کٹھن لمحات میں بھی خوشی کا کوئی لمحہ ضرور نکال لیتی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کا یہ روز کا معمول تھا، صحرا میں شام اترتے ہی وہ دور صحرائی ٹیلوں کے عقب میں سورج کے گولے کو لڑھکتا ہوا دیکھنا نہیں بھولتی تھی، ریت کے سمندر میں غروب آفتاب کا منظر اسے بڑا بھاتا تھا مگر آج کے ناخوشگوار واقعے نے ڈاکٹر جواد کا موڈ بالکل خراب کر دیا تھا، اس لئے وہ کیمپ کے عقب میں بنے ریسٹ روم میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا جبکہ ڈاکٹر فوزیہ حسب معمول کیمپ کے چھپر تلے ریت پر فولڈنگ چیئر ڈالے بیٹھ گئی۔ دور مغرب میں سورج کا آتشیں گولا ریتیلے ٹیلوں کے پیچھے دھیرے دھیرے لڑھکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، فضا میں اب گرمی اور حبس کی شدت بتدریج کم ہونے لگی تھی، ڈاکٹر فوزیہ کو تھر کا یہ ریگستانی علاقہ بہت اپیل کرتا تھا جو دن بھر باپ کی شفقت کی طرح گرم جوش اور رات میں ماں کی طرح ٹھنڈی آغوش میں بدل جاتا تھا، فضا میں اب بادِ سموم کی جگہ ہلکی ہلکی

فرحت بخش ہوا نے لے لی تھی۔

موسی نے کھانا بنا دیا تھا اور اب لیموں کے شربت کے دو گلاس لئے ایک ڈاکٹر فوزیہ کو دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''موسی! تم یہاں آکر پریشان تو ہوگئی ہوگی؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے لیموں کے شربت کے چند فرحت بخش گھونٹ لے کر اپنی ذاتی ملازمہ سے پوچھا تو موسی مہربان لہجے میں بولی۔

''نہیں بیٹی...... ! میں تو یہاں بہت خوش ہوں۔''

''مگر موسی...... ! تمہیں یہاں اضافی کام جو کرنا پڑ رہا ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... یہ بھی ثواب ہی کا کام ہے، مجھے تو بس تمہارے ممی، ڈیڈی کی فکر ستا رہی ہے، وہ ضرور تمہاری وجہ سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' موسی نے کہا پھر پوچھا۔'' ویسے بیٹی! ہمیں اور کتنے روز یہاں مزید رکنا پڑے گا؟''

''بس ہفتے کا ٹور تھا، دو دن بعد ٹیکڑا وین یا ایمبولینس لے جائے گی ہمیں یہاں سے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے جواب دیا۔ ابھی ڈاکٹر فوزیہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اسے سامنے دور ریت سی اڑتی ہوئی نظر آئی پھر ذرا ہی دیر بعد ریت کے بگولوں سے ایک لینڈ کروزر نمودار ہوئی اور کیمپ کے بالکل قریب آکر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ڈاکٹر فوزیہ قدرے ٹھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لینڈ کروزر سفید رنگ کی تھی، جس میں سے چار پانچ لمبے تڑنگے اور گھنی مونچھوں والے اجرک پوش افراد اترے، ان میں ایک منحنی سی جسامت کا شخص بھی تھا، اس کی رنگت جھلسی ہوئی تھی، وہ جلدی سے ڈاکٹر فوزیہ کی طرف بڑھا اور بہ عجلت پوچھا۔'' کیا آپ لیڈی ڈاکٹر ہیں......؟''

''ہاں...... !'' ڈاکٹر فوزیہ نے مختصراً کہا۔

''تو پھر جلدی چلو...... حویلی میں ایک عورت کی طبیعت بہت خراب ہے، اس کے ہاں ولادت ہونے والی ہے۔'' خاکستری رنگت والے نے بہ عجلت کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ اس کی بات سن کر چونکی...... اس نے بغور اس آدمی کا جائزہ لیا۔ اس نے بے داغ کڑکڑاتی ہوئی سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور پیروں میں اس کے پشاوری چپل تھی۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! جلدی چلو...... مریضہ کی حالت بہت نازک ہے...... سوچنے کا وقت نہیں۔'' اس منحنی سے شخص نے اس بار قدرے بے تابانہ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو وہ کسی وڈیرے کا منشی محسوس ہوا تاہم اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

''دیکھئے...... ! ہمیں کسی کے ساتھ جا کر مریض کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے آپ کے پاس گاڑی ہے، آپ مریضہ کو ادھر لے آئیں۔''

اس کی بات سن کر وہ منشی ٹائپ شخص اس بار قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! ہم قریب کے ایک گوٹھ کی حویلی سے آئے ہیں، وڈیرے سونا رو خان نے ہمیں بھیجا ہے، مریضہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ادھر لایا جائے۔''

بے شک ایک مریضہ کا معاملہ تھا مگر ڈاکٹر فوزیہ بہر حال ایک عورت تھی وہ اس کے ساتھ جانے سے ہچکچا بھی رہی تھی پھر وہ لمحہ بھر سوچ کر بولی۔'' اچھا ذرا ٹھہرو......'' یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب پریشان سی کھڑی موسی سے کہا۔'' موسی! تم ذرا ڈاکٹر جواد احمد کو بلا لاؤ۔''

موسی'' جی اچھا بی بی۔'' کہہ کر کیمپ کے اندر چلی گئی، اس نے اندر جا کر ڈاکٹر جواد کے علاوہ دیگر عملے کو بھی اس بات کی خبر کر دی۔ ڈاکٹر جواد سب سے پہلے وہاں پہنچا پھر خاکستری صورت والے آدمی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔'' کیا معاملہ ہے بھئی...... !''

''اڑے بابا...... ! معاملہ بڑا نازک ہے، ہمیں وڈیرے سائیں سونا رو خان نے بھیجا ہے، ادھر حویلی میں ایک عورت کو بچے کو ولادت ہونے والی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔'' وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

''تو اسے ادھر کیوں نہیں لے آئے؟''

''اڑے بابا...... ! ادھر کیسے لاتے، وہ تو ہاتھ نہیں لگانے دے رہی، تم لوگوں کی وڈی مہربانی ہوگی...... جلدی ہمارے ساتھ چلو۔''

''مگر ہمیں تو کہیں جا کر مریض دیکھنے کی اجازت نہیں ہے وہ بھی ایک لیڈی ڈاکٹر...... !'' جواد نے کہا۔

''میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا''۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اچانک کسی خیال کے تحت جواد سے کہا۔

''بابا...... ! یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، مریضہ کی حالت نازک ہے، تم لوگ ڈاکٹر ہو، سرکار نے تمہیں ہماری خدمت کے لیے ادھر بھیجا ہے، تم لوگ پگھار (تنخواہ) کس بات کی لے رہے ہو، تم لوگوں کو ہر حالت میں چلنا ہوگا ہمارے ساتھ۔'' اس بار اس کا لہجہ دباؤ ڈالنے والا تھا مگر ڈاکٹر جواد بغیر دباؤ میں آئے بولا۔

''سرکار ہمیں کسی کے گھر جھاڑو دینے نہیں بھیجتی، ہم لوگ تمہارے ساتھ نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مریضہ کو ادھر ہی لانا ہوگا۔"

ماحول یکدم ہی کشیدہ ہوگیا تھا، اگرچہ ڈاکٹر فوزیہ کی خواہش تھی کہ اس درد سے تڑپتی ہوئی مریضہ کو تکلیف سے نجات دلا دے مگر اب وہ بیچ میں بول کر ڈاکٹر جواد کی تنقید کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی، رمو نامی مریض والا ناخوشگوار واقعہ ابھی تازہ ہی تھا مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔

"بابا......! یہ تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی، ہمارے وڈے سائیں نے ہمیں ہر صورت میں کسی نہ کسی لیڈی ڈاکٹر کو لانے کا حکم دیا ہے، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اپنے ہی گوٹھ کی کوئی دائی وغیرہ کو دیکھ لیں، سب گوٹھ سے جا چکے ہیں۔" اس بار اس شخص کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ڈاکٹر جواد کسی سے ڈرنے والا نہیں مگر وہ دریا میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں لینا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ صحرا بھی ایک طرح کا دریا ہے جہاں کینہ پرور اونٹوں کی کمی نہیں، ذرا بھی خلاف مرضی کی کوئی بات ہوئی، یہ لوگ کینہ پرور اونٹوں کی طرح چڑھ دوڑتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ اوکھلی میں سر دے دیا جائے۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا سوچتے پڑے ہو پھر آپ ہماری دھرتی پر مہمان ہو، بالکل فکر مت کرو، تم کو عزت اور احترام کے ساتھ دوبارہ ادھر چھوڑ دیا جائے گا۔" اس بار اس منشی قسم کے شخص نے انتہائی خاکسارانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر جواد نے چند لمحے کچھ سوچ کر دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد اس نے اشرف اور موسیٰ کو میڈیکل بیگ تیار کرنے کو کہا اور ڈاکٹر فوزیہ نے چند مخصوص دوائیں لیں، اس کے بعد یہ چاروں لینڈ کروزر میں سوار ہو گئے، لینڈ کروزر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

مائی حنیفاں کی سنسناتی ہوئی آواز دم بخود فضا میں پٹاخے کی طرح گونجی اور قافلے کے لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بے چاری اللہ وسائی تو پوری جان سے لرز اٹھی، سب کی آسمان تک وا آنکھیں حواس باختہ اللہ وسائی پر جم کر رہ گئیں، قریب مردوں کی قطار میں کھڑے سارنگ کے دل پر جیسے گھونسا لگا، اللہ وسائی کی تو جان ہی نکل چکی تھی، اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا، مائی حنیفاں نے اللہ وسائی کو بازو سے پکڑ کر یوں عورتوں کی قطار سے کھینچا جیسے تالاب سے کسی گندی مچھلی کو نکال رہی ہو، وہ اسے میر کارواں سائیں بخش کے

پاس لے آئی۔

ایک بار پھر تحقیق کا عمل شروع ہو گیا، مردوں کی قطار میں سے ایک پختہ العمر شخص کو بھی باہر نکالا گیا، یہ جھانی تھا، اس کی بیوی کچھ روز پہلے ہی دست، الٹیوں کا شکار ہو کر انتقال کر چکی تھی، اس وقت اس کا نو، دس سالہ اکلوتا بیٹا فریدو اس کے ساتھ تھا۔

ان دونوں کا میر کارواں سائیں بخش نے خود معائنہ کیا، سائیں بخش ایک تجربہ کار انسان تھا، تھر کے نامی گرامی سالار کاروانوں میں اس کا بھی نام شامل تھا، اس نے اللہ وسائی اور جھانی کے سر کے بالوں کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہ دونوں "چین بلا" نامی بیمار کا شکار ہیں۔ بس پھر کیا تھا، ان دونوں کو قافلے سے علیحدہ کر دیا گیا، جھانی تو بے چارہ خاموشی سے ہٹ گیا مگر اللہ وسائی نے رونا، پیٹنا شروع کر دیا، اس بے چاری پر مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے شوہر خالقو نے اس سے بچہ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا اور صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیمار بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا مگر میر کارواں اتنا بے رحم نہ تھا۔ اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ان دونوں بدنصیبوں کی دادرسی کے لیے کچھ کرے لیکن وہ صرف اس حد تک ہی ذمہ داری نبھا سکتا تھا کہ جھانی کے نو سالہ بیٹے فریدو اور بے سہارا اللہ وسائی کا تحفظ کرتا لہٰذا جھانی سے اس کے کسی عزیز رشتے دار کے بارے میں پوچھا گیا تاکہ اس کے بیٹے فریدو کو حوالے کیا جائے جبکہ اللہ وسائی کے تحفظ کے لئے اس کے شوہر خالقو کو بھی قافلے سے علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا مگر خالقو اڑ گیا، اس نے میر کارواں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب اپنی بیماری بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، وہ اسی وقت اسے طلاق دے رہا ہے۔ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ بے چاری اللہ وسائی یکدم چیخ اٹھی اور اپنے شوہر کے پیروں پر گر گئی۔

"سائیں......! تیرے کو اللہ کا واسطہ، بھلے میرے ساتھ نہ رہ پر طلاق کا داغ تو میری پیشانی پر نہ لگا۔" وہ زار و زار روتے ہوئے بولی مگر خالقو پتھر بنا کھڑا تھا، میر کارواں خاموش تھا، سارنگ سخت تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"میں تیرے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں؟ تو کیا چاہتی ہے کہ میں اور منٹھار بھی چین بلا کا شکار ہو جائیں، بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھے......!"

"ٹھہرو ادا خالق داد......!" اچانک سارنگ مردوں کی قطار سے نکل کر سامنے آیا۔ "اس بے چاری کے ساتھ یہ ظلم کیوں کر رہا ہے ادا......! تو اسے طلاق نہ دے اور اس کے ساتھ رہ بھی نہیں، میں بھابی اللہ وسائی کے ساتھ ہوں، میں اس کا علاج کرواؤں گا۔"

سارنگ نے پُرعزم لہجے میں کہا پھر بڑی محبت اور احترام کے ساتھ اللہ وسائی کو بے حس خالقو کے قدموں سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پورے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، اللہ وسائی اپنا رونا دھونا بھلا کر ایک ٹک اپنے دیور کو دیکھنے لگی، اس کی نمناک آنکھوں میں اب حیرت امڈ آئی تھی البتہ عورتوں کی قطار میں اپنی ماں کے ساتھ کھڑی میراں بے چین سی نظر آنے لگی، سارنگ کے قافلے سے الگ ہو جانے والے فیصلے نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا مگر وہ چپ رہنے پر مجبور تھی، اگر وہ اپنے دل کی بے چینی ظاہر کر دیتی تو بھرے مجمع میں اس کا حالِ دل آشکار ہو جاتا۔

سارنگ نے بڑے ملتجیانہ انداز میں اپنے بڑے بھائی خالقو سے کہا۔ ''اس کا بچہ اس کو دے دے، یہ مر جائے گی اس کے بنا......!'' اس کی بات پر خالقو نے برا سا منہ بنا کر ننھے منٹھار کو اللہ وسائی کے حوالے کر دیا۔

سارنگ کے ماں، باپ روتے رہے لیکن سارنگ نے انہیں تسلی دے کر روانہ کر دیا۔ قافلہ تین افراد کو تھر کے تپتے سلگتے ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا البتہ ایک خیمہ ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا اور تھوڑا بہت زادِ راہ بھی...... اللہ وسائی ننھے منٹھار کو گود میں لئے کھڑی سسک رہی تھی، پختہ العمر شخص جھانی خاصا بیمار دکھائی دے رہا تھا، اس کا نو سالہ معصوم بیٹا فریدو باپ کے ساتھ کھڑا سارنگ کی طرف تکے جا رہا تھا، اس کے پیروں میں جوتی نہیں تھی، اس سے پہلے اپنے بیمار باپ کے کاندھے پر سوار تھا، ان لوگوں کی بے بسی دیکھ کر سارنگ کا جی کڑھنے لگا، سارنگ فطرتاً نرم خو تھا۔

''اڑے چھوکرا......! تُو نے کیوں ہماری خاطر کھد کو مشکل میں ڈال لیا تُو تو بھلا چنگا تھا۔'' جھانی نے سارنگ سے کہا پھر وہ اللہ وسائی کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری دھیوں جیسی ہے، پر یہ ہے بڑا جالم...... یہ بیماری چین بلا پھیلنے والی تھوڑا ہی تھی، یہ تو حکیم نے بھی بتایا تھا۔''

''ہاں چاچا......! پر سائیں بخش بھی تو مجبور تھا، میرا خیال ہے اس نے میر کارواں ہونے کا فرض نبھایا ہے، یہ بات تو وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ اگر اس کے خاندان میں بھی کسی کو یہ خطرناک بیماری ہوتی تو قافلے کے دوسروں لوگوں کے مفاد اور بہتری کی خاطر اسے بھی نکال باہر کرتا۔'' سارنگ نے کہا۔

''اچھا چلو اندر آ جاؤ۔'' جھانی نے اپنے بیٹے فریدو کا ہاتھ پکڑا اور سارنگ اپنی بھابی کو اکلوتے خیمے کی طرف لے کر بڑھا۔ یہ سب لوگ اندر آ کر بیٹھ گئے...... سارنگ، جھانی اور جھانی۔ سارنگ کو اچھی طرح جانتا تھا، دونوں ایک ہی گوٹھ کے تھے اور ان میں قریبی

تعلقات تھے۔ سارنگ نے ذرا دیر بعد جھانی سے کہا۔ ''چاچا......! تم ادھر ٹھہرو، میں آس پاس دیکھتا ہوں...... مجھے امید ہے کوئی امدادی ٹیم نظر آ ہی جائے گی۔''

''اڑے نا چھورا......! یہ ریت کا سمندر بڑا بے رحم ہوتا ہے کہیں بھٹک گیا تو یہ کسی کی طرح تیرے کو نگل لے گا۔'' جھانی نے کہا۔

سارنگ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''چاچا......! تو پھر یہاں رہ کر کون سا ہم زندہ بچیں گے...... پیاس کے ویسے ہی مارے ہوئے ہیں ہم...... کھانے کے لیے ایک لقمہ تک ہمارے پاس نہیں، ایک معصوم، ماں کے سوکھے سینے سے چمٹا بلک رہا ہے، ہم سے ہی یہ جان لیوا قحط برداشت نہیں ہو رہا یہ تو پھر معصوم ننھی جان ہے۔'' سارنگ کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے ''اچھا بابا جیسی تیری مرضی'' کہہ کر اپنا سر جھکا دیا۔

ادھر اللہ وسائی سے چمٹا ننھا منٹھار آخر کب تک بہلتا، اس نے رونا شروع کر دیا بلکہ اب تو اس بے چارے میں رونے کی بھی سکت نہیں رہی تھی، اللہ وسائی کو اپنے بچے کی طرف سے تشویش ہونے لگی، اس نے جلدی سے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ سمیٹا اور اپنے لختِ جگر کے آب ترساں لبوں کو بھگونے لگی۔

یہ جگر خراش منظر سارنگ سے نہیں دیکھا گیا، وہ باہر نکل آیا، وہ جانتا تھا اللہ وسائی کے دل میں کیا قیامتیں ٹوٹ رہی ہوں گی مگر نوکِ زبان پر اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ لائی تھی، وہ بہت ہی چپ چپ اور انتہائی سادہ لوح تھی، سارنگ اپنی بھابی اللہ وسائی کے بارے میں سوچتا ہوا اندازے سے گرم ریت پر چلنے لگا، اگرچہ اس کی اپنی حالت بھوک کے باعث غیر ہو رہی تھی لیکن اس کے اندر عزم کی طاقت تابندہ تھی وہ تپتی سلگتی دھوپ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، اس کے دل میں میراں کی محبت اور دماغ میں اس کے پیکر جمال کا تصور روشن تھا، اس سے یوں جدا ہونے کا اسے بہت غم تھا اور وہ خوب جانتا تھا، میراں بھی بے چین ہو گی، پریشان ہو گی اس کے لیے لیکن سارنگ نے قافلے سے جدا ہوتے وقت میراں کو تسلی دینے کی غرض سے اپنے ماں، باپ مٹھل اور عجیباں سے کہا تھا کہ وہ اس کی فکر نہ کریں، وہ بہت جلد ان سے دوبارہ ملے گا۔

میرپور یہاں سے دور تو نہیں تھا کیونکہ میراں کے ماں، باپ اور سارنگ کے ماں، باپ کی منزل میرپور ہی کا ایک گاؤں تھا جو کوٹ میرو کے نام سے موسوم تھا، وہاں ان کے دور کے عزیز رشتے دار رہتے تھے اور وہیں ''رہاکی'' (کھیت مزدوری) کرتے تھے۔ بہرطور سارنگ انہی خیالوں میں چلتا جا رہا تھا، اسے فضا میں ایک امدادی ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ

بھی سنائی دی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر امدادی ہیلی کاپٹر بے رحم گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے اوپر سے گزر گیا، ان کی شاید اس پر نظر نہیں پڑی تھی یا پھر انہوں نے ایک اکیلے انسان کو نظر انداز کر دیا تھا، ہیلی کاپٹر اب صحرائی وسعتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

سارنگ نڈھال سے انداز میں پھر آگے بڑھ گیا، دور دور تک بے رحم تپتے صحرا کے سوا کچھ نہ تھا، جانوروں کے ڈھانچوں پر اب صحرائی گدھوں نے منڈلانا چھوڑ دیا تھا، دفعتاً سارنگ کی نظر ایک ریتیلے ٹیلے پر پڑی، وہ بری طرح ٹھٹکا، وہاں اسے دو گدھ آپس میں لڑتے دکھائی دیے، سارنگ اس سمت کو دوڑا، اس کے چونکنے کی وجہ سورج کی روشنی میں منعکس ہوتی وہ شعاعیں تھیں جو کسی دھاتی شے سے آ رہی تھیں، ریت پر پاؤں دھنسنے کی وجہ سے اس سے دوڑا بھی نہیں جا رہا تھا مگر اس دھاتی شے سے روشنی کے انعکاس نے جیسے اس کے اندر نخلِ امید کا چراغ جلا دیا تھا، جس نے اس کی منتشر طاقت کو مجتمع کر کے آگے بڑھنے پر مہمیز کیا تھا بالآخر وہ گرتا پڑتا ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔

وہ دونوں گدھ اتنے ہٹیلے تھے کہ ایک انسان کی موجودگی کے باوجود لڑنے میں مصروف تھے، ان کی لمبی لمبی پتلی گردنیں بالوں سے عاری تھیں اور سر بھی گنجے تھے۔ اچانک سارنگ نے ایک دلخراش منظر دیکھا تو اسے چکر سا آ گیا۔

دونوں گدھ ایک انسانی ہاتھ کو کھانے میں مصروف تھے، ہاتھ کے ریشے علیحدہ ہو چکے تھے، ہڈیاں تک نظر آ رہی تھیں، سارنگ کا جی متلانے لگا، تیز دھوپ اور گرمی کی وجہ سے بڑی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی، سارنگ نے بمشکل اپنے جی پر قابو پاتے ہوئے اس کراہت آمیز منظر سے توجہ ہٹائی اور اس دھاتی شے کی طرف موڑی، وہ ایک پانی کی سفری بوتل تھی، سارنگ کی آنکھوں میں چمک ابھری، وہ بوتل کی طرف لپکا، یہ مشکیزہ نما بوتل تھی، پلاسٹک کی، اس کا فولادی اسٹریپ دھوپ میں چمک رہا تھا۔

سارنگ نے بوتل اٹھائی، اسے جنونیوں کی طرح ہلا کر دیکھا، اندر پانی کی چھلکاہٹ ابھری، سارنگ نے آس پاس کا یونہی جائزہ لیا، ذرا فاصلے پر ایک بیل کا ڈھانچہ تھا اور دیگر ڈھانچے بھی بکھرے ہوئے تھے، سارنگ نے اندازہ لگایا کہ یہ مشکیزہ نما بڑی سی بوتل شاید فضا میں پرواز کرتے ہوئے امدادی ہیلی کاپٹر نے پھینکی تھی، سارنگ بوتل مضبوطی سے تھامے واپس دوڑا، پانی کی بوتل پا کر اس کے خشک پپڑیاں جمے ہونٹوں پر تراوٹ سی ابھری اور اس کی گویا ازلی پیاس چمکی، اس نے ذرا رک کر بوتل کا ڈھکنا کھولا اور ابھی بوتل کو منہ سے لگانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی بھابی اللہ وسائی اور بچے کا معصوم چہرہ ابھرا پھر جھانی کے بیٹے فریدو کا بھی چہرہ نظر آیا تب سارنگ نے پانی پیئے بغیر بوتل کا ڈھکن دوبارہ بند کر دیا اور لب تر ساں تر کیے بغیر آگے چل پڑا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ خیمے کے اندر داخل ہوا، سب سارنگ کے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے جیسے سارنگ کے ہاتھ میں پانی نہیں، آبِ حیات کی بوتل ہو، سارنگ نے سب سے پہلے بوتل کا ڈھکنا کھول کر اپنی بھابی اللہ وسائی کے خشک لبوں سے لگایا مگر اللہ وسائی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور جلدی سے سارنگ کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اس کے چھوٹے سے ڈھکن میں تھوڑا پانی انڈیلا اور اپنے ننھے بچے منٹھار کے خشک لبوں سے لگا دیا، بچے کا سوکھا حلق پانی سے تر ہوا اور جلد ہی ڈھکن خالی ہو گیا، اللہ وسائی نے دوبارہ ڈھکن کو پانی سے لبریز کیا اور پھر اس کے لبوں سے لگا دیا، پانی کی ٹھنڈک ننھے لبوں سے ہوتی جب معدے میں منتقل ہوئی تو نڈھال سی ننھی جان میں تحریک پیدا ہوئی اور اس نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا، اس کے رونے کی آواز نے اللہ وسائی کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

''بھابی......! تم بھی تو پیو نا......!'' سارنگ نے زخمی لہجے میں بھابی سے کہا تو اللہ وسائی نے انکار میں سر ہلا دیا اور اپنے سامنے جھانی کے ساتھ بیٹھے نو سالہ فریدو کو اپنے پاس بلانے کا اشارہ کیا جو بے چارہ اپنی معصوم اور پیاسی نظروں سے پانی کی بوتل کو تکے جا رہا تھا، اشارہ پانے کی دیر تھی کہ وہ لپک کر آگے بڑھا، اللہ وسائی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی جسے جھپٹنے کے انداز میں پکڑ کر فریدو نے اپنے پیاسے ہونٹوں سے لگا لی اور غٹا غٹ پانی پینے لگا۔

''اڑے چھوکرا......! کیا سارا ختم کر دے گا پانی، بس کر اب......'' اس کے باپ نے اپنے بیٹے فریدو کو گھر کا تو فریدو نے بوتل منہ سے ہٹا دی جسے سارنگ نے لے کر بھابی کو تھما دی۔

''لو بھابی......! اب تھوڑا سا تم بھی پی لو۔'' سارنگ نے کہا۔

''تو بھی تو پی لے...... پتہ نہیں کب سے تو پیاسا ہے۔'' اللہ وسائی نے پُر نم نگاہوں سے سارنگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے بھابی سے کہا۔ ''بھابی...... !تو پی لے بڑی، میں نے راستے میں تھوڑا سا پی لیا تھا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تو جھوٹ بولتا ہے ...... نہیں تو کھا میری قسم......!'' اللہ وسائی نے شک بھری نگاہوں سے اپنے دیور کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ تڑپ کر بولا۔ ''بھابی...... ! پی لے پہلے تُو پھر میں بھی پی لوں گا...... دیکھ ضدمت کر ہم نے آگے بھی نکلنا ہے...... لے شاباش چند گھونٹ بھر لے۔'' یہ کہہ کر سارنگ نے بوتل زبردستی اس کے خشک لبوں سے لگا دی۔

چند گھونٹ بھرنے کے بعد اللہ وسائی نے ناچاہتے ہوئے بھی اپنا منہ پرے کو کر لیا، سارنگ بوتل سنبھالے نڈھال بیٹھے جھانی کے پاس آیا۔ ''لے چاچا...... ! تُو بھی چند گھونٹ پی لے۔'' سارنگ نے اس سے کہا۔

جھانی نے انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے نحیف سی آواز میں کہا۔ ''اڑے نہیں یار...... ! مجھے رہنے دے تُو پی لے، میری خیر ہے۔''

''نہیں چاچا! تو پی لے تو پھر آگے نکلیں...... یہاں ہم کب تک پڑے رہیں گے۔'' سارنگ نے رسان سے کہا۔

''چل یارا...... ! پہلے تو گھونٹ بھر لے پھر میں پیوں گا شاباش!'' جھانی نے کہا تو ناچار سارنگ نے چند گھونٹ پانی پی کر اپنا تھوہر زدہ حلق تر کیا اور بوتل جھانی کی طرف بڑھا دی، جھانی نے بھی چند گھونٹ بھر کر بوتل واپس سارنگ کی طرف بڑھائی تو اس کے نو سالہ بیٹے فریدو نے معصومانہ للچائی نظروں سے پانی کی بوتل کو دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔

''بابا...... ! میں اور پانی پیوں گا۔''

''اڑے بس کر۔ سارا تُو ہی پی جائے گا...... چپ ہو جا......'' باپ کی جھڑکی پر فریدو نے چپ سادھ لی۔

''اب کیا ارادے ہیں یارا...... ! نکلیں آگے......؟'' جھانی نے سارنگ کی طرف دیکھ کر کمزور سے لہجے میں پوچھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ اس میں آگے بڑھنے کی سکت بالکل دم توڑنے لگی ہو۔

''چاچا...... ! آگے تو بڑھنا ہی پڑے گا ورنہ اس جہنم زار میں تو ہم ختم ہو جائیں گے۔'' سارنگ نے کسی قدر تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''یارا...... ! پھر ایسا کر تم لوگ آگے چلے جاؤ پر میرا ایک کام کر دے یارا...... ! میرے لختِ جگر فریدو کو میر پور اس کی ماسی رحتاں تک پہنچا دینا، تیرا مجھ پر اور اس معصوم پر بڑا احسان ہوگا۔'' جھانی نے مجبور لہجے میں اپنے بیٹے فریدو کی طرف دیکھ کر کہا۔

سارنگ اس کے غمزدہ لہجے پر کٹ کر رہ گیا، اپنی رقت پر قابو پاتے ہوئے اس سے بولا۔ ''نہیں چاچا...... ! تُو بھی ہمارے ساتھ چلے گا، فریدو کی تُو ذرا پروا نہ کر، میں اسے اس کی ماسی رحتاں تک پہنچا کر رہوں گا۔''

''اڑے یارا...... ! ضدمت کر، چین بلا نے مجھے کھانا شروع کر دیا ہے، میرے سر کا ناسور میرے بھیجے (دماغ) میں اترنے لگا ہے، میں...... میں اب نہیں بچوں گا، تُو نے خواہ مخواہ اپنا پانی مجھے پلا کر ضائع کیا۔''

سارنگ اس کے لہجے کی یاسیت اور بے چارگی پر سر تا پا کانپ اٹھا اور بے اختیار اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا۔ ''چاچا...... ! یہ تُو کیسی باتیں کر رہا ہے، چل اٹھ شہر میں تیرا علاج کرواؤں گا، میں بھابی اور تیرے کو شہر کے وڈے ہسپتال میں داخل......''

''اڑے یارا رہنے دے مجھے......'' جھانی، سارنگ کی بات کاٹ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''تم کیوں اپڑا وقت کھوٹا کر رہے ہو، میں چلنے کے قابل بھی نہیں ہوں، اب میرا سر بھی چکرانے لگا ہے، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ہے، اللہ وسائی کو بھی چین بلا نے نہیں پکڑا، اسے تو شہر لے جا، یہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی، میں تو...... میں تو گزرنے (مرنے) لگا ہوں۔'' یہ کہہ کر جھانی نے اپنی آنکھیں موند لیں اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ خیمے کے اندر اللہ وسائی کی غم زدہ سسکاری ابھری اور نو سالہ فریدو اپنے باپ کو دیکھ کر رونے لگا۔

☆======☆======☆

لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد لینڈ کروزر ایک نیم اجاڑ سی آبادی میں داخل ہوئی، اطراف کا منظر بڑا ہی لرزہ خیز تھا، جھونپڑیاں ویران تھیں، ان میں گارے مٹی کی دیواروں والے شکستہ و بوسیدہ گھر بھی تھے، یہاں جابجا ریتیلی زمین پر مویشیوں کے پنجر بکھرے ہوئے تھے، کچھ لوگ بے حال سے باقی تھے۔ ریت پر اینٹھتے ہوئے انسان بھی پڑے موت کی گھڑیاں گن رہے تھے، ایک جانب ایک مختصر سا کنبہ چھوٹے سے معصوم بچے کی لاش اٹھائے ماتم کر رہا تھا، ایک مضطرب الحال عورت سینہ کوبی کر رہی تھی، ایسے ہی ماتم کرتے دو تین اور بھی کنبے ڈاکٹر فوزیہ کی نگاہ عبرت کا ساماں ہوئے تو وہ اندر بیٹھی بے اختیار چلا اٹھی۔

''روکو...... روکو گاڑی پہلے ان لوگوں کو ہمارے کیمپ تک پہنچاؤ۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے یوں اچانک چیخنے چلانے پر اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے بندوق بردار افراد کے چہروں پر عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ڈاکٹر جواد کو فوزیہ کی اس حرکت پر ذہنی کوفت ہونے لگی۔ ایسے میں ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ پر براجمان اس منشی ٹائپ شخص نے بے رحمانہ انداز میں اپنی گردن موڑے بغیر فوزیہ سے کہا۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ......! یہ حالت صرف اس گوٹھ کی نہیں بلکہ پورے تھرپارکر کی ہو رہی ہے، آپ کس کس کو اپنے کیمپ پہنچائیں گی۔''

''فوزیہ......! پلیز فار گاڈ سیک...... چپ رہو۔'' اس بار اس کے ساتھ بیٹھے ڈاکٹر جواد نے ڈاکٹر فوزیہ کو ٹوکا تو ناچار فوزیہ دل مسوس کر چپ ہو رہی تاہم اس نے اب شیشے کے پار جگر خراش مناظر سے نگاہیں ہٹالیں۔

ذرا ہی دیر بعد لینڈ کروزا ایک جھٹکے سے رک گئی، یہ لوگ نیچے اترے، سامنے خاصے وسیع رقبے پر ایک پرانی سی نیم پختہ حویلی تھی جو ایک منہدم چہار دیواری کے احاطے کے اندر واقع تھی، احاطے کا دیوہیکل چوبی گیٹ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے عرصۂ دراز سے بند کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی گئی، وہ ریتیلی زمین دھنسا ہوا تھا، یہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے اس شکستہ چار دیواری کے اندر داخل ہوئے، حویلی کا دروازہ بند تھا، وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، قریب ہی ایک چھپر نما اوطاق کا دروازہ بھی نظر آیا جو کھلا ہوا تھا، منشی نے رک کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اڑے بابا......! تم ان لوگوں کو ادھر اوطاق میں بٹھاؤ اور ان کے چائے پانی کا بندوبست کرو، میں ڈاکٹرنی صاحبہ کو اندر لے کر جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر پھر وہ ڈاکٹر فوزیہ سے مخاطب ہوا۔ ''آؤ ڈاکٹر صاحبہ......! آپ کا مریض اندر ہے۔''

ڈاکٹر فوزیہ تذبذب کا شکار ہوگئی اور ڈاکٹر جواد کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ایسے میں ڈاکٹر جواد نے کہا۔ ''ڈاکٹر فوزیہ اندر اکیلی نہیں جائے گی، میں اور عملے کے لوگ بھی اندر جائیں گے۔'' اس کی بات سن کر منشی نے خشمگیں نظروں سے ڈاکٹر جواد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اڑے بابا......! اندر زنانی کو بچہ ہونے والا ہے، تم مردوں کا کیا کام، بس یہ عورت ساتھ اندر جاسکتی ہے۔'' اس نے ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ میڈیکل بیگ تھامے کھڑی موسیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہاری بات غلط ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے بھی تنہا اس کے ہمراہ اندر جانے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا تعلق ڈاکٹری جیسے معزز پیشے سے ہے، رہی بات ایک

عورت کو دیکھنے کی تو ظاہر ہے الگ کمرے میں، میں ہی اس کا معائنہ کروں گی، یہ لوگ صرف مددگار کی حیثیت سے کمرے سے باہر موجود رہیں گے، کیا اندر اتنی بڑی حویلی میں صرف ایک ہی کمرہ ہوگا......؟''

ڈاکٹر فوزیہ کے چبھتے لہجے پر منشی ذرا جزبز ہوا، چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے آجاؤ سب لوگ......!''

ڈاکٹر جواد، فوزیہ کے آگے چل رہا تھا اور فوزیہ کے عقب میں اشرف اور موسیٰ تھے باقی بندوق بردار بھی پیچھے چلے آرہے تھے، سب سے آگے منشی تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے جیسے ہی حویلی کے اندر قدم رکھا، جانے کیوں ایک انجانے اندیشے تلے اس کا دل زور سے دھڑکا، وہ خوف زدہ سی ہوگئی مگر اب وہ لوگ ان کے ساتھ یہاں تک آچکے تھے اور یہاں سے واپس لوٹنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہ بچا تھا، اندر ایک اونچی چھت والے بڑے کمرے میں انہیں بٹھا دیا گیا، ڈاکٹر فوزیہ نے اندر کمرے میں قدم رکھتے ہی کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں سننے کی کوشش کی تھی مگر اس کی توقع کے برخلاف اس کے کانوں میں ایسی کوئی آواز نہ پڑی، اس کے دل میں پھر کھٹکا ہوا۔

''آپ لوگ ادھر بیٹھو، مریضہ ساتھ کے کمرے میں ہے، ادھر اور بھی عورتیں موجود ہیں۔'' منشی نے ڈاکٹر جواد سے کہا پھر ڈاکٹر فوزیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ آیئے ڈاکٹرنی صاحبہ......!''

ڈاکٹر فوزیہ ایک بار پھر تذبذب کا شکار ہوگئی تاہم وہ موسیٰ کو اپنے ساتھ لے کر منشی کے ساتھ چل دی، وہ ان کو سیلن زدہ سی غلام گردشوں اور راہداریوں سے گھماتا ہوا ایک نسبتاً چھوٹے کمرے میں لے آیا۔

اندر قدم رکھتے ہی ڈاکٹر فوزیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اسے سامنے مسہری پر ایک نہایت خوبصورت اور الھڑ سی دوشیزہ پاؤں لٹکائے بیٹھی نظر آئی، وہ بڑے زرق برق لباس میں تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر بڑے کرب کے تاثرات نمایاں تھے، ڈاکٹر فوزیہ کو وہ کہیں سے بھی بیمار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک فوزیہ کی نگاہ اپنے دائیں جانب پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹکی، ایک منقش پایوں والی بان کی بڑی کرسی پر ایک جوان شخص بیٹھا نظر آیا، اس کے تیور دیکھ کر ہی ڈاکٹر فوزیہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی بگڑا ہوا عیاش وڈیرا زادہ ہے، وہ خاصے ڈیل ڈول کا مالک تھا اور عمر میں پینتیس کے قریب رہی ہوگی، اس نے سفید براق شلوار، قمیض پر اجرک کو بڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قرینے سے لپیٹ رکھا تھا جو اس کے چوڑے شانوں تک آئی ہوئی تھی، وہ بڑے شاہانہ انداز کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے سگریٹ پی رہا تھا، اس کے سامنے تپائی پر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر کے علاوہ منرل واٹر کی بوتلیں اور شراب کا آدھا بھرا پیگ رکھا ہوا تھا، وہ بڑی گھورتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر فوزیہ کو دیکھے جا رہا تھا، ڈاکٹر فوزیہ کی حالت دگرگوں ہونے لگی، اسے یہ سارا ماحول تشویش ناک حد تک خطرناک محسوس ہو رہا تھا، وہ جیسے یکدم ٹرانس میں آ گئی اور اپنی جگہ چند ثانیے کے لیے دم بخود سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆======☆======☆

صحرا میں جلد ہی شام اتر آتی تھی، جو بالآخر ٹھٹھرتی رات پر منتج ہوتی چنانچہ جیسے ہی ریت پر طائرِ شب نے اپنے سرمئی پنکھ پھیلانے شروع کیے، میر کارواں سائیں بخش نے قافلہ روک دینے کا حکم دیا پھر اس کے بعد عارضی پڑاؤ کی تیاریاں ہونے لگیں، تھکے ہارے نڈھال ہاتھوں نے چار پائیوں، اجرکوں اور موٹی موٹی رلیوں سے خیمے تان دیئے، مٹھل اور عجبیاں بے سدھ ہو کر پڑ گئے، ملوکاں جاگ رہی تھی جبکہ اس کا بڑا بھائی خالقو بھی اب اپنی بیوی اللہ وسائی اور بچے منٹھار کو صحرا میں چھوڑنے کی وجہ سے اداس تھا، وہ ایک طرف لاش کی طرح ڈھیر ہو کر پڑ گیا تھا، ایک طرف کونے میں بیٹھی ہوئی اس کی بہن ملوکاں بڑی نفرت انگیز نگاہوں سے اپنے بھائی خالقو کو دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں غمناک تھیں، اسے اپنی سادہ لوح بھابی اللہ وسائی یاد آ رہی تھی اور اس کی گود میں ہمکتا ہوا اپنا ننھا بھتیجا منٹھار بھی یاد آ رہا تھا، اسے بہت دکھ ہو رہا تھا اپنی بھابی اور بھتیجے سے اس طرح جدا ہونے پر، تاہم ملوکاں کو اپنے بھائی سارنگ کی طرف سے قدرے تسلی تھی جو اپنی بھابی کی وجہ سے صحرا میں ہی اس کے ساتھ رک گیا تھا۔ درحقیقت یہ دونوں بہن بھائی ہی اللہ وسائی کے ہاتھوں میں کھیلے ہوئے تھے، ملوکاں کو اپنے ماں باپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ چاہیے تو انہیں بھی یہ تھا کہ جیسے ہی اللہ وسائی کو قافلے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا تو یہ لوگ بھی علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ملوکاں اب کڑھے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی، کیا ہوتا اگر یہ لوگ بھی قافلے سے الگ ہو جاتے تو خود بھی تو آخر اپنی کوششوں سے منزل تک پہنچا جا سکتا تھا، اس طرح کم از کم سب لوگ ساتھ تو رہتے۔ شاید بھوک، پیاس کی مجبوری ہوتی ہی اس قدر زہریلی ہے کہ انسان کو بے حس سا بنا دیتی ہے۔ ملوکاں کو اچانک میراں کا خیال آیا، وہ جانتی تھی کہ سارنگ اور اس کے بیچ کس قسم کا تعلق تھا اور اس وقت وہ اس کے لیے کس قدر بے چین اور پریشان ہو رہی ہو گی۔

ملوکاں کا خیال بالکل درست تھا کیونکہ یہ ان دو چار پائیوں کے ایک چھوٹے سے خیمے کے اندر گھٹنوں میں سر دیئے اداس اور رنجور بیٹھی ہوئی تھی، اس کا باپ سکھیو اور ماں سو چکے تھے، تھوڑا بہت جو کھانے پینے کو ان کے پاس تھا وہ آج رات میں ختم ہو چلا تھا، اب کل کے لیے ان لوگوں کے پاس منہ گیلا کرنے کے لیے بھی کچھ باقی نہ بچا تھا، اگرچہ میر کارواں نے صبح ہوتے ہی منزل تک پہنچ جانے کی خوشخبری سنائی تھی لہٰذا اس مژدہ جانفزا نے بھی تن مردہ میں جان سی ڈال دی تھی۔

میراں اس وقت اداس بیٹھی سارنگ کو یاد کر رہی تھی جو اس کے دل کے قریب ترین تھا۔ جب سے سارنگ قافلے سے جدا ہوا تھا، اسے ایک پل بھی چین نہیں ملا تھا، جدائی کے عذاب تلے اس کا معصوم دل انجانے خوف کا شکار ہونے لگا تھا حالانکہ جدا ہوتے وقت سارنگ نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ کر تسلی دی تھی کہ وہ بہت جلد آخری منزل میر پور خاص کے گوٹھ جمعہ خان ضرور پہنچ جائے گا لیکن میراں کے دل کو جانے کیوں قرار نہیں مل رہا تھا۔ رات کے اس سمے اس کی بھیگی بھیگی خوبصورت آنکھوں میں اپنے محبوب سارنگ کا ہی روشن روشن چہرہ رقصاں تھا، وہ اپنے دل ہی دل میں سارنگ سے شکوہ کرنے لگی تھی کہ اسے اس کا بھی خیال نہ آیا، کس بے رحمی سے اس نے قافلے کو نہیں بلکہ خود اسے الوداع کہہ دیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے جب دل پر عقل غالب آئی تو اسے اپنے محبوب کا فیصلہ مستحسن لگا، وہ انسانی ہمدردی کی خاطر اس قافلے سے جدا ہوا تھا ورنہ اسے کیا ضرورت تھی.....؟ اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے کو قافلے سے جدا کرنے کے حکم نامے پر خود میراں کو بھی دکھ ہوا تھا اور ایسے میں میراں کا اپنا کلیجہ بھی ہولنے لگا تھا کہ بے چاری اللہ وسائی تو دہرے غم کا شکار ہونے لگی تھی، ایک طرف اسے قافلہ چھوڑ رہا تھا اور دوسری طرف اس کا بے حس اور سنگدل شوہر خالقو بھی اسے اپنی زندگی سے نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میراں کو کچھ تسلی ہونے لگی کہ سارنگ کا قدم ایک مجبور اور دکھوں کی ماری عورت کے تحفظ کے لیے نہیں اٹھا تھا بلکہ اس کے ساتھ نتھی اس ننھی جان کی بھی سلامتی کا سوال تھا جو اللہ وسائی کا لختِ جگر تھا۔ میراں اب اپنی غمناک آنکھیں موند کر سارنگ اور اللہ وسائی کی سلامتی کے لیے خدا سے دعا مانگنے لگی، باہر رات دبے پاؤں ٹھٹھرتی ریت پر رینگ رہی تھی، میراں نے ایک میلی چیکٹ سی رلی اپنے اوپر اوڑھ رکھی تھی مگر اسے شروع ہی سے سردی کا احساس کم ہوا کرتا تھا، ہر سو سناٹا طاری تھا، بالکل اتھاہ گہری خاموشی کی چادر تھی جو دم بخود ماحول میں تنی ہوئی تھی کہ اچانک باہر سناٹے میں کچھ ایسی آوازیں ابھریں جیسے کوئی صحرائی طوفان امڈ آیا ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میراں چونک پڑی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا مگر اس نے اپنے حواس مختل نہ ہونے دیئے، وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور اگلے ہی لمحے چیخوں کی آوازیں ابھریں، اس کے ساتھ کئی رائفلیں ایک ساتھ گرجیں، میراں کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا، باہر اب شور کے ساتھ افراتفری سی مچ گئی تھی، میراں نے دہشت زدہ ہو کر بے سدھ سوئے ہوئے اپنے ماں، باپ کو جھنجوڑ کر جگایا پھر ٹھیک اسی وقت تین چار افراد کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، ان کا رخ خیمے کی طرف تھا، میراں دہشت زدہ ہو کر خیمے کے روزنوں سے باہر چاندنی میں چند رائفل بردار افراد کو اپنے خیمے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے ان کا خیمہ ڈھا دیا گیا، میراں کے حلق سے ہذیانی چیخ برآمد ہوئی، وہ چار ڈھاٹا پوش مسلح افراد خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپاتی میراں کے قریب آئے اور ڈھاٹوں کے افق سے ان کی خوفناک آنکھیں وحشیانہ چمک لئے ہوئے تھیں، وہ کالی گھیردار شلوار قمیض میں ملبوس تھے، ان چاروں نے بدمست قہقہے لگائے اور لرزتی کانپتی میراں کو دبوچ لیا۔ مٹھل اور مائی عجیباں نے یہ منظر دیکھا تو مٹھل نے فوراً اپنے سر سے ٹوپی اتار کر اور مائی عجیباں نے اپنے سر کی چادر ان کے آگے پھیلا کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری دھی کو چھوڑ دو، بھلے ہمیں لے جاؤ...... تمہارے کو اللہ سائیں کا واسطہ...... مرشد سائیں کا واسطہ......!''

''اڑے پرے ہٹو...... تم دونوں کا ہم کیا اچار ڈالیں گے۔'' ایک نسبتاً لمبے تڑنگے ڈھاٹا پوش شخص نے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''چلو اڑے اٹھاؤ اس کو...... اپڑیں پاس وقت ویسے ہی کم ہے۔''

مٹھل اور عجیباں زاروزار روتے ہاتھ جوڑتے ہوئے ڈاکوؤں کے پیروں پر گرے مگر وہ تو مجسم پتھر تھے لہٰذا انہوں نے حقارت آمیز غیظ سے دونوں بوڑھوں کو ٹھوکر رسید کر دی اور میراں کو بڑی بیدردی کے ساتھ کھینچ کر کاندھے پر ڈال لیا۔

میراں کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، یہ بدنصیب قافلہ صحرائی لٹیروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا جن کا کام ہی کارواں لوٹنا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ آج اس دھرتی پر ویسے ہی خدائی قہر نازل ہے اور لوگ بھوکے، پیاسے مر رہے تھے۔ چیزوں، روپوں اور مال و اسباب کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی، لیکن یہ لیٹرے مال و اسباب کے نہیں بلکہ عزت کے لٹیرے تھے، ایسی آفات اس دھرتی پر ٹوٹتی رہتی تھیں کہ لوگ تنگ آ کر کارواں کی صورت میں شہر یا کسی دریا کے کنارے آباد دیہاتوں کا رخ کرتے تھے، بہر طور اس

وقت اس قافلے پر آفات ٹوٹ چکی تھیں، صحرائی لٹیروں نے خوب قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا جس نے ان کے سامنے مزاحمت کرنے کی کوشش کی، اسے بڑی بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جوان عورتوں اور لڑکیوں کی خاصی کھیپ اپنے گھوڑوں پر ڈال لی اور یہ جا وہ جا۔ وہ ان کی عزتوں پر حملہ کر کے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لٹے پٹے پڑاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا، سب کچھ تلپٹ تھا، لاشیں بکھری ہوئی تھیں، جو زندہ بچ گئے تھے، وہ ماتم کناں تھے جو زخمی تھے، وہ نیم مردہ حالت میں کراہ رہے تھے۔ انہیں بھوک، پیاس اور قحط نے اتنا نہیں توڑا تھا جتنا ان صحرائی لٹیروں نے، وہ ان کی عزتوں کو لوٹ کر شیطانی اندھیاروں میں غائب ہو چکے تھے، سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

سارنگ نے خیمے کے مختصر سامان کو اپنی پشت پر باندھ لیا تھا، اللہ وسائی اس کے عقب میں چل رہی تھی، اس کی گود میں پڑا بچہ ایک بار پھر بھوک اور پیاس کی شدت سے خاموش ہو چکا تھا، جھانی کا نو سالہ لڑکا فریدو، سارنگ کے ساتھ چل رہا تھا، اس کا چہرہ ابھی تک آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور وہ اپنے باپ جھانی کو یاد کر کے وقفے وقفے سے سڑکی لگاتا اور پھر اپنی میلی آستین سے ناک اور چہرہ پونچھتا۔ اس کی معصومانہ اور روایتی حرکت کو دیکھ کر سارنگ کا جگر چھلنی ہونے لگتا تھا، اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، معصوم فریدو کا اب اس بھری دنیا میں اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا، جھانی اس پُراسرار بیماری کی لپیٹ میں آ کر مر چکا تھا اور سارنگ نے بوجہ مجبوری جھانی کی لاش کو وہیں ریت میں دفنا دیا تھا اور پھر یہ لوگ وہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہرے تھے۔ سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی کی اس سے زیادہ اپنے ننھے منے بھتیجے کی زیادہ فکر تھی کیونکہ اللہ وسائی کو بھی بہرحال چین بلا جیسی بیماری تھی اور سارنگ شہر پہنچ کر جلد سے جلد اسے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا تھا۔ اسے یہ حقیقت بھی معلوم تھی کہ یہ بیماری چھوت کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے لیکن لاعلاج نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس پُراسرار بیماری کا علاج پورے تھر میں نہ تھا۔ ویدوں، حکیموں کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آ سکا تھا... منزل تک پہنچنے کی سارنگ کے دماغ میں ایک عجیب ترکیب سمائی تھی، وہ قافلے کے لوگوں کو قدموں کے نشانات سے رہنمائی لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، یوں جلد سے جلد مطلوبہ منزل تک پہنچ جانے کی امید بالکل واضح تھی اور راستہ وغیرہ بھی بھولنے کا احتمال نہ تھا لہٰذا اب تک وہ اسی طرح ہی کافی فاصلہ طے کرتے چلے آئے تھے حتیٰ کہ رات سر پر آ گئی، پیروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تلے جلتی ریت اب ٹھنڈی ہونے لگی تھی، طباق چاند ننھے منے تاروں کی فوج سمیت آسمان پر ٹکا ہوا تھا، صحرا میں بکھری ہوئی نرم نرم گداز چاندنی بکھری ہوئی تھی، سارنگ نے جیسے تیسے مختصر سا خیمہ ایستادہ کیا، بچا کھچا پانی بچے اور فرید کو پلا دیا جبکہ انتہائی قلیل مقدار میں پانی کو اگلے دن کے جہنم زار سے گزرنے کے لیے بچا لیا گیا، اب ان کا ارادہ پانی پینے کا نہیں تھا بلکہ ململ کے کپڑے کو گیلا کر کے اسے اگلا سارا دن چوس چوس کر گزارنے کا تھا، بھوک کے مارے ان کے پیٹ پچک کر کمر سے جا لگے تھے۔ خیمہ وغیرہ ایستادہ کرنے کے بعد سارنگ نے اللہ وسائی سے کہا۔ ''بھابی...... ! میں ذرا اِدھر اُدھر کچھ کھانے کو تلاش کرتا ہوں، کم از کم تمہیں اور فرید کو کچھ کھانے کو مل جائے۔''

''مم...... مگر ادا سارنگ...... ! تم اتنی رات کو اس ویران صحرا میں کیا تلاش کرو گے...... ؟ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔'' اللہ وسائی نے کسی قدر پریشان ہو کر سارنگ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سارنگ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بھابی...... ! کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے ہی ورنہ ریت کا یہ بے رحم سمندر ہمیں لے ڈوبے گا...... پیٹ کا جہنم تو سرد کرنا ہی پڑے گا...... تو آرام سے ادھر بیٹھ، میں ابھی آجاتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر سارنگ اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے سے باہر اندھیرے میں نکل آیا۔

چہار سو ریت کا سمندر مدہم چاند کی طلسماتی روشنی میں دمکتا محسوس ہو رہا تھا، اطراف میں ذرا ذرا فاصلے پر بکھرے ہوئے ریتیلے ٹیلوں پر ویرانی مسلط تھی، صحرا کی اسرار بھری رات گویا ان ویران ٹیلوں پر سسک سسک کر رینگ رہی تھی، سارنگ نے ایک گہری سانس بھری اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گیا، وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا اور ٹھنڈی ریت پر دانستہ اپنے پاؤں گھسیٹنے کے انداز میں چل رہا تھا تاکہ وہ اس سراب زدہ صحرا میں واپس اپنے خیمے تک کا راستہ نہ بھول جائے، جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کھانے، پینے کی کوئی نہ کوئی شے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ تھا بھی تو اپنی ہٹ کا پکا۔ اس نے پانی کی وہ مشکیزہ نما بڑی سی بوتل بھی تو اسی طرح تلاش کی تھی جس نے اس کی امیدوں کو مزید جوشیلی تحریک دی تھی۔

وہ اب اپنے خیمے سے کافی دور نکل آیا تھا، اس نے ذرا رک کر اپنے عقب میں یونہی نگاہ دوڑائی، خیمہ اب اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، وہاں اب دور دور تک پُر اسرار چاندنی میں ہولناک ریتیلے ویرانوں کے سوا کچھ نہ تھا، سارنگ پھر آگے بڑھنے لگا۔

پھر جب وہ ایک ریتیلا ٹیلا پار کر کے چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ داہنی جانب ایک روشنی پر پڑی، اس کا دل امید بھری مسرت سے یکبارگی دھڑکا، وہ روشنی ایک قدرے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ٹیلے کے ڈھلان کے عقب سے مدہم سی چمک مارتی ہوئی نظر آ رہی تھی، تب سارنگ نے ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر تیز تیز قدم بڑھانے شروع کر دیئے، ذرا سی دیر بعد وہ اس ٹیلے کے قریب پہنچ چکا تھا، وہ پُراسراری روشنی اس ویران چاندنی میں نہائے ہوئے ٹیلے کے عقبی ڈھلان سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، سارنگ اب دیوانہ وار ٹیلے پر چڑھنے لگا، ٹیلہ وسیع رقبے میں پھیلا ہونے کی وجہ سے زیادہ بلند نہ تھا تاہم اسے پار کرنے کے لیے سارنگ کو دیر تک چلنا پڑا تھا اور بالآخر اس کے دوسرے ڈھلوانی سرے تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح ہانپ گیا تھا اور بے دم ہو کر وہیں ریت پر گر گیا، اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی، نقاہت کے مارے اب تو اس کے جسم میں اٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی، بے اختیار اس پر غشی طاری ہونے لگی، بے ہوشی طاری ہونے سے پہلے اس کی نیم غنودہ آنکھوں نے سامنے ایک جھونپڑی نما خیمہ دیکھ لیا تھا جس کے قریب ایک اونٹ بھی بندھا جگالی کر رہا تھا، وہ روشنی اس جھونپڑی کے اندر سے آ رہی تھی۔ سارنگ نے منہ کھول کر چلانے کی ناکام سعی کی اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆======☆======☆

اچانک اس کی دم بخود سماعتوں سے ایک کرخت آواز ٹکرائی۔

''تم لیڈی ڈاکٹر ہو...... ؟'' اس کرخت صورت نوجوان نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر ڈاکٹر فوزیہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے خود کو سنبھالا اور اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اسے یہ کرخت رو نوجوان ایک آنکھ نہیں بھایا تھا، اس کا انداز تخاطب اور لٹھ مارتا ہوا لہجہ اسے انتہائی ناگوار گزر رہا تھا بلکہ اسے تو غصہ آنے لگا تھا کہ اسے جس طرح عجلت میں ایمرجنسی کال کے طور پر بلوایا گیا تھا، وہ اسے دور دور تک یہاں محسوس نہیں ہو رہی تھی، اس کے ساتھ میڈیکل بیگ سنبھالے ہوئے موسی بری طرح گھبرائی ہوئی حیران پریشان کھڑی تھی۔

''تم تو کہہ رہے تھے تم کو یہاں کسی عورت کا مسئلہ ہے، کہاں ہے وہ عورت...... ؟''

ڈاکٹر فوزیہ نے اس کرخت رو نوجوان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں خشکی سے پوچھا۔ اس کے پتلے پتلے سیاہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! میں نے کب جھوٹ بولا تھا، آپ آرام سے بیٹھو تو سہی، آپ کو سب سمجھاتے ہیں۔'' اس نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ ایک بار پھر اس کی طرف تیکھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں بولی۔ ''دیکھو مسٹر......! میں یہاں کچھ سمجھنے یا سمجھانے کے لیے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی مجھے تمہارا یہ گھٹیا مذاق پسند آیا ہے۔''

''ڈاکٹر......! آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ اور ہماری بات غور سے سنو۔''

اس کرخت رو نو جوان نے سرسراتے ہوئے بارعب لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے کہا تو نہ جانے کیوں اس کے لہجے پر ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے اندر انجانے خوف کی لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی مگر اس نے اپنے اعصاب منتشر نہیں ہونے دیے، وہ اس متوقع وڈیرے زادے کے رعونت آمیز لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''دیکھو مسٹر......!''

''جہاں داد خان نام ہے میرا......!''

''ہاں مسٹر جہاں داد خان......! یہ شخص جو شاید آپ کا منشی ہے، مجھے یہاں......''

''ہوں......! میں جانتا ہوں بابا...... جانتا ہوں۔'' جہاں داد ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر بولا اور ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے کی طرف عجیب نظروں سے گھورتا ہوا اس کے قریب آیا، ڈاکٹر فوزیہ اس کی بڑی بڑی چبھتی ہوئی آنکھوں میں کروٹیں لیتی پُراسراریت کو محسوس کر کے بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی، مسہری پر بیٹھی ہوئی نوخیز دوشیزہ یکدم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے انداز سے ابھی تک گھبراہٹ اور پریشانی مترشح تھی۔

''سنو ڈاکٹرنی صاحبہ......! ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ ہم تمہیں اس کا منہ مانگا انعام دیں گے۔'' وڈیرے زادے جہاں داد نے ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر فوزیہ ٹھٹکی۔ اسے جہاں داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ اس نے اپنے مرتعش حواس پر قابو پانے کے لیے ایک طویل سانس بھری۔

یہاں کا پُراسرار ماحول، جہاں داد کا انداز تخاطب، ڈری سہمی نوخیز دوشیزہ...... ان سارے عوامل نے ڈاکٹر فوزیہ کو ایک لمحہ میں اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو اس سارے معاملے میں دال میں کالا نظر آ رہا تھا۔ تاہم وہ خود پر قابو پاتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں بولی۔ ''دیکھئے مسٹر جہاں داد......! مجھے یہاں ایک مریضہ کو دکھانے کے لیے لایا گیا تھا مگر یہاں مجھے کوئی مریض نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے میں اب واپس جانا بہتر سمجھوں گی۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ واپس پلٹی۔

''ٹھہرو......!'' اچانک ڈاکٹر فوزیہ کی سماعتوں میں جہاں داد کی گونجدار آواز ٹکرائی اور وہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے پلٹتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! آپ ناراض مت ہونا۔ ہمیں آپ کا ہر حال میں احترام لازم ہے...... آپ ہماری بات سن لیتیں تو بڑی مہربانی ہوتی۔'' اس بار جہاں داد کا رویہ غیر متوقع طور پر نرم سا ہو گیا جس نے ڈاکٹر فوزیہ کو اس کی بات سننے پر مجبور کر دیا۔

''جی بولیں......'' ڈاکٹر فوزیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

جہاں داد دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ''اس لڑکی کا پاؤں بھاری ہے۔'' جہاں داد کا اشارہ گھبرائی ہوئی اور سراسیمہ لڑکی طرف تھا۔ ''آپ اس کو کسی طرح اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ اس کے لیے آپ جتنی رقم......''

''جہاں داد صاحب......!'' ڈاکٹر فوزیہ لرزتی ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹتی ہوئی بولی۔ اس نے چشم زدن میں اس کی بات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اصل ''معاملہ'' کیا ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے ایک جرم کی پردہ پوشی کے لیے ادھر لایا گیا ہے۔ ''جس منہ مانگی رقم کا آپ ذکر کر رہے ہیں...... وہ آپ اپنے پاس ہی رکھیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے میرے معزز پیشے پر دھبہ لگے۔'' ڈاکٹر فوزیہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

ٹھیک اسی وقت منشی قسم کا شخص حرکت میں آیا اور اس کا راستہ روک کر اسے گھورنے لگا۔ موسیٰ کی تو روح فنا ہو گئی۔ خود ڈاکٹر فوزیہ بھی ایک لمحے کو لرز سی گئی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے، ہٹو آگے سے......''

مگر ڈاکٹر فوزیہ کی بات کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر فوزیہ کے اندر سنسناہٹ بڑھنے لگی۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! آپ کو ہر حالت میں ہمارا یہ کام کرنا پڑے گا۔'' معاً عقب سے جہاں داد کی سرسراتی آواز ابھری۔

ڈاکٹر فوزیہ اس لہجے پر کانپ سی گئی۔ مگر ہمت کر کے پلٹی اور جہاں داد کو گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ ''یہ سراسر غیر قانونی ہے۔ میں یہ جرم نہیں کر سکتی۔ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے ورنہ......'' ڈاکٹر فوزیہ کی کمزور تنبیہ پر جہاں داد کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور پھر وہ برماتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اس دھرتی کے مالک ہم ہیں...... یہاں قانون بھی ہمارا چلتا ہے۔ تم کو ہماری بات ماننی پڑے گی...... ورنہ ہمیں مجبوراً دوسرا طریقہ آزمانا پڑے گا۔'' اس کے لہجے کی نخوت پر ڈاکٹر فوزیہ کا غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیات سے پورا وجود مرتعش سا ہونے لگا۔ وہ مارے بے بسی کے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''دوسرے طریقے'' سے جہاں داد کی کیا مراد تھی؟ فوزیہ کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ اب یہاں آکر بری طرح پچھتا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ میں آ پھنسی ہو۔

جہاں داد کے ایک دو اور مسلح حواری بھی وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنی خوفناک آنکھوں سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ اب محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کے پاس اب ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تاہم وہ مفر کی ایک آخری سعی کرتے ہوئے قدرے معتدل لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے پھر...... لیکن میں ایک بار اپنے عملے کے لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ان کی تم فکر نہ کرو۔'' جہاں داد نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''وہ ہمارے آدمیوں کی نگرانی میں بہ خیریت ہیں اور ویسے بھی ان لوگوں کو تم نے ''اندر کی بات'' نہیں بتانی ہے۔ چلو اب کام شروع کرو۔ زیادہ وقت نہ تمہارے پاس ہے نہ ہمارے پاس ہے۔''

ڈاکٹر فوزیہ بے بسی کے ساتھ اپنے ساتھ کھڑی موسی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بے چاری خود فوزیہ کو سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ اب ان لوگوں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر مسہری کی طرف بڑھی۔ وہ نوخیز دوشیزہ ہنوز گھبرائی ہوئی پائینتی کے سہارے مسہری سے لگی کھڑی تھی۔

فوزیہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کی حالت مزید غیر ہونے لگی اور بے اختیار وہ آگے بڑھ کر روتی ہوئی جہاں داد کے قدموں میں گر گئی اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ ''نا سائیں نا...... میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو۔ میں اپنا بچہ مارنا نہیں چاہتی۔ اللہ سائیں کا واسطہ مجھ پر اور میرے بچے پر رحم کرو۔''

ڈاکٹر فوزیہ اس لڑکی کی گریہ وزاری پر مزید پریشانی کا شکار ہو گئی۔ اب اسے بھی ایک کرید سی لگ گئی تھی کیونکہ اصل حقیقت سے ہنوز وہ لاعلم ہی تھی۔

''اڑی بکواس بند کر...... نہیں تو ادھر ہی جان سے مار کر زمین میں گاڑ دوں گا۔ چل جا...... سو جا مسہری پر۔'' جہاں داد نے غصیلے لہجے میں اسے پاؤں کی ٹھوکر رسید کی۔ پھر اسی

وقت اس نے اپنے حواریوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا تو اس کے دو کارندے آگے بڑھے اور انہوں نے فرش پر روتی اس نوجوان لڑکی کو بازوؤں سے پکڑ کر نہایت بیدردی سے مسہری پر پھینک دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ کو لڑکی کی حالت پر رحم اور جہاں داد کی سنگ دلی پر شدید غصہ آرہا تھا۔ مگر وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔ وہ خود ان کے سامنے بے بس تھی۔ لڑکی اب مسہری پر دراز ہو چکی تھی اور گھٹی گھٹی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے جہاں داد کی طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم سب کو اس کمرے سے باہر نکلنا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر جہاں داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنے دونوں حواریوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔

''یہاں کوئی مرد نہیں رکے گا...... تم دونوں کو بھی باہر جانا ہوگا۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں جہاں داد کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ نخوت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے...... آپ اپنا کام کرو۔''

''مگر یہ میرے پروفیشن کے خلاف ہے کہ کوئی مرد یہاں موجود ہو۔ اس طرح میں اپنا کام تسلی بخش طریقے سے نہیں کر پاؤں گی۔ اسے میری مجبوری سمجھ لو۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے گہری متانت سے کہا۔

جہاں داد تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ایسے میں اچانک اس کے قریب کھڑے منشی ٹائپ شخص نے جہاں داد سے کہا۔ ''سائیں وڈا...... ! آجاؤ...... باہر چلتے ہیں...... میڈم کو اپنا کام آزادی سے کرنے دو۔'' اپنے منشی کی بات پر جہاں داد نے سنسناتی ہوئی گہری سانس بھری اور پھر دھیرے دھیرے اپنا سر اثبات میں ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

منشی بھی دانت نکالتا ہوا اپنے سائیں وڈے کے عقب میں چلتا کمرے سے نکل گیا۔

''دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر دو موسی۔'' ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے مرتعش آواز میں موسی سے کہا تو موسی نے میڈیکل باکس نیچے رکھ کر فوراً دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

ڈاکٹر فوزیہ مسہری کے قریب آئی۔ اس کی نگاہیں سسکیاں لیتی مسہری پر دراز اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اس پر ترس آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جانے یہ کون ہے اور کس غریب ہاری کی بیٹی ہے جو اس بھیڑیا صفت وڈیرے زادے کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تمہارا نام کیا ہے..... کون ہو تم؟" ڈاکٹر فوزیہ نے قدرے نرم لہجے اور دھیمی آواز میں اسے مخاطب کر کے پوچھا تو اس لڑکی نے اپنی سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے لرزیدہ آواز میں اپنا نام سدھوراں بتایا۔

"تم کس کی بیٹی ہو اور جہاں داد سے تمہارے کب سے اس قسم کے تعلقات ہیں؟" ڈاکٹر فوزیہ نے بغور اس کے ستے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ یہ لڑکی اسے غیر معمولی حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرمگیں اور بڑی بڑی تھیں..... چہرہ کنول کی طرح اگر چہ شاداب تھا مگر اس سے اس کے معصوم اور ملکوتی حسن پر کیچڑ کے چھینٹے پڑ چکے تھے۔

"مم..... میں..... جی وہ..... وہ....." سدھوراں کے سسکتے حلق سے بے ربط انداز میں نکلا اور پھر اچانک جانے اسے کیا ہوا کہ وہ یکدم مسہری سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچے اتر کر ڈاکٹر فوزیہ کے پیروں کو چھونے لگی۔ مگر ڈاکٹر فوزیہ جو پہلے ہی اس کے اس اچانک مسہری سے اترنے کا مطلب سمجھ چکی تھی فوراً اپنے پیروں پہ جھکنے سے روکنے کے لیے اسے دونوں شانوں سے تھام لیا اور قدرے ملائمت آمیز ڈانٹ سے بولی۔

"کیوں خود کو اس طرح گراتی ہو۔ تم تو نظروں سے بھی گر چکی ہو..... اب بھلا تمہارے پیروں پر گرنے کی کیا اہمیت ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر فوزیہ کے لبوں پر کڑوے کسیلے الفاظ در آئے۔

سدھوراں نے بھیگی ہوئی نگاہوں سے ڈاکٹر فوزیہ کی طرف دیکھا۔ تو ڈاکٹر فوزیہ کو سدھوراں کی نمناک آنکھوں سے مجبوری کے آنسو بہتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

"ڈاکٹرنی صاحبہ..... ! مجھے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ میں اس قابل ہوں کہ اب ساری زندگی لوگوں کی ٹھوکروں میں رہوں۔ مگر..... میں اپنے بچے پر ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ اس معصوم اور گریب کا کیا قصور....." اتنا کہہ کر ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

صحرائی لٹیرے سائیں بخش کے قافلے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کے بعد خاطر خواہ مال لوٹ کر اپنے صحرائی ڈیرے پر پہنچے۔ ان کا صحرائی ڈیرا ریگزار کے بعید ترین گوشے میں تھا جہاں راجستھان کے صحرا کی حدود ملتی تھیں۔ یہ ان کی آخری کارروائی تھی۔ چار دن مسلسل ان صحرائی لٹیروں نے آس پاس کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر

رکھا تھا۔ کہیں سے انہیں چاندی سونے کے زیور ہاتھ لگے تھے تو کہیں سے مال و اسباب کی صورت میں خوبصورت اور جوان عورتیں اور لڑکیاں۔ جنہیں ان لوگوں نے ایک ویران اور اجڑی بستی کے ایک بڑے سے گوپے میں قید کر رکھا تھا۔

مسلسل تین چار دنوں تک لوٹ مار کرنے کے بعد آخری بار سائیں کے قافلے کو لوٹا گیا تھا۔ تمام مال و اسباب سمیٹ کر اپنے اصل ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔

لٹیروں کا یہ گروہ پیشہ ور نہ تھا۔ یہ بھوک اور افلاس کے مارے یا کام سے جی چرانے والے اور آسان راستے کے ذریعے مال حرام کھانے والے افراد کا گروہ تھا۔ پہلے یہ لوگ تین تھے۔ جمعہ خان، پوپٹ اور خیمسو..... تینوں کا کام چوری چکاری کرنا تھا بالخصوص صحرائی تھر میں تحقیقاتی سروے یا ٹور پر آئی ہوئی ٹیموں کے افراد یا شہر جانے والے قافلوں کو لوٹا کرتے تھے۔

سائیں بخش کے قافلے میں انہیں یوں تو مال و اسباب ہاتھ نہ لگا تھا البتہ دو جوان اور خوبصورت چھوکریاں ان کے ہاتھ ضرور لگی تھیں۔ ان میں ایک سکھیو کی بیٹی میراں تھی اور دوسری مٹھل ہاری کی بیٹی ملوکاں تھی، جو سارنگ کی بہن تھی۔ ان دونوں کے علاوہ جمعہ خان، پوپٹ اور خیمسو کے ہمراہ لگ بھگ گیارہ جوان عورتیں اور صحرائی لڑکیاں تھیں۔ ان سب کو ایک ایک چھولداری میں قید کر دیا گیا تھا اور ان پر سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ جمعہ خان، پوپٹ، اور خیمسو تقریباً پچپن لٹیروں کے گروہ کی "کمانڈ" کرتے تھے۔ ان کا صحرائی ڈیرا گاؤں گوٹھوں کی آبادی سے بہت دور واقع تھا۔ اسی لئے یہ لوگ بڑی آزادی سے یہاں ہلا گلا کرتے تھے۔ باقاعدہ ایک جشن کا سا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔

اس وقت بھی یہ لوگ فتح کے نشے میں چور محفل سجائے ہوئے تھے۔ ایک جگہ الاؤ روشن تھا جس پر صحرائی خرگوش اور بھٹ تیتر بھونے جا رہے تھے۔ یہ لوگ آپس میں ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔

ادھر بڑی سی چھولداری میں جن گیارہ بدنصیب عورتوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا، وہ گھٹنوں میں سر دیئے اپنے نصیبوں کو رو رہی تھیں۔ باہر الاؤ کے گرد صحرائی لٹیروں کا بے ہنگم شور ان کی سماعتوں کو چیرے دے رہا تھا۔ ملوکاں اور میراں آپس میں جڑی بیٹھی تھیں اور دیگر عورتوں کی طرح خوف زدہ انداز میں سسکیاں لے رہی تھیں..... ساتھ ہی ان دونوں کے دلوں میں یہاں سے بھاگ نکلنے کی جرأت خیزی بھی جنم لے رہی تھی۔ اس جرأت انگیزی کا سبب ان کے ہاتھوں پیروں کی آزادی تھی۔ یہ لوگ سرکنڈوں کی اس چھولداری کے اندر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزاد تھیں جبکہ باہر پہرہ تھا۔ صحرائی لٹیروں کو شاید اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا، جو کسی حد تک درست بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ڈری سہمی ہرنیاں بھلا یہاں سے بھاگ کر کہاں جاسکتی ہیں لیکن ملوکاں اور میراں نے اب رونا دھونا چھوڑ کر یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

ان دونوں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا تھا کہ آج رات ان پر قیامت ٹوٹنے سے پہلے یہاں سے بھاگ نکلیں گی یا پھر اپنی چوڑیاں توڑ کر کھالیں گی۔ ان دونوں نے سرسری طور پر آس پاس کا جائزہ لیا۔ دیگر عورتوں نے بھی اب رونا دھونا چھوڑ کر شاید خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے کونے کھدروں میں دبکی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ملوکاں اور میراں اپنی جگہ سے اٹھیں اور دروازے کے قریب آئیں۔ دروازہ بند تھا بلکہ دروازہ کیا تھا ایک چھابڑ سا چوکھٹ میں پھنس دیا گیا تھا، جس کے روزنوں سے باہر تاریک صحرا میں جلتے الاؤ کی تیز روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ملوکاں نے جھری سے آنکھ لگا دی۔ اسے سارے لٹیرے الاؤ کے گرد شراب کے نشے میں دھینگا مشتی کرتے نظر آئے۔ دو افراد جنہوں نے لمبی نال والی بندوقیں تھام رکھی تھیں، وہ بھی اپنے حصے کی شراب وہیں کھڑے کھڑے نوش کر رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ وہ نام کو پہرہ داری کر رہے تھے۔ اچانک ملوکاں کی نگاہ قریب ہی بندھے ہوئے اونٹوں پر پڑی۔ وہ کوئی پانچ چھ کے قریب تھے۔ ان پر کجاوے بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک خیال کے تحت ملوکاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ہلکی سی سرگوشی میں میراں کو اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ کسی نے درست کہا ہے کہ جب جان پر بن آتی ہے تو گیدڑ بھی شیر بن جاتا ہے اور بلی بھی کتے پر جھپٹ پڑتی ہے لہٰذا دونوں نے ایک منصوبے پر صاد کیا اور پھر اگلے ہی لمحے ملوکاں نے جھری کے قریب اپنا منہ کر کے پہرے دار کو آواز دیتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔ حسب توقع پہرہ دار جھومتا جھومتا چھابڑے کے قریب آیا۔

''در کھول ..... مجھے ضرورت سے باہر جانا ہے۔'' ملوکاں نے معصومیت سے کہا تو پہرے دار کے چہرے پر ایک شیطانی چمک لہرائی۔ اس نے جھٹ سے چھابڑ کا دروازہ ہٹا دیا اور ملوکاں اور میراں کے چہروں کو گھورنے لگا۔ پھر اپنی مسرت کو دباتے ہوئے بولا۔

''کیا تم دونوں جاؤ گی؟''

ملوکاں اور میراں نے ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''مسکراہٹ'' ان کے منصوبے کا حصہ تھی۔ شراب کے نشے میں مدہوش صحرائی لٹیرا جھوم اٹھا۔ اس نے پہلے

ایک نظر قریب سر دھنتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور قدرے تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ پھر جب وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک ملوکاں نے اسے روک کر ایک ادا سے پوچھا۔ ''کدھر جا رہے ہو؟''

''اپڑیں ساتھی کو بھی تو بتا دوں۔'' اس نے دبی دبی مسرت سے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے..... کیا تم اکیلے ہم دونوں کی نگرانی نہیں کر سکتے۔'' ملوکاں نے چالاکی اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس سے کہا۔

وہ سینہ پھلا کر بولا۔ ''ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... چلو آؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے چھابڑ ہٹایا۔ ملوکاں اور میراں باہر نکلیں۔ وہ لٹیرا ان دونوں کو سرکنڈوں کی آڑ لیتا ہوا عقب میں لے آیا۔ ملوکاں اور میراں یہاں رک گئیں اور شرمانے کے انداز میں لٹیرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''تم اپنا منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' ملوکاں نے شرمانے کی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے کہا اور اس صحرائی لٹیرے نے ان دونوں کو مسکرا کر دیکھا پھر اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

ملوکاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... میراں کا ہاتھ پکڑا اور اونٹوں کی کجاوری کے درمیان دبک کر بیٹھ گئیں اور اوٹ سے لٹیرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ادی ملوکاں.....! یہ کم بخت غصے میں آ کر ہمیں نقصان نہ پہنچا دے۔'' میراں نے متوحش لہجے میں ملوکاں کے کان میں سرگوشی کی۔

''نہیں..... یہ نشے میں ہے۔ ابھی خود اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔'' ملوکاں نے جواباً اسے تسلی دی۔ میراں کی نسبت ملوکاں فطرتاً بہادر لڑکی تھی اور ذہین بھی..... بچپن میں بہت شرارتی ہوتی تھی۔ ملوکاں اور میراں کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا۔ اچانک صحرائی لٹیرے نے مڑ کر دیکھا۔ ملوکاں اور میراں کو غائب پا کر وہ اپنی آنکھیں بار بار مسل کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند ثانیے ہکا بکا کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح اپنا سر ہلایا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھ لیا تھا یا اسے وہم ہوا ہو۔ پھر وہ جھومتا ہوا دوبارہ سرکنڈوں کی چھولداری کی طرف چل دیا۔

''چلو میراں..... بھاگ چلو!'' ملوکاں نے میراں کا بازو پکڑتے ہوئے جوش سے مرتعش لہجے میں کہا تو میراں بولی۔

''ملوکاں.....! یہ اونٹ؟ کیا ہم ایک اونٹ پر نہیں فرار ہو سکتے؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''نہیں میرو......! اس طرح یہ سارے شیطان ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔'' ملوکاں نے کہا۔

''لیکن ملوکاں...... وہ باقی لڑکیاں اور عورتیں......'' میراں نے دکھ سے کہا۔

''ان کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے...... چلو......'' ملوکاں بولی۔

وہ دونوں چاند کی مدھم طلسماتی روشنی میں صحرا کی تاریک وسعتوں میں نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئیں۔ الاؤ کے گرد صحرائی لٹیروں کا طوفانِ بدتمیزی عروج پر تھا۔

☆======☆======☆

سارنگ کی آنکھ کھلی تو وہ قدرے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے محسوس کیے تھے۔ وہ ایک جھونپڑی کے اندر تھا۔ اس کے قریب ایک لمبوترے چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔

''کون ہو تم...... کیا نام ہے تمہارا؟'' اس لمبوترے چہرے والے شخص نے پُراسرار لہجے میں پوچھا۔

''سارنگ ہے میرا نام۔'' اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ سارنگ کو یہ شخص اس دھرتی کا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس شخص نے اسے جی بھر کر پانی پلایا۔

''زیادہ نہیں پی...... الٹی آ جاوے گی...... کچھ کھائے گا بھی؟'' اس پُراسرار شخص نے پوچھا۔

سارنگ اب اس کو رحمت کا فرشتہ سمجھنے لگا تھا، بولا۔ ''سائیں تمہاری بڑی مہربانی...... میرے ساتھ ایک عورت اور دو معصوم بچے بھی ہیں...... ادھر خیمے کے اندر...... انہوں نے بھی کچھ نہیں کھایا پیا۔''

سارنگ کی بات سن کر لمبوترے چہرے والے شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک عُود کر آنے والی پُراسرار چمک سارنگ محسوس نہیں کر سکا تھا۔

''چلو آؤ میرے ساتھ...... اونٹ لے چلتے ہیں۔ ان کو بھی ادھر ہی لے آتے ہیں۔'' اس شخص نے کہا اور سارنگ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا اور ممنون نظروں سے اس فرشتہ صفت انسان کو دیکھنے لگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

قصہ کوتاہ ذرا دیر بعد دونوں اونٹ کے کجاوے میں سوار ہو کر اللہ وسائی کے اجڑے خیمے کے قریب پہنچے۔ اپنے آرام دہ خیمے سے نکلتے وقت لمبوترے چہرے والے نے پانی کی بوتل اٹھالی تھی۔ اونٹ کو آواز دے کر نیچے بٹھایا پھر یہ دونوں اتر کر اندر خیمے میں آئے۔ اللہ وسائی سارنگ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر قدرے چونکی مگر جب اس شخص نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل اللہ وسائی کی طرف بڑھائی تو اس نے جھٹ سے بوتل اس کے ہاتھوں سے پکڑ کر منہ سے لگالی۔ پھر فریدو کو بھی بہت سا پانی پلایا۔ وہ دونوں اب اس مہربان شخص کو احسان مند نظروں سے تکنے لگے۔

وہ شخص ملائمت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم سب چلو میرے ساتھ...... خوب پیٹ بھر کر روٹی کھاؤ اور جدھر کہو گے، میں تم لوگوں کو چھوڑ دوں گا۔'' سارنگ اور اللہ وسائی ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے تو وہ پھر بولا۔ ''گھبراؤ نہیں میں سرحد پار کا ایک مسافر ہوں...... یہاں سے گزر رہا تھا۔ کھجور کی گٹھلیوں کا کاروبار کرتا ہوں، یہاں سے حیدرآباد جا رہا تھا پر یہاں لوگوں کو بھوک پیاس سے مرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا تب میں ادھر ہی رک گیا۔ کوئی بھولا بھٹکا مل جاتا ہے تو اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔''

اس اجنبی کی باتوں سے سارنگ اور اللہ وسائی بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد وہ اجنبی انہیں اونٹ پر سوار کروا کر اپنے آرام دہ خیمے میں لے آیا۔ وہاں اس نے ابلے ہوئے چاولوں اور دال بھات سے ان کی خوب تواضع کی...... کھا پی کر یہ لوگ تازہ دم ہو گئے۔ شکم سیری ہوئی تو دماغ نے سوچنا شروع کر دیا اور جانے کیوں پہلی بار اللہ وسائی اس اجنبی کو دیکھ کر بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔ اس نے اکثر اسے اپنی طرف عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے پایا تھا۔ اس کے لمبوترے چہرے پر چندھی چندھی آنکھوں کی تپش اللہ وسائی کو اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوتی تھی۔ مگر پھر جلد ہی اس شخص نے ...... ''دھی رانڑیں...... دھی رانڑیں'' کہہ کر جب اللہ وسائی کو پکارا تو اللہ وسائی کو خود اپنے آپ پر شرمندگی ہونے لگی کہ اس نے بلاوجہ ایک فرشتہ صفت انسان پر شبہ کیا۔ اس شخص نے اپنا نام گاتریا بتایا تھا۔

یہ عجیب نام سن کر سارنگ اور اللہ وسائی کو حیرت تو ہوئی مگر پھر گاتریا کی سرحد پار رہائش پر وہ چپ ہو رہے۔ گاتریا کا خیمہ نہ صرف خاصا کشادہ تھا بلکہ آرام دہ بھی تھا اور بنیادی ضروریات سے بھی مالا مال تھا۔ سارنگ کو حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے کہ اس فلاکت زدہ ویرانے میں پڑا ہے۔ آخر کب تک اس کا راشن پانی چلے گا۔ سارنگ نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ وہ اس شخص کو یہاں سے فوری نکل جانے کے لیے کہے گا۔ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پاس اپنا اونٹ بھی ہے، جس پر ''کجاوہ'' بھی بنا ہوا تھا جس کے اندر آرام سے آگے پیچھے چار افراد سوار ہو سکتے تھے۔ اچانک ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ یہ شاید شکم سیری کا اثر تھا کہ سارنگ اللہ وسائی اور نو سالہ فریدو اپنی اپنی جگہ پر بے سدھ ہو کر لڑھک گئے۔

گاتریا ذرا فاصلے پر میلی چیکٹ رلی پر بیٹھا ان کے بے سدھ پڑے جسموں کو گہری نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے سیاہ رو بدہیئت ہونٹوں پر بڑی عجیب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

☆======☆======☆

سب سے پہلے سارنگ کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی پہلے تو اس کے دماغ میں دھندی چھائی رہی پھر اسے چکر سے آنے لگے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جاگا نہ ہو بلکہ ''ہوش'' میں آ گیا ہو۔ اس نے جلدی سے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دے کر اپنی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کی اور اپنی آنکھوں کے آگے ناچتے ہوئے تارے بھی بھگائے۔ تب اچانک اس پر ایک بھیانک انکشاف ہوا۔ وہ خیمے کے اندر نہیں بلکہ ٹھنڈی ریت پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ یکدم تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پاگلوں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آس پاس ٹھنڈی اور نرم چاندنی کے سوا کچھ نہ تھا۔ رات اپنے آخری پہر کی طرف گامزن تھی۔ سب کچھ غائب تھا۔ گاتریا، اس کا آرام دہ خیمہ، بھابی اللہ وسائی، اس کا بچہ مٹھار، نو سالہ فریدو...... ان سب کو جیسے آسمان نگل گیا تھا یا پھر وہ ریت میں دفن ہو چکے تھے۔

سارنگ پاگل ہو گیا۔ جنونیوں کے سے انداز میں اپنے چاروں طرف دوڑتے ہوئے بھابی اللہ وسائی کو آوازیں دینے لگا۔ مگر اس کی آواز آس پاس کے ریتیلے ٹیلوں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ اب سارنگ کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے دال میں کالا محسوس ہونے لگا۔ وہ پُراسرار ہمدرد شخص گاتریا ایک دھوکے باز اور فریبی انسان تھا، جو کھانے پینے میں بے ہوشی کا سفوف ملا کر انہیں بے ہوش کر کے اپنا ''کام'' دکھا گیا تھا یعنی بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سارنگ نے سوچا اور پھر جیسے اس کے دماغ میں پریشانی کے ساتھ ساتھ غیظ کا آتش فشاں بھی پکنے لگا۔ اس نے غصے اور پریشانی کو ایک طرف رکھا پھر غور سے موجودہ حالات کی سنگینی کو کم کرنے کی غرض سے اس نے باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس کے لیے اس نے فوراً زمین پر نگاہ دوڑائی اور مدھم چاندنی میں جلد ہی اسے ریت پر اونٹ کے

بڑے بڑے پیالہ نما پیروں کے نشانات نظر آ گئے۔ جو عقب میں دور ریتیلے ٹیلوں کے درمیان سے گزر کر گم ہو رہے تھے۔ سارنگ ایک بات کا تو اب خوب اندازہ لگا چکا تھا کہ اگرچہ یہ جگہ وہی تھی جدھر گاتریا کا خیمہ تھا۔ مگر اب وہ خبیث شیطان اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اور بھابی اللہ وسائی کے علاوہ ان کے بچے مٹھار اور فریدو کو بھی یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔

سارنگ نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ وہ جلدی سے ریت پر گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ نشانات بتدریج واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اسی لئے اب سارنگ اپنی سی مقدور بھر کوشش کے سہارے تیز تیز ریت پر چلا جا رہا تھا۔ وہ پُرعزم تھا، ایک لمحہ بھی تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہ نشانات معدوم ہو گئے تو وہ ساری عمر مکار گاتریا کو نہیں تلاش کر پائے گا۔ اسے اپنی بھابی اللہ وسائی اور اس کے بچے مٹھار کی فکر لاحق ہونے لگی۔ فریدو کی طرف سے بھی وہ فکر مند تھا۔ نجانے ان تینوں معصوموں کے ساتھ اس دھوکے باز گاتریا نے کیا سلوک کیا ہو؟ آخر اس کا ان تینوں کو یرغمال بنانے کا کیا مقصد تھا؟ گاتریا درحقیقت کون تھا؟ ایسے ہی پریشان کن اور سوالیہ گمان آمیز خدشات سے سارنگ کو اپنا دماغ شل ہوتا محسوس ہونے لگا۔ وہ تازہ دم تھا اور ریت پر اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ اگر دھوکے باز گاتریا بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو اپنے ساتھ سرحد پار لے گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ بار بار سارنگ کی آنکھوں کے سامنے اپنی بھابی اور فریدہ کا معصوم اور روتا ہوا چہرہ ابھر رہا تھا۔

سارنگ انہیں یاد کرتا تو اس کے وجود میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتیں جو اسے آگے قدم بڑھانے پر مہمیز کر رہی تھیں۔

سارنگ متواتر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ رگوں میں خون پارے کی مثل دوڑ رہا تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور فریبی گاتریا کی تصور ہی تصور میں گردن مروڑے جا رہا تھا۔ سارنگ پیروں کے نشانوں کو گم نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی شدید خواہش تھی کہ صبح سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے وہ اس مکار گاتریا کو پکڑ لے کیونکہ اگر صبح ہو گئی اور سلگتا سورج ریتیلے ٹیلوں کی اوٹ سے بلند ہوا تو گرم لو کے تیز چلنے والے جھکڑوں سے ریت پر بنے اونٹ کے پیروں کے نشانات معدوم ہوتے چلے جائیں گے۔ سارنگ اپنے شکستہ وجود کی پوری طاقت صرف کئے ریت پر چلا جا رہا تھا۔ اس کے اندر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طوفانی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل و دماغ وسوسوں کی جلن سے شل ہو رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کے دل میں ایک ہی بات ابھر رہی تھی۔

اگر بھابی اللہ وسائی نہ ملی تو کیا ہوگا؟ بدبخت گاتریا نجانے اس کے ساتھ کیا حشر کرے گا......اور......اور فریدو......ننھا منٹھار......وہ بے چارے کس حال میں ہوں گے؟ پتہ نہیں یہ مردود گاتریا کون تھا؟ اور کس مقصد کے لیے اللہ وسائی اور فریدو کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ جانے کہاں لے گیا تھا؟ انہی پریشان کن خیالات کی کشاکش کے ساتھ چلتا ہوا وہ بہت دور نکل آیا۔ اب سورج بھی سوا نیزے پر پہنچ چکا تھا۔ پیاس سے ایک بار پھر حلق سوکھنے لگا۔ بادِ سموم کے گرم گرم تھپیڑے چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے۔ پیروں کے نیچے ریت تپنے لگی تھی۔ مایوسی اور دکھ کے جان لیوا احساس نے سارنگ کو ادھ موا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ دوڑ کر اس مردود گاتریا کو پکڑ لے۔

حدِ نگاہ تک ریگ زار پھیلا ہوا تھا۔ وسیع و عریض، بے انت، بے کنار اور بے ساحل کے سمندر کی طرح......بیکراں اور لامحدود......تپتا جلتا سلگتا ہوا، آگ برساتا ہوا ریگستان۔ سارنگ کے پاؤں بھی اب لڑکھڑانے لگے تھے۔ وہ بھوک، پیاس اور سورج کی تپش سے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ پھر اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بے سدھ ہو کر گرم تپتی ریت پر منہ کے بل گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

☆======☆======☆

سدھوراں کو بلک بلک کر روتے دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ عجیب تذبذب اور مخمصے کا شکار ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دکھ بھری کہانی سنے یا اسے تسلی دے۔ مگر پہلے اسے حوصلہ دینا ضروری تھا۔ یہ سوچ کر ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے ازراہ تشفی کہا۔ ''دیکھو سدھوراں......اس طرح رونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیا تم مجھے مختصراً اپنے بارے میں بتا سکتی ہو۔ پھر میں تمہاری مدد کرنے کی سوچوں گی۔''

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر سدھوراں ایک دم اپنا رونا دھونا بھول گئی۔ وہ ڈاکٹر فوزیہ کے دونوں شانوں کو تھامتے ہوئے غیر یقینی خوشی سے بولی۔ ''کک......کیا......ڈاکٹرنی صاحبہ! تم میری مدد کرو گی۔'' خوشی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''ہاں......! اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا آپریشن نہ کروں......تو بے فکر ہو جاؤ......میں یہ نہیں کروں گی لیکن اس کے لیے ہمیں تھوڑا ڈرامہ کرنا ہوگا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔''

ڈاکٹر فوزیہ نے حوصلہ افزا لہجے میں سدھوراں سے کہا تو سدھوراں نے جلدی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر فوزیہ نے پہلے اچھی طرح سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ ڈرامے کا آغاز کرنے سے پہلے وہ اچھی طرح اس بات کو تسلی کر لینا چاہتی تھی کہ باہر سے اندر کسی کے جھانکنے کی گنجائش تو نہیں۔ اگر ہے بھی تو ایسے چور روزنوں کو پُر کر دیا جائے مگر ایسا روزن کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ کھڑکیوں پر پرانی طرز کے گرد بیز پردے پڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر فوزیہ نے سدھوراں کو سرگوشی والے لہجے میں کچھ سمجھایا پھر اس کے بعد اچانک سدھوراں نے ڈرامے کا آغاز کرتے ہوئے زور زور سے کراہنا شروع کر دیا۔ جیسے شدید درد کا شکار ہو رہی ہو۔

اس ڈرامے میں مزید حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سدھوراں کو مسہری پر لٹا دیا گیا تھا اور ساتھ ہی ان کے آس پاس میڈیکل آلات پھیلا دیئے گئے تھے۔ گلوکوز کی ایک ڈرپ بھی لگا دی تھی۔

''ہاں......سدھوراں......اب تم نے اس وڈیرے زادے جہاں داد کو یہی بتانا ہے کہ میں نے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا دی ہے سمجھی......'' ڈاکٹر فوزیہ نے اسے ہدایت دی تو سدھوراں نے ممنونیت بھری نگاہوں سے ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا البتہ موسی بے چاری سخت گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی اسے شاید یہ خوف ستا رہا تھا کہ اگر اس ڈرامے کا ''ڈراپ سین'' ہو گیا تو یہ ضدی اور ہٹ دھرم وڈیرا ان کا برا حشر کرے گا۔

''اچھا تو سدھوراں......اب تم مختصراً اپنی کتھا سناؤ۔ یہ آخر سارا معاملہ کیا ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے پوچھا تو سدھوراں نے چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! میں ایک غریب ہاری کی بیٹی ہوں اور اپنے ہی جیسے ایک غریب ہاری کے بیٹے سانول سے پیار کرتی تھی۔ ہمارے ماں پیو بھی ہماری شادی کرنا چاہتے تھے مگر ہمارے پیار کے بیچ جہاں داد کالے بیری کی طرح آ کودا۔ وہ وڈیرے میر منصب کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس نے آتے جاتے میرا رستہ روکنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی کی......مگر پھر ایک دن اس نے مجھے سانول کے ساتھ باتیں کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھ لیا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ میں اس سے کیوں کترا رہی ہوں۔ جہاں داد نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس نے سانول اور اس کے غریب ماں پیو کے خلاف ایک لرزہ خیز چال چلی۔ ہم سب چونکہ وڈیرے میر منصب کی رعایا تھے اور اس کی زمینوں وغیرہ پر کام بھی کرتے تھے، اس لیے اس کے مقروض بھی ہو گئے تھے۔ ہمیں مقروض بنانے میں وڈیرے کے منشی کا بڑا ہاتھ تھا لہٰذا ہمارے ماں پیو بھی وڈیرے کے بیگار ہاری بن گئے تھے لیکن میری وجہ سے گریب سانول کچھ زیادہ ہی وڈیرے کے بیٹے جہاں داد کے ظلم کا نشانہ بنا۔ اس نے نہ صرف سانول کو بلکہ اس کے ماں پیو (ماں باپ) کو بھی اس حویلی کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔ یہ ان کی نجی جیل تھی۔ جو بھی ہاری خاندان وڈیرے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر گوٹھ سے نکلنے کی کوشش کرتا تو وڈیرا جہاں داد ان بدنصیبوں کو اپنی اس نجی جیل میں قید کروا دیتا۔''

سدھوراں یہاں تک بتا کر ذرا سانس لینے رکی۔ ڈاکٹر فوزیہ ایک ٹک اس کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ سدھوراں کے منہ سے یہ بے رحم داستان سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کل کے تعلیم یافتہ مہذب دور میں جو اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکا تھا، ایسا بھی ہوتا ہے۔ انسانوں کو غلام بنانا تو گئے وقتوں اور دورِ جاہلیت کا حصہ تھا۔ وہ حیران تھی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جنگل کے قانون کا راج تھا اور کیا حکومتی حلقے اس سے لاعلم تھے۔ ''اس کے بعد......'' معاً سدھوراں نے پھر بتانا شروع کیا اور ڈاکٹر فوزیہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''جہاں داد نے حسد اور ذاتی انا کی خاطر نہ صرف سانول کے ماں پیو کو بے گناہ اپنے باپ کی نجی جیل میں قید کر دیا بلکہ سانول کو بھی نہیں بخشا۔ ان غریبوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا رہا۔ میں نے ایک دن تڑپ کر جہاں داد کے پاؤں پکڑ لئے اور تب سے میں اس کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے میرے گریب ماں پیو کو بھی قید میں ڈال دیا تھا اور انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ تب سے ہی میری بربادی کی کہانی شروع ہو گئی۔'' اتنا بتا کہ سدھوراں دبی دبی سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ایک افسوس بھری طویل سانس بھری اور پھر اسے ایک بار پھر تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''حوصلہ رکھو...... سدھوراں...... اللہ سائیں بہتر کرے گا۔ اب تم نے خود دیکھ لیا ناں...... اللہ جب آفات نازل کرتا ہے تو وہ سب کے لئے یکساں ہوتی ہیں۔ دیکھ لو آخر یہ حویلی بھی ویران ہو گئی ناں۔''

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر سدھوراں کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور

قدرے تلخی سے بولی۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ......! ان اونچی حویلیوں میں رہنے والوں پر بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کے پاس لمبی لمبی جیپیں ہیں، شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوتے ہیں، یہ لوگ فصلی بٹیروں کی طرح واپس آ جاتے ہیں اور پھر ظلم و ستم کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔''

''اچھا......! سدھوراں آگے بتاؤ پھر کیا ہوا...... سانول کہاں گیا اور تمہارے ماں پیو؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے پوچھا۔

''مون سون بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے جب قحط بڑھنے لگا اور فصلیں سوکھنے لگیں تو لوگ جانے لگے۔ جہاں داد نے میرے کہنے پر میرے ماں پیو کو آزاد کر دیا تھا اور سانول کے ماں پیو کو بھی...... لیکن جہاں داد نے مجھے سانول سے قطع تعلق کرنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ پھر میرے بوڑھے ماں پیو، سانول اور اس کے ماں پیو کو دوبارہ قید خانے میں ڈال دیتا...... بلکہ اس بار تو اس مردود جہاں داد نے مجھے کھلے عام دھمکی دے دی تھی کہ اگر میں نے سانول کا نام بھی لیا تو وہ سانول کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا تھا بس پھر......''

''پھر...... تم...... جہاں داد کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئیں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے کسی قدرے تلخی سے کہا۔ ''تم اتنی کم ہمت نکلیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر تم سانول سے ساری حقیقت کہہ دیتیں تو وہ یقیناً اس کا دوسرا حل ڈھونڈ سکتا تھا۔''

''آپ کو کیا معلوم ڈاکٹرنی صاحبہ......! ہم گریبوں کی ان وڈیروں کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وقت اور حالات کے عین مطابق کیا لیکن میرے کھلونا بننے میں میرا قصور نہیں ہے کیونکہ جہاں داد نے مجھ سے باقاعدہ شادی کرنے کو کہا تھا۔''

''تم بھی بہت بھولی ہو۔ ایک طرف اس کی طاقت کا تمہیں اندازہ ہے اور دوسری طرف تم ایسے ظالم اور سنگ دل انسان کے وعدے پر بھروسہ بھی کرتی ہو۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے سانول کے بارے میں نہیں بتایا، وہ کہاں گیا؟''

ڈاکٹر فوزیہ کے استفسار پر اس کے معصوم سجل چہرے پر آزردگی چھا گئی پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''میری اچانک بے اعتنائی پر وہ دل برداشتہ ہو کر اپنے ماں پیو کو لے کر شہر چلا گیا۔''

''اچھا یہ بتاؤ...... اب جہاں داد تمہیں اس مصیبت سے نجات کیوں دلوانا چاہتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس صورت حال پر تم سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ جیسا کہ عیاش لوگوں کا وتیرہ ہے۔ مطلب نکل جانے کے بعد وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔''

''جہاں داد اپنے باپ یعنی وڈے بھوتار سائیں (میر منصب) سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ وڈا سائیں غصے کا بڑا تیز ہے۔ وہ نسلوں کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتا ہے۔'' سدھوراں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''جہاں داد اپنے باپ کے غصے سے خوف زدہ ہے۔ ویسے یہ بھی سچ ہے کہ جہاں داد مجھ پر بری طرح فریفتہ ہے اور وہ مجھے ساری عمر اپنے پاس رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اپنے اس گھناؤنے فعل کو شرافت کا لبادہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے ایک کارندے سے مجھے شادی کرنے کے لیے کہا۔ یہ صرف دکھاوے کی شادی ہوتی مگر میں نے صاف انکار کر دیا لیکن...... لیکن...... اب...... جہاں داد پھر مجھے اس سے جعلی شادی کرنے کے لیے دباؤ ڈالے گا۔'' سدھوراں نے اتنا کہا تو اس کی سرمگیں آنکھیں میں آنسو امڈ آئے۔

ڈاکٹر فوزیہ اس کی غم ناک داستان سن کر دم بخود رہ گئی۔ پھر اچانک سدھوراں نے ملتجیانہ لہجے میں اپنے ہاتھ جوڑ کر قدرے روتے ہوئے اس سے کہا۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ......! مجھ پر ایک احسان کرو۔ مجھے کوئی ایسا ٹیکا لگا دو کہ میں مر جاؤں۔ مجھ میں اب ایسی زہر آلود زندگی گزارنے کا مزید حوصلہ نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔

☆======☆======☆

دور مشرقی ٹیلوں میں پو پھٹ رہی تھی۔

ملوکاں اور میراں صحرائی لٹیروں کے شیطانی پنجوں سے نکل کر گرتی پڑتی بہت دور نکل آئی تھیں اور جب رات آخری پہر میں داخل ہونے لگی تو دونوں تھکن اور پیاس کے باعث نڈھال ہو کر ریت پر ہی ڈھیر ہو گئیں۔ سب سے پہلے ملوکاں کی آنکھ کھلی۔ بیدار ہوتے ہی وہ لرز اٹھی۔ اس کے ارد گرد لاتعداد گدھ پھدکتے پھر رہے تھے۔ دو تین تو اس کے اوپر بھی چڑھ آئے تھے اور اسے ٹھونگے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملوکاں کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ اس کے اوپر سے گدھ اپنے غلیظ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑے...... ملوکاں یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے حواس بحال کیے پھر اچانک اس کی نظر قریب ہی ریت پر اوندھی پڑی میراں پر پڑی۔ اس کے بے سدھ وجود کے آس پاس بھی گدھ منڈلا رہے تھے۔ وہ شاید ان دونوں کو مردہ سمجھ کر منڈلا رہے تھے۔ ملوکاں کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیا۔

پاگلوں کی طرح ''ہش ہش'' کرتی دوڑی اور میراں کے ارد گرد سے گدھوں کو بھگانے لگی۔ گدھ بھی ڈھٹائی پر اتر آئے تھے۔ ذرا دور جست مار کر ہٹتے اور پھر قریب آنے کی کوشش کرتے۔ ملوکاں نے جلدی جلدی میراں کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر کرگسوں کے بدمست غول کو دیکھ کر وہ بھی لرز اٹھی۔

''چلو میراں...... بھاگو یہاں سے...... ورنہ یہ منحوس گدھ ہمیں لاشوں میں تبدیل کر دیں گے۔'' ملوکاں نے کہا۔ پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دونوں نے لق و دق صحرا کی وسعتوں میں دوڑ لگا دی۔

کرگسوں کے نرغے سے جان چھڑا کر جب وہ کافی آگے نکل آئیں تو ایک بار پھر بے سدھ ہو کر گر پڑیں۔ مگر اس بار انہوں نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اب وہ دونوں ریت پر بیٹھی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ حدِ نگاہ تک ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ مگر کہیں کہیں ہلکی روئیدگی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چھدری چھدری جھاڑیوں کے درمیان پودے بھی اگے ہوئے تھے۔

دور ریتیلے ٹیلوں سے سورج آتشیں عفریت کی مانند ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے متوحش دلوں میں ابھی تک صحرائی لٹیروں کا خوف جاگزیں تھا، اسی لیے وہ جلد سے جلد یہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھیں۔ ان کی منزل کہاں تھی؟ وہ کب تک اس لق و دق صحرا میں بھوکی پیاسی بھٹکیں گی؟ یہ وہ نہیں جانتی تھیں مگر اس لرزہ خیز حقیقت کا ان دونوں کو بھی بخوبی ادراک تھا کہ اس صحرا میں بھٹک جانے کا مطلب صرف موت تھا...... عبرت ناک موت۔

دہکتے ہوئے ریگستان میں سورج آگ برسا رہا تھا۔

سامنے ایک ٹیلہ نظر آیا، ملوکاں کے دل میں جانے کیا سمائی، اس نے میراں کا ہاتھ پکڑا اور اس ٹیلے کی طرف بڑھی۔ یہاں اسے دراصل ایک چھدری چھدری جھاڑیوں والا نخلستان سا دکھائی دیا تھا، یہ جھلک امید افزا تھی مگر ابھی وہ چند قدم ہی بڑھی ہو گی کہ ٹھٹک کر اسے رکنا پڑا، ٹیلے کی پرلی ڈھلان سے کوئی ابھرتا ہوا دکھائی دیا، وہ کوئی تنومند نوجوان شخص تھا، میراں جانے کیوں خوف زدہ سی ہو گئی اور اسی لہجے میں وہ ملوکاں کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''ملوکاں......! چلو یہاں سے نجانے یہ شخص کون ہے؟''

جواباً ملوکاں نے اسے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''میراں اگر اسی طرح ہم ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی سے ڈرنے لگے تو اس جہنم میں بھوک کے پیاسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں گے، آؤ ادھر چلتے ہیں، سب انسان ایک سے نہیں ہوتے...... آؤ شاباش......!''

وہ آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی۔ اس اجنبی نوجوان نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور وہ بھی انہی کی طرف چلا آرہا تھا۔

قریب پہنچنے پر دونوں رک گئیں، وہ نوجوان بھی تھم گیا، میراں اسے دیکھ کر سہم رہی تھی جبکہ ملوکاں بغور اس نوجوان کو تکے جارہی تھی۔ نوجوان بیس پچیس کے پیٹے میں تھا، تہبند باندھے تھا، اوپر کا جسم برہنہ تھا، وہ خاصا لمبا چوڑا تھا، رنگت سانولی تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن مگر ان میں عجیب قسم کی تلخی کروٹ لے رہی تھی، بال گھنگھریالے تھے، دریائے سندھ کے چوڑے پاٹ کی طرح اس کے بالوں بھرے سینے میں بنی ہوئی پسینے کی لکیریں، کاریزوں کی طرح بہتی نظر آرہی تھیں جیسے بڑے دریا یا نہر سے نکال کر کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔

''کون ہو تم دونوں......؟'' اس نے اچٹتی ہوئی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ملوکاں کو جانے کیوں اس سانولے، بھلے نوجوان کے لہجے کی گرمی تپش دیتی محسوس ہوئی پھر اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے کارواں پر صحرائی لٹیروں نے حملہ کر دیا تھا، ہم دونوں بڑی مشکلوں سے جان بچا کر بھاگی ہیں، کیا تم ہماری مدد کرو گے؟'' ملوکاں کی بات سن کر اس نوجوان کے سانولے اور قدرے موٹے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں تمہاری بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں، میں تو پہلے ہی سے اپنے ماں، پیو کی لاشیں کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہوں۔'' اس نوجوان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سوگواری سی عود کر آئی تھی، وہ خود کلامی کے انداز میں پھر بولا۔ ''اچھا ہی ہوا جو مر گئے وہ دونوں...... اس بے رحم دنیا میں رکھا ہی کیا تھا ان غریبوں کے لئے......'' وہ شدید مایوسی کا شکار نظر آرہا تھا۔ ملوکاں کا دل بے طرح انداز میں دھڑکنے لگا۔ اسے بیک وقت اس سجیلے نوجوان پر ترس بھی آرہا تھا اور غصہ بھی کہ مرد ہو کر وہ اس قدر مایوسی کی باتیں کر رہا تھا پھر اچانک ملوکاں اور میراں دونوں چونکے بغیر نہ رہ سکیں کیونکہ وہ نوجوان اب واپس پلٹ گیا تھا۔

☆======☆======☆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارنگ کو ہوش آیا تو اسے جہنمی تپش کا احساس ہوا جس سے اس کا پورا وجود سلگ اٹھا، سورج کی برساتی ہوئی تمازت الگ وبالِ جان بنی ہوئی تھی اور اس پر مستزاد بادِ سموم کے جھلساتے ہوئے تھپیڑے بھی وبالِ جان بنے ہوئے تھے۔ سارنگ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سوکھے پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اطراف کا جائزہ لینے لگا، حدِ نگاہ تک ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی، وہ اس مردود گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات تلاش کر رہا تھا جو اسے فوراً دکھائی دے گئے، وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا، اسے اب اپنے ٹوٹے وجود میں ایک نئی طاقت محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ اسے بھوک سے زیادہ پیاس نے بے حال کر رکھا تھا مگر وہ محض اپنی قوت ارادی کے سہارے آگے بڑھا چلا جارہا تھا، مکار اور فریبی گاتریا کو جالینے کی آگ اسے جلا رہی تھی اور وہ ہر ممکن کوشش کر کے اس تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر اسے یہ سوچ کر بھی مایوسی ہوتی تھی کہ گاتریا کے پاس اونٹ تھا جو اس ریگستان میں ''صحرائی جہاز'' کی حیثیت رکھتا تھا، جانے وہ اب کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا، اسے بھائی اللہ وسائی اور فریدو کا بھی خیال پریشان کئے دے رہا تھا کہ وہ جانے کس حال میں ہوں گے۔ سارنگ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جارہا تھا۔

سارنگ کو اسی طرح گرتے پڑتے چلتے چلتے شام نے آلیا، وہ کافی آگے نکل آیا تھا، اس کے سر پر مردار خور منحوس گدھ بھی منڈلاتے ہوئے نظر آرہے تھے شاید ان کی بھوکی نظروں نے اپنے شکار کا پیشگی پتہ چلا لیا تھا، ایک دو گدھ تو اپنے غلیظ پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے اس کے سر کے قریب بھی اتر آئے تھے اور اسے چونچ بھی مارنے کی کوشش کی تھی، وہ بے تاب ہو رہے تھے، وہ اس کے مردہ ہو کر گرنے کے بے چینی سے منتظر تھے۔ کرگسوں کے اس بھوکے غول نے سارنگ پر الگ دہشت طاری کر رکھی تھی، سارنگ نے سنا تھا کہ ان مردار خور گدھوں کو فرشتۂ اجل نظر آجایا کرتا ہے، ایک گدھوں پر ہی کیا موقوف خود سارنگ ملک الموت کو اپنی آنکھوں کے سامنے منڈلاتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

اچانک سارنگ کی نظر ذرا دور شمال مغرب کی سمت پڑی، وہ ٹھٹکا لیکن اس کے قدم رکے نہیں تھے بلکہ اس نے کسی آبادی کے آثار دیکھ کر پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے تھے، اسے مذکورہ سمت کسی بستی کے آثار دکھائی دیئے تھے پھر ذرا دیر بعد وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا مگر یہاں پہنچ کر سارنگ کو مایوسی ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک قحط زدہ بستی تھی جہاں ویرانی مسلط تھی، جا بجا مویشیوں کے پنجر بکھرے ہوئے تھے، پھونس کی بنی جھونپڑیوں پر مردار خور گدھوں کے غول منحوس آوازوں میں چیختے چلاتے نظر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آرہے تھے شاید وہ چند ایسے بچے کھچے بدنصیب مکینوں کی ضیافت اڑا رہے تھے جنہیں یا تو بیماری کی وجہ سے اِدھر ہی چھوڑ دیا گیا تھا یا پھر بڑھاپے نے انہیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا باقی کسر اس ہلاکت خیز خشک سالی اور جان لیوا قحط نے پوری کر دی تھی۔ یہ عبرتناک مناظر سارنگ کے لیے نئی بات نہ تھے مگر بہر حال وہ ایک انسان تھا، اس دھرتی کی ارزاں زندگی پر اس کا دل کڑھتا تھا۔ اچانک جب وہ ایک بوسیدہ سی اجڑی جھونپڑی کے قریب سے گزرنے لگا تو اندر سے ایک گدھ ''چک...... چک'' کی آواز نکالتا باہر نکلا، اس کی چونچ میں ایک انسانی آنکھ کا ڈھیلا دبا ہوا تھا، سارنگ کی روح کانپ اٹھی، بے اختیار اس کا جی متلانے لگا اور اسے ابکائیاں آنے لگیں، گدھ نے سارنگ کو دیکھ کر انسانی آنکھ کو جلدی سے نگلا اور اپنے غلیظ پر پھڑپھڑاتا ہوا دوبارہ جھونپڑی کے اندر گھس گیا، سارنگ یہاں زیادہ دیر نہ رکا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا، وہ اب خالی اور ویران جھونپڑیوں کے اندر کچھ کھانے پینے کی شے تلاش کرنے کی لاحاصل سعی بھی کرتا جا رہا تھا مگر سر دست اسے کچھ نہیں ملا۔ تاہم اس اجڑی ویران بستی کو دیکھ کر اسے کچھ امید ہو چلی تھی کہ کم از کم وہ یہاں کسی خالی گھر یا جھونپڑی میں رات گزار سکتا تھا مگر پھر جب اسے فوراً بھابی اللہ وسائی اور اس کے ننھے بچے منٹھار اور فرید کا خیال آیا تو اس نے فوراً یہاں رکنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کچھ دیر کے بغیر چلتے رہنے کے بعد اچانک سارنگ ٹھٹک کر رکا، اسے شام کے پُرہول سناٹے میں ایک آواز سنائی دی تھی، کسی کے بین کرنے کی آواز جیسے کوئی رو رہا ہو۔

☆======☆======☆

دستک کی آواز پر ان دونوں کے ساتھ قریب متوحش سی کھڑی موسی بھی چونکی پھر ڈاکٹر فوزیہ نے جلدی سے قدرے سرگوشیانہ لہجے میں سدھوراں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سدھوراں...... ! ذرا ہمت اور حوصلے سے کام لینا، تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو نا تمہیں کیا ڈرامہ کرنا ہے؟''

''جی ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! میں سمجھ گئی ہوں، آپ بے فکر رہیں۔'' سدھوراں نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور پھر مسہری پر دراز ہو گئی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ابھی اپنے ڈاکٹری آلات سمیٹے نہیں تھے، اس نے قریب کھڑی موسی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ دیا اور خود یونہی سدھوراں کے قریب آ کر اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ ادھر سدھوراں نے ڈاکٹر فوزیہ کی ہدایات کے مطابق ہولے ہولے کراہنا

شروع کر دیا تھا۔ موسی اشارہ پا کر دروازے کی طرف بڑھی اور اسے پورا کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی جہاں داد اندر داخل ہوا، اس کے ہمراہ منشی اور دیگر کارندے بھی اندر آ گئے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! کیا کام ہو گیا......؟'' جہاں داد نے امید بھرے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے پوچھا تو وہ قدرے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

''کام تو میں نے اپنا کر دیا ہے مگر پیشنٹ چونکہ کمزور تھی اس لیے اس کا بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے، اسے فوراً ہمارے میڈیکل کیمپ لے جانا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر جہاں داد بغور مسہری پر نیم بے ہوشی کی حالت میں دراز سدھوراں کو گھورنے لگا۔ ڈاکٹر فوزیہ کن انکھیوں سے جہاں داد کا چہرہ دیکھ رہی تھی، اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر جہاں داد کو ان کے ڈرامے پر ذرا بھی شبہ ہو گیا تو یقیناً یہ وڈیرا زادہ ان سب کے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔

جہاں داد نے ارد گرد بکھرے ہوئے میڈیکل آلات کو دیکھا اور پھر وہ ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر اپنی تیز نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔

''کیا اسے تمہارے میڈیکل کیمپ لے جانا ضروری ہے...... ادھر اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں...... !'' ڈاکٹر فوزیہ نے قطعیت سے کہا اور مزید بولی۔ ''پیشنٹ کی حالت نازک ہو رہی ہے، اسے چوبیس گھنٹے نگرانی کی ضرورت ہے جو یہاں ممکن نہیں۔'' ڈاکٹر فوزیہ کی بات میں خاصا وزن تھا جسے محسوس کرتے ہوئے جہاں داد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے سکون کا سانس لیا۔ درحقیقت اس نے حالات اور دکھوں کی ماری سدھوراں کی دادرسی کا تہیہ کر لیا تھا اور وہ اس مظلوم لڑکی کی پوری پوری مدد کرنا چاہتی تھی نہ صرف یہ بلکہ وہ اسے جہاں داد خان کے ہولناک پنجوں سے بھی دور لے جانا چاہتی تھی۔

بہر طور ان سب کو ایک بار پھر لینڈ کروزر میں سوار کرایا گیا، ڈاکٹر جواد احمد نے فوزیہ کو دیکھ کر سکھ کا سانس لیا مگر اس کا موڈ از حد بگڑا ہوا تھا، صاف لگتا تھا کہ جتنا عرصہ فوزیہ اندر رہی تھی، باہر اوطاق میں موجود جواد نہ صرف بے چینی میں مبتلا رہا تھا بلکہ اس کی جہاں داد کے کارندوں سے بھی وقتاً فوقتاً تلخ کلامی ہوتی رہی تھی، ان کے ہمراہ منشی جس کا نام خیر بخش تھا، چار مسلح کارندے، سدھوراں سمیت لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں سوار ہو گئے، سدھوراں کو ایک لمبی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سدھوراں، ڈاکٹر فوزیہ کی ہدایت کے مطابق بڑی کامیابی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے سوانگ بھر رہی تھی، سدھوراں دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی اور وہ ڈاکٹر فوزیہ جیسی نیک غیرت لڑکی کو دل سے دعائیں دے رہی تھی، انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جہاں داد جیسے بھیڑیے صفت انسان کی آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی اور اسے ان کے ڈرامے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

لینڈ کروزر کا رخ اب میڈیکل کیمپ کی طرف تھا، ڈاکٹر فوزیہ اگرچہ بڑی کامیابی کے ساتھ ایک نازک صورت حال سے نمٹ آئی تھی مگر اب اسے خاصی پریشان کن چپ لگ گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی تو وہ جہاں داد کی آنکھوں میں دھول جھونک آئی ہے، اس کے بعد کیا ہوگا، کیا وہ اس بگڑے ہوئے وڈیرے زادے سے دشمنی کی متحمل ہو سکتی تھی پھر سب سے بڑی بات ڈاکٹر جواد کی تھی جو اکثر اسے ان پرائے معاملوں میں ٹانگ نہ پھنسانے کی تلقین کرتا رہتا تھا مگر فوزیہ اپنی فطرت سے مجبور تھی، وہ ایک پختہ العزم لڑکی تھی، ایک بار جو عزم کر لیتی پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔

لینڈ کروزر میڈیکل کیمپ کے قریب پہنچ کر رک گئی، یہ لوگ نیچے اترے، سدھوراں کو اسٹریچر کے ذریعے لینڈ کروزر سے کیمپ میں منتقل کیا گیا، وہ ہنوز نیم بے ہوشی کی ایکٹنگ بڑی کامیابی سے کر رہی تھی۔

کیمپ میں پہنچتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے منشی خیر بخش اور اس کے کارندوں کو دکھانے کی غرض سے عملے کو مریضہ کی نازک حالت کے متعلق جلدی جلدی مختلف ہدایتیں دیں، سدھوراں کو کیمپ کے عقبی حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا جو لیبر روم کے طور پر مستعمل تھا، وہاں موسیٰ، سدھو۔اں کے ساتھ موجود تھی۔

''اچھا ڈاکٹرنی صاحبہ......! میں اب چلتا ہوں، میرے دو آدمی ادھر موجود رہیں گے۔'' عیار منشی خیر بخش نے رخصت ہونے کی غرض سے کہا تو اس کی دو کارندوں کی موجود رہنے والی بات۔نے ڈاکٹر فوزیہ کو قدرے متذبذب سا کر دیا مگر وہ منشی کو ایسا کرنے سے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ منشی نے فوراً دوبارہ مخاطب ہوتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ سے پوچھا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ.....! ویسے مریضہ کو کب تک یہاں کیمپ میں رہنا ہوگا؟''

''فی الحال، دو تین دن تو ضروری ہیں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے مختصراً کہا۔ منشی کرتے کی اندرونی جیب سے بڑے نوٹوں کی بڑی سی گڈی نکال کر فوزیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ..... ! یہ چھوٹے سائیں نے انعام کے طور پر مجھے آپ کو دینے کے لیے

دیئے تھے، رکھ لیں۔''

ڈاکٹر فوزیہ نوٹوں کو دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرائی پھر اسی لہجے میں منشی سے بولی۔ ''یہ میں نہیں لوں گی۔ اللہ کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے، اپنے چھوٹے سائیں کو کہنا کہ ان روپوں سے منرل واٹر کی بوتلیں شہر سے منگوا کر غریب لوگوں میں بانٹ دے۔'' اتنا کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ کیمپ کے اس حصے کی طرف بڑھ گئی جدھر سدھوراں کو منتقل کیا گیا تھا۔

منشی خیر بخش چند لمحے ڈاکٹر فوزیہ کو عجیب نظروں سے تکتا رہا پھر اپنی گول عدسوں والی عینک کو درست کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بڑبڑایا۔

''عجیب چھوکری ہے یہ..... اتنے سارے نوٹوں کو ٹھکرا رہی ہے اور کہتی یہ پڑی کہ منرل واٹر کی بوتلیں شہر سے منگوا کر غریب لوگوں تقسیم کر دے ہنہ...... بے وقوف چھوکری..... ! غریبوں کو تو ہم ان کا پسینہ بھی نہیں پینے دیتے، منرل واٹر کا پانی پینے دیں گے ہنہ.....!''

☆======☆======☆

اس عجیب نوجوان کو اچانک واپس ٹیلے طرف پلٹتا دیکھ کر ایک ثانیے کے لئے ملوکاں اور میراں نے قدرے حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے کے بعد بے اختیار اس کے عقب میں قدم بڑھا دیئے۔ اس نوجوان کو معلوم تھا کہ وہ دونوں چھوکریاں اس کے عقب میں چلی آ رہی تھیں، وہ ٹیکری کی دوسری طرف اتر گیا تو ملوکاں اور میراں بھی اس کے عقب میں خاموشی سے چلتی ہوئی ٹیکری کی دوسری جانب اتریں تو انہیں سامنے ایک خیمہ سا تنا ہوا دکھائی دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بری طرح ٹھٹکی تھیں، خیمے کے ذرا قریب ہی تازہ گڑھے کھدے ہوئے تھے اور قریب ہی ریت کا بڑا سا ڈھیر بھی تھا، ایک کھدال بھی پاس ہی رکھی تھی، ملوکاں اور میراں دو تازہ کھدی ہوئی ریتیلی قبروں کو دیکھ کر بری طرح لرز اٹھیں اور دونوں کے قدم ریتیلی ڈھلوان پر لڑکھڑا سے گئے، ملوکاں نے تو خود کو سنبھال لیا مگر میراں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ڈھلوان پر لڑھکتی، چیختی چلاتی تازہ کھدی ہوئی قبر میں جا پڑی، اندر ایک بوڑھے بے کفن شخص کی لاش پڑی تھی۔

میراں کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی، اس پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی، نوجوان چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر ملوکاں بھی گڑھے کے قریب آ گئی اور پھر جلدی سے بیک وقت وہ دونوں گڑھے میں اتر گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اس نوجوان کا چہرہ بدستور سپاٹ اور سرد تھا۔ بہرطور دونوں نے میراں کو باہر نکالا اور اندر خیمے میں لے آئے، خیمے کے اندر کھجور کی چٹائی بچھی ہوئی تھی، ایک طرف چھوٹی سی صراحی دھری تھی، صراحی دیکھ کر ملوکاں کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی اور وہ بے اختیار اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرنے لگی، نیم بے ہوش میراں کو چٹائی پر لٹا دیا گیا تھا، ملوکاں تازہ کھدی ہوئی قبر کے اندر پڑے مردے سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے لیے ایسے دل خراش مناظر نئی بات نہ تھی، وہ سمجھی تھی کہ وہ نوجوان اس کی بے خوفی سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرے گا مگر اس نے ایک نظر بھی اٹھا کر ملوکاں کی طرف نہیں دیکھا تھا، ایک عجیب سی سردمہری اور زہرناک تلخی اس کے چہرے پر کھنڈ کر رہ گئی تھی بلکہ اب تو وہ نوجوان بیزار سا بھی دکھائی دینے لگا تھا تاہم اس نے آگے بڑھ کر وہ صراحی اٹھائی، اس سے تھوڑا پانی ایک مٹی کے آب خورے میں نکال کر میراں کے لرزتے لبوں سے لگا دیا، پانی کی برودت نے حلق میں اُگے ہوئے کانٹوں کی چبھن کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسرے ہی لمحے میراں نے آنکھیں کھول دیں اور یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی، اب وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

ادھر پانی کو دیکھ کر ملوکاں کی پیاس مزید شدت اختیار کرنے لگی اور وہ منتظر نگاہوں سے نوجوان کی طرف دیکھے جا رہی تھی کہ ابھی وہ اسے صراحی دے دے گا مگر جب وہ ملوکاں کو نظر انداز کر کے اٹھنے لگا تو ملوکاں کی فطری سرکشی ابھر آئی، اسے پہلے ہی نظر انداز کئے جانے کا غصہ تھا لہٰذا اس نے جھپٹ کر نوجوان سے صراحی چھیننے کی کوشش کی مگر نوجوان بھی ایک کائیاں تھا، اس نے فوراً صراحی والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور درشت لہجے میں اسے گھرکا۔

''اڑی...... پرے ہٹ...... ! یہ پانی میں نے اپنے لئے رکھا ہے، پہلے ہی تیری اس بے ہوش چھوکری کو بہت سارا پلا چکا ہوں۔''

''اڑے تُو کیسا مرد ہے......؟ چھوکریوں کا پیاس سے برا حال ہو رہا ہے اور تُو......!''

''ھاؤ...... ھاؤ...... میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہارے جیسی چھوکریوں کو......'' وہ نوجوان ملوکاں کی بات کاٹ کر زہرخند لہجے میں بولا تو ملوکاں ایک دم چراغ پا ہو گئی اور اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز نگاہوں سے نوجوان کو گھورتے ہوئے بولی۔

''اڑے او چھوکرا...... ! زبان سنبھال کر بات کر...... لعنت ہے تیری تنگ نظری پر، ہم تیرے کو کیا ایسی ویسی چھوکریاں نظر آتی پڑی ہیں...... کاٹھ تو دیکھ اونٹ بھر کا اور عقل مرغی جیسی...... پانی نہیں دیتا ہے تو نہ دے، بے رحم کہیں کا......''

''بس کر اڑی...... ! زیادہ زبان مت چلا، نہیں تو ایک ایسا تھپڑ رسید کروں گا کہ......''

''ذرا ہاتھ تو لگا کر دیکھ کر میرے کو......'' ملوکاں بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بولی۔ ''مجھے تُو قاتل لگتا ہے...... جانے کن غریب بڈھوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں قبر کھود کر ڈال دی ہیں۔''

ملوکاں کی نشتر زنی پر وہ نوجوان خلاف توقع طیش میں آنے کی بجائے یک دم غمگین سا نظر آنے لگا اور اس نے اپنا چہرہ جھکا دیا پھر اس نے خاموشی سے صراحی ملوکاں کو تھما دی اور اس کے بعد خیمے سے باہر نکل گیا۔ ملوکاں کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''یہ کدھر چلا گیا؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ اس کے قریب بیٹھی میراں جو اب مکمل طور پر ہوش میں آ چکی تھی، ملوکاں کے قریب آتے ہوئے متوحش لہجے میں بولی۔

''ملو...... ! چلو یہاں سے...... مجھے تو اس چھوکرے سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''جو مرد غصہ کرتے ہیں، ان سے خوف کیسا، ایسے لوگ منہ کے کڑوے ضرور ہوتے ہیں مگر دل کے اچھے ہوتے ہیں۔'' ملوکاں نے عجیب گم صم لہجے میں کہا تو میراں بھونچکی رہ گئی۔

ملوکاں نے صراحی منہ سے لگا لی اور چند گھونٹ پانی پی کر صراحی میراں کی صرف بڑھا دی، میراں نے بھی پانی کے چند گھونٹ بھرے پھر اچانک ان کے کانوں میں باہر کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

ملوکاں باہر نکلی تو کیا دیکھتی ہے وہی نوجوان قبر میں ریت ڈال رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہچکیاں لے لے کر روتا جا رہا تھا، ملوکاں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا کہ یہ ضرور اس کے کسی اپنوں کی قبریں ہیں، اسے اب اس نوجوان پر ترس آنے لگا، اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس سے کہا۔ ''اڑے چھوکرا...... ! مرد ہو کر روتا پڑا ہے، یہ دونوں کون تھے تیرے......؟''

اس نوجوان نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو آنسوؤں سے لبریز تھا پھر وہ جیسے اپنے آنسوؤں کو پی کر اس سے غمگین لہجے میں بولا۔ ''اگر تیرے ماں، پیو (ماں، باپ) بھوک اور بیماری سے مر جاتے اور تجھے اس ویرانے میں ان کی خود قبریں کھودنی پڑتیں تو میں دیکھتا کہ تُو روتی یا خوشیاں مناتی۔'' یہ کہہ وہ جلدی جلدی قبر بھرنے لگا۔

ملوکاں کے دل کو ایک گھونسا لگا، اس اثناء میں میراں بھی خیمے نما جھونپڑی سے باہر آ چکی تھی، اس نے بھی نوجوان کی بات سن لی تھی پھر دونوں نے آگے بڑھ کر قبر بھرنے میں اس نوجوان کی مدد کی۔ خاصی دیر بعد دونوں قبریں نرم نرم ریت سے پُر کرنے کے بعد انہوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے قبروں پر فاتحہ پڑھی، اس کے بعد نوجوان سوگوار انداز میں چپ چاپ خیمے کے اندر چلا گیا، ملوکاں اور میراں بھی اس کے ساتھ اندر آ گئیں، وہ نوجوان اب ایک طرف کونے میں سوگوار سے انداز میں گھٹنوں میں سر دیئے رونے لگا، ملوکاں کا دل پسیج رہا تھا پھر وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ کر آہستگی سے بولی۔ ''کیا یہ تیرے ماں، پیو تھے......؟'' جواباً اس نوجوان نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر ملوکاں کی طرف دیکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر مختصراً بولا۔ ''ہاں...... !''

''کیا بیمار تھے دونوں......؟'' ملوکاں بدستور اس کی دلجمعی کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں......!'' اس نے پھر غم آگیں لہجے میں مختصراً کہا۔ ملوکاں کو اس نوجوان پر اب واقعی ترس آنے لگا تھا، وہ اسے اپنے دل کی چور دھڑکنوں میں بستا ہوا محسوس کرنے لگی پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کسی خیال سے پوچھا۔

''تیرا کوئی بال، بچہ بھی تھا؟''

اس کی بات سن کر اچانک وہ نوجوان سر اٹھا کر اس کی طرف تکنے لگا، اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں اب تلخی سی گھل گئی پھر جب وہ بولا تو آنکھوں میں اتری نمی کے ساتھ پُراسراری تلخی بھی اس کے لہجے میں عود کر آئی۔ ''میرا کوئی بال، بچہ نہیں، میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی مگر......!'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو ملوکاں نے جلدی سے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''مگر کیا، آگے بتانا...... تیرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا رے......''

''ہاں تُو صحیح کہتی ہے، میرا غم واقعی ایسا ہے جسے اگر میں نے نہ بتایا تو اس غم کی بھاری سل تلے دب جاؤں گا۔'' پھر اس نے اسرار بھرے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''ادھر گوٹھ میں ایک چھوکری تھی سدھوراں...... میں نے اس سے عشق کیا تھا، وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی۔'' اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ملوکاں کو اپنے اندر چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ بجھ کر رہ گئی اور خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''سدھوراں بے وفا نکلی، وہ شاید اپنی غربت سے تنگ آ گئی تھی، اس پر ایک وڈیرازادہ جہاں داد عاشق ہو گیا تھا، اس کے بعد......!'' یہاں تک بتا کر وہ بھیدوں بھرے انداز میں اپنا جملہ دانستہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو رہا۔ ملوکاں کو اس کا یوں اچانک خاموش ہونا گراں گزرا اور اسے عجیب سی کرید لگ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوبارہ بے چینی سے مستفسر ہوئی۔

''سچ بتانا...... چپ کیوں ہو گیا...... کیا اپنے جی کا بوجھ ہلکا نہیں کرے گا؟''

''تُو بڑی مکار ہے چھوکری......!'' وہ نوجوان اچانک پھیکی مسکراہٹ سے ملوکاں کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا......! پھر سدھوراں نے مجھے چھوڑ دیا اور اس وڈیرے زادے جہاں داد کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔''

''کیا سدھوراں نے اس وڈیرے سے شادی رچالی تھی......؟'' ملوکاں نے اچانک پوچھا۔

''یہی تو دکھ تھا کہ سدھوراں سے اس مردود نے شادی بھی نہیں کی۔'' وہ نوجوان زہریلے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب......؟'' ملوکاں نے پوچھا۔

''ہاں......! اس وڈیرے زادے نے سدھوراں کو اپنی رکھیل بنالیا تھا۔''

''آخر سدھوراں کی ایسی کیا مجبوری تھی جو اس نے تیرے جیسے گبرو مرد کو ٹھکرا دیا؟'' ملوکاں کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو وہ نوجوان ایک اجنبی اپسرا لڑکی کے منہ سے اپنے لئے تعریفی کلمات سن کر ایک لمحے کو الجھی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا، ملوکاں کو اچانک اپنی بات کی گہرائی کا احساس ہوا اور اس نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

''سدھوراں کی مجبوری بالکل سیدھی سادی تھی۔'' دوسرے ہی لمحے نوجوان نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے اور اس کے ماں، پیو کو جہاں داد نے اپنے باپ وڈیرے میر منصب خان کی نجی جیل میں قید کروا دیا تھا، جہاں داد کو جب یہ پتہ چلا کہ سدھوراں مجھ سے پیار کرتی ہے تو اس نے مجھے بھی نہ چھوڑا اور قید میں ڈال دیا، میں اچھی طرح جانتا تھا یہ حقیقت کہ سدھوراں، جہاں داد سے سخت نفرت کرتی ہے مگر وہ اس کے ظلم کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی ہے اور پھر مجھے آزادی مل گئی اور پھر میں نے اپنے ماں، پیو کے ساتھ گوٹھ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔''

''پھر تم کیوں سدھوراں سے نفرت کرنے لگے، اس بے چاری نے تو تمہاری خاطر ہی قربانی دی تھی۔'' ملوکاں نے چور دل کے ساتھ سدھوراں کی حمایت کی اور گہری نگاہوں سے اس نوجوان کے چہرے کو تکنے لگی، شاید ملوکاں اس نوجوان کی سدھوراں سے نفرت کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔

''نہیں، سدھوراں کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا، میں بھی آخر مرد تھا، غریب کی اولاد تھا تو کیا ہوا، اس کی خاطر تو میں ساری دنیا سے ٹکرا جاتا، سدھوراں نے مجھ پر بھروسہ نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر کے میری توہین کی، مجھے اب اس سے شدید نفرت ہوگئی۔" یہ کہہ کر اس نوجوان کا چہرہ نفرت سے جلنے لگا۔

ملوکاں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ تو سدھوراں کی بہر حال غلطی تھی۔ تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے، سدھوراں نے اپنی غربت سے ہار مان لی ہوگی اور اس وڈیرے زادے کی عیش بھری زندگی نے تیرا پیار اس کے دل سے مٹا دیا ہوگا بلکہ میرا تو خیال ہے سدھوراں نے تیرے سے کبھی محبت نہیں کی ورنہ محبت کرنے والوں کے لیے محبت ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔" ملوکاں کے لبوں سے خود بخود سدھوراں کے لیے غیبت بھرے الفاظ نکلتے چلے گئے۔

"تم دونوں کا خیال بالکل غلط ہے۔" اچانک خاموش کھڑی میراں نے پہلی بار لب کشائی کی۔ وہ نوجوان اور ملوکاں چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے، میراں کے چہرے پر عجیب کھوئے کھوئے سے گہرے تاثرات کھنڈ آئے تھے، وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی پھر وہ چند قدم ان کے قریب آئی اور سنجیدگی سے بولی۔ "سدھوراں ایک عورت ہے اور ایک عورت کی ایک نہیں ہزار مجبوریاں ہوتی ہیں، اس کے اندر ایک مرد سے بڑھ کر ایثار کا جذبہ ہوتا ہے، سدھوراں نے اپنی عزت نفس کی قربانی دے کر بہت سے لوگوں کو اس خبیث وڈیرے زادے کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔" میراں اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ اندرونی کیفیات کی آنچ تلے تمتماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس کی مجبور نگاہوں میں اس وقت اپنے محبوب سارنگ کی شبیہ رقصاں تھی، وہ پیش منظر کے بجائے پس منظر میں کھوئی گئی تھی۔

وہ نوجوان اور ملوکاں حیرت سے میراں کا چہرہ تکنے لگے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ نوجوان نفرت سے میراں کو جھٹلاتے ہوئے بولا۔ "عورت کی مجبوریاں ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں، میں نہیں مانتا، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جو عورت ایک بار محبت کرتی ہے، مرتے دم تک اور آخری سانس تک اسے نبھاتی ہے، وہ اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی۔" اس کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا جا رہا تھا۔

ملوکاں نے بڑے مدھم اور گہرے لہجے میں اس نوجوان سے کہا۔ "سب عورتیں سدھوراں جیسی نہیں ہوتیں جو محبت کی قدر نہ جانیں، ادھر دیکھ میری نگاہوں میں تیرے کو کیا دکھائی دیتا ہے رے......"

وہ نوجوان چونک کر ملوکاں کی چھیل ایسی آنکھوں میں دیکھنے لگا، اس کے عجیب لہجے کی حلاوت اور آنکھوں کی تپش نوجوان نے محسوس تو کی مگر وہ ان معنی خیز کیفیات کو جذب نہ کر

سکا اور سر جھٹک کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ملوکاں اسے ایک مردانہ 'ادا' پہ محمول کر کے شوخ انداز میں اسے ٹھوکا مار کر بولی۔ "ارے چھوکرا......! اپڑاں نام تو بتا..."

"سانول......!" نوجوان نے بغیر اس کی طرف دیکھے اپنا نام بتایا۔

☆======☆======☆

رونے کی آواز نسوانی تھی، سرمئی شام کا پُر ہول سناٹا اس پُر ویران اور اجاڑ بستی میں بین کرنے کی یہ آواز اچھے خاصے انسان کو اعصاب گزیدہ کر دینے کے لئے کافی تھی مگر سارنگ نے اللہ کا نام لے کر اپنا دل مضبوط کیا اور اس رونے اور کبھی سسکنے کی آواز پر کان دھرتے ہوئے اس کی سمت کا تعین کرنے لگا۔ یہ آواز اس کی داہنی جانب ایک سالخوردہ سی جھونپڑی سے آ رہی تھی، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا۔ جھونپڑی ویران تھی، وہ حیران بھی ہوا کہ اس ویران بستی میں یہ عورت یہاں کیا کر رہی تھی، ایک عجیب بات ہوئی سارنگ نے جیسے ہی جھونپڑی میں قدم رکھا، رونے کی آواز آنا بند ہوگئی، سارنگ یہی سمجھا کہ جھونپڑی کے کسی کونے میں بیٹھی اس بدنصیب عورت کو شاید کسی کے قدموں کی آواز سنائی دے گئی اس لئے اب وہ بے چاری خوف کے باعث خاموش ہوگئی تھی۔

جھونپڑی خاصی بڑی تھی، سامنے کا حصہ منہدم ہو چکا تھا البتہ سامنے پھونس کی لیپ دار دیوار سلامت تھی جو کمرے نما کوٹھری کی تھی، آواز ادھر سے ہی آ رہی تھی، سارنگ دھڑکتے دل کے ساتھ اکھڑے ہوئے فرش پر پھونس اور تنکوں پر چلتا کوٹھری کی طرف بڑھا، دروازہ غائب تھا صرف چوکھٹ پُر اسرار عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی، سارنگ نے باہر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔

"کون ہے یہاں......؟" اس نے بہ آواز بلند پوچھا مگر جواب ندارد...... اس نے دوبارہ پکارا تب پھر اچانک اسے دوبارہ رونے اور سسکنے کی آواز سنائی دی، وہ بری طرح چونکا اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگا کیونکہ اس بار رونے سسکنے کی یہ آواز کسی اور جگہ سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی، سارنگ کا ماتھا ٹھنکا، وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر واپس پلٹا اور اس منحوس جھونپڑی سے باہر نکل آیا، باہر نکلتے ہی اسے اب چاروں طرف سے رونے چلانے اور حتیٰ کہ قہقہوں کی بھی آوازیں آنے لگی تھیں، سارنگ نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا، وہ اب لاتعلق ہو کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، بار بار اسے ایسا بھی محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے دبے پاؤں چلا آ رہا ہو مگر وہ اسے ویران اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اجاڑ ماحول کی کارستانی جان کر کرکے بغیر چلتا رہا۔ اچانک اس کی نظر سامنے ایک سانڈنی پر پڑی، وہ خاصی صحت مند تھی، اسے دیکھ کر سارنگ کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا پھر ٹھٹک کر رک گیا، سانڈنی کے بالکل قریب ایک بے سدھ وجود پڑا تھا، سارنگ قریب آیا، سانڈنی سوگواری نظروں سے سارنگ کی طرف دیکھنے لگی، سارنگ زمین پر پڑے بے سدھ انسانی وجود کو تکنے لگا، مکھیوں اور دیگر کیڑے، مکوڑوں کے جھرمٹ سے سارنگ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ بے سدھ وجود لاش میں تبدیل ہو چکا تھا، سارنگ کے پاس وقت نہ تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ سانڈنی سوار تھا اور اس کی لاش کو دفنا نہیں سکتا تھا، سارنگ نے جلدی سانڈنی کی پشت کو تھپتھپایا اور اس پر سوار ہو گیا، سارنگ نے اسے ہشکارے دیئے مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، وہ چند لمحے سوچ کر اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر مخصوص انداز میں اسے ٹٹکارنے لگا، سانڈنی نے ناک سے عجیب سی ''آں......ں......ں......'' کی آواز نکالی اور پھر سارنگ کے اشارے پر چلنے لگی، سارنگ خوشی سے کھل اٹھا، وہ اب وہ جلد سے جلد اس منحوس اور اجاڑ بستی سے آسانی سے نکل سکتا تھا، اگلے ہی لمحے سانڈنی ہوا سے باتیں کرنے لگی، سانڈنی پر ہلکی پھلکی زین بھی کسی ہوئی تھی، سارنگ ذرا ہی دیر بعد بستی سے باہر تھا، اب وہ سانڈنی کو ریت پر گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات پر دوڑائے چلا جا رہا تھا، سارنگ نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ مولائے کریم نے اس کی سن لی تھی اور اس کے سفر کا وسیلہ اس تیز رفتار سانڈنی کی صورت میں عطا کر دیا تھا، اب سارنگ کے دل میں امید پیدا ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اس مکار اور فریبی گاتریا تک جا پہنچے گا، سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی کی پُراسرار بیماری چین بلا کی طرف سے فکر لاحق تھی، اگر اس کا بروقت علاج نہ ہوا تو وہ بے چاری ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔ ان پریشان کن خیالات نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا اور پھر وہ رکا نہیں، اس نے سانڈنی کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دی، وہ دل میں خدا سے یہ دعائیں بھی کرتا چلا جا رہا تھا کہ کوئی صحرائی طوفان نہ اُمڈ پڑے ورنہ گاتریا کے اونٹ کے پیروں کے نشانات معدوم ہو سکتے تھے اور سارنگ جانتا تھا پھر وہ ساری زندگی گاتریا کو تلاش نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ بغیر رکے سانڈنی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ رات ہو گئی، پورے صحرا میں خنک طلسماتی چاندنی پھیل گئی مگر سارنگ بالکل نہیں رکا۔

جب رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوئی تو سارنگ کو کھجور کے درختوں کا ایک نخلستانی سلسلہ نظر آیا، وہ خوشی سے پھول گیا، اس کی بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا، اسے امید تھی

ادھر ہی اسے پانی کا بارانی تالاب بھی نظر آ جائے گا اور ایسا ہی ہوا، وہ جیسے ہی ذرا قریب پہنچا، اسے چند جھکے جھکے کھجوروں کے پیڑوں کے دامن میں ایک تالاب سا دکھائی دے گیا، جس کی شفاف سطح پر کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان سے روشن روشن چاند کا دمکتا مکھڑا بڑا ہی دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔

سارنگ نے فوراً سانڈنی کو روکا اور جلدی سے اتر کر پیٹ کے بل کنارے پر لیٹتے ہوئے اس نے اپنا گرد آلود چہرہ تالاب میں ڈبو دیا، پانی کی برودت چہرے سے ٹکراتے ہی اسے اپنے ریختہ وجود میں ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوا پھر اس نے جی بھر کر پانی پیا پھر ایک کھجور کے نسبتاً کم بلند درخت پر اپنی اجرک کی کانبھ بنا کر اس پر چڑھ گیا اور ایک تازہ کھجوروں کا گچھا اتار لایا، خود بھی کھانے لگا اور سانڈنی کو بھی یہ کھجور کھلائے پھر سارنگ نے تھوڑی دیر آرام کا سوچا، گاتریا کے اونٹ کے نشانات اس تالاب کے قریب سے گزر کر آگے دور تک چلے گئے تھے، سارنگ نے دل ہی دل میں اندازہ لگا لیا تھا کہ گاتریا یہاں اس تالاب کے کنارے کچھ دیر ستانے کے بعد آگے بڑھ گیا تھا، سارنگ نے یونہی تالاب کے کنارے کھڑے کھڑے دور نظریں دوڑائیں تو اسے کچھ کچھ آبادی کے آثار دکھائی دیئے، یہ کوئی نخلستانی گوٹھ تھا، سارنگ نے محسوس کیا کہ وہ اپنی سرزمین سے کافی دور سرحدی علاقے کی طرف نکل آیا تھا تاہم اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ درست منزل کی طرف گامزن تھا، اب اسے اس بات کی پوری امید تھی کہ وہ بہت جلدی اس منحوس گاتریا کو جا لے گا، یہاں خشک سالی اور قحط کا عفریت ابھی نہیں پہنچا تھا۔

سارنگ وہیں تالاب کے مختصر سے رتیلے کراڑے پر لیٹ گیا، تھکا ہوا تو تھا ہی لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی، جانے کتنی دیر وہ سویا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھلی اور وہ بری طرح چونک پڑا۔

☆======☆======☆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''فوزیہ.....! بھئی یہ کیا معاملہ ہے آخر......؟'' منشی خیر بخش کو چلتا کرنے کے بعد ڈاکٹر جواد نے اس سے پوچھا۔ ''مریضہ کی حالت اگر اتنی ہی نازک تھی تو اسے یہ لوگ اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر لے جا سکتے تھے اور..... اور اس کا نومولود بچہ بھی دکھائی نہیں دے رہا، کیا وہ مر گیا......؟'' ڈاکٹر جواد نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر کئی ایک سوال کر ڈالے۔

ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر گہری خاموشی کھنڈ آئی تھی۔ درحقیقت وہ ڈاکٹر جواد کو نہ صرف ساری صورت حال مفصل انداز میں سنانا چاہتی تھی بلکہ وہ سدھواں سے متعلق اس سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتی تھی۔

اس نے پھر ڈاکٹر جواد کو ہولے ہولے سب کچھ گوش گزار کر دیا اور سدھوراں سے متعلق یہ ساری کتھا سننے کے بعد ڈاکٹر جواد خاصی دیر تک ہکا بکا سا رہ گیا پھر ایک طویل سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''فوزیہ......! میں جانتا ہوں تم اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو اور میں تمہاری آنکھوں میں سدھوراں کے لیے ہمدردی اور اس کی مدد کرنے کے بھرپور عزم کی پرچھائیں محسوس کر رہا ہوں لیکن فوزیہ......! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جذبۂ انسانیت سے مغلوب ہو کر پرائی آگ میں کودنے کا انجام کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، اس سے اپنا نشیمن بھی خاکستر ہونے لگتا ہے، جہاں داد جیسے وڈیرے زادوں کی خصلت بڑی خطرناک ہوتی ہے، یہ لوگ معمولی بات کو بھی انا کا مسئلہ بنا لیں تو پھر پیچھا نہیں چھوڑتے ساری زندگی......'' ڈاکٹر جواد نے متحمل اور مدہم سے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر فوزیہ جیسے پہلے ہی سے اس بات کی منتظر تھی لہٰذا فوراً بولی۔ ''جواد......! آخر انسانیت بھی کوئی شے ہوتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے اگر ایک کمزور مجبور انسان مصیبت میں گرفتار ہو اور ہم سے مدد کا خواہاں بھی ہو اور اس کی مدد کرنا ہمارے بس میں بھی ہو تو کیا اس سے منہ موڑ لیا جانا چاہیے؟''

''تم اس کی کیا مدد کر سکتی ہو، وہ ایک وڈیرے زادے کی محبوبہ ہے، وہ اس پر بری

طرح فریفتہ ہے، البتہ تم نے جہاں داد سے یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ تم نے اس کے کہنے کے مطابق سدھوراں کو مصیبت سے نجات دلا دی ہے۔ میں تو اب یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کل کلاں اگر یہ بات اس وڈیرزادے کے سامنے آشکار ہو گئی جس کا مجھے پورا یقین ہے کہ ہو گی تو پھر کیا ہو گا، سدھوراں کا تو جو حشر ہو گا سو ہو گا، جہاں داد تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔'' ڈاکٹر جواد کے لہجے میں تشویش اور چہرے پر لحظہ بہ لحظہ پریشانی عود کرتی چلی آ رہی تھی۔

''کیا تم مجھے اس طرح بے حوصلہ کرنا چاہتے ہو جواد......؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں میں صرف تمہیں آئندہ حالات کی سنگینی سے باخبر کرنا چاہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر جواد نے گہری سانس لے کر کہا پھر مزید بولا۔ ''اور ویسے بھی اب کیا ہو سکتا ہے، تم نے اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے، اب تو آگے کی سوچنا چاہیے۔''

ڈاکٹر جواد کی بات سن کر ڈاکٹر فوزیہ ایک دم کھل اٹھی اور چہک کر بولی۔ ''یہ ہوئی نا مردوں والی بات......''

''اچھا اب تم مجھے مردوں سے مُردوں میں نہ بدل دینا۔'' ڈاکٹر جواد ماحول کی کثافت دور کرنے کی غرض سے بذلہ سنجی سے بولا تو ڈاکٹر فوزیہ کے حنائی لبوں پر محبوبانہ مسکراہٹ عود کر آئی۔

''دیکھو جواد......! میرے دماغ میں آئندہ کا لائحہ عمل ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے دوسرے لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ...... میں سن رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

''میں سدھوراں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گی۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے جیسے دھماکہ کیا اور ڈاکٹر جواد چونک کر اس کا منہ تکنے لگا۔ ''ہاں جواد......! میں نے اس معصوم اور دکھوں کی ماری بے سہارا لڑکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور اپنے گھر اپنی بہن بنا کر رکھوں گی۔''

ڈاکٹر جواد کا حیرت سے منہ کھل گیا اور وہ ایسی نظروں سے ڈاکٹر فوزیہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ ''یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو فوزیہ......؟'' بالآخر اس نے الجھ کر پوچھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مگر تم اسے اپنے ساتھ شہر کیسے لے جاؤ گی، وہ وڈیرا زادہ..... کیا وہ اسے تمہارے ساتھ آسانی سے جانے دے گا......؟"

"ہاں..... میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے، سدھوراں کو اپنے ساتھ لے جانے کی۔"

"مگر فوزی.....! تم اس حالت میں کیسے اسے اپنے ساتھ رکھو گی..... نہیں..... نہیں فوزی.....! تم اتنا بڑا رسک کیسے اٹھا پاؤ گی..... ؟" ڈاکٹر جواد پریشان ہو کر بولا۔

"آگے اللہ مالک ہے، کچھ نہ کچھ سوچ لیا جائے گا، مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔" ڈاکٹر فوزیہ نے بھرپور یقین سے کہا تو ڈاکٹر جواد خاموش سا ہو کر رہ گیا۔ ڈاکٹر فوزیہ اس کی کلاس فیلو اور اچھی ساتھی رہ چکی تھی، اس رعایت سے جواد کو اسے سمجھنے کا کافی موقع ملتا رہا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ ڈاکٹر فوزیہ کی خصوصی طبیعت اور ارادے کی پختگی سے اچھی طرح واقف تھا، وہ ایک دردمند دل رکھنے والی پُرعزم لڑکی تھی مگر ڈاکٹر جواد کو اب اس کی یہ صفات خطرناک محسوس ہونے لگی تھیں اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کو اس ارادے سے باز رکھنا ناممکن اور عبث تھا لہٰذا اس نے سرِدست خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد ڈاکٹر فوزیہ کیمپ کے دوسرے پورشن میں آ گئی جدھر سدھوراں کو رکھا ہوا تھا، اس نے محبت سے سدھوراں کا ہاتھ تھام لیا اور ملائمت سے بولی۔ "سدھوراں.....! تم آج سے میری بہن ہو، دیکھو اب میں تمہیں اپنے ساتھ شہر بلکہ اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں......؟"

ڈاکٹر فوزیہ کے میٹھے اور پُرخلوص لہجے پر سدھوراں کی آنکھوں میں فرطِ عقیدت سے آنسو نکل آئے، وہ جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولی۔ "ڈاکٹرنی صاحبہ.....! میں..... میں..... اس قابل کہاں..... آپ تو بہت..... بہت عظیم ہیں، میں..... میں..... اور اب کیا کہوں....."

"تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں اور ہاں اب تم مجھے ڈاکٹرنی صاحبہ کی بجائے صرف باجی کہو..... سمجھیں۔" ڈاکٹر فوزیہ نے ملائمت سے کہا اور سدھوراں کو گلے سے لگا لیا۔ سدھوراں اب اٹھ بیٹھی تھی پھر معاً اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا گئے اور وہ اسی لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ سے بولی۔

"ڈاکٹر صاحبہ.....! میرا مطلب ہے باجی.....! وہ مردود جہاں داد کیا مجھے آپ کے ساتھ جانے دے گا؟"

"تم اس کی ملکیت نہیں ہو، وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمہیں پہلے کی طرح ایک اور ڈرامہ کرنا ہوگا۔"

"لل..... لیکن باجی.....! آ..... آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں، میری وجہ سے کہیں آپ بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" سدھوراں کے لرزیدہ لہجے میں اچانک تشویش در آئی۔

"کچھ نہیں ہوگا مجھے..... تم تو خود ایک بہادر لڑکی ہو پھر ایسا کیوں سوچتی ہو۔" ڈاکٹر فوزیہ نے اسے تسلی دی۔

سدھوراں نے اس بار بدلے بدلے لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں باجی! یہ بات نہیں..... مجھے تو اب جہاں داد سے سخت نفرت ہو گئی ہے بلکہ میرا تو جی کرتا ہے کہ میں اس درندے کا منہ نوچ لوں۔"

"بس ٹھیک ہے پھر فیصلہ ہو گیا، اب میری بات سنو..... تم نے ایک نیا ڈرامہ کرنا ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ اسے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ سمجھانے لگی۔

☆======☆======☆

یوں سدھوراں کو میڈیکل کیمپ میں رہتے ہوئے اگلا دن بھی گزر گیا، جہاں داد کے دونوں کارندے بدستور کیمپ میں موجود تھے، اس دوران منشی خیر بخش لینڈ کروزر میں وہاں آتا رہتا تھا، آخر اگلے دن اس نے ڈاکٹر فوزیہ سے سدھوراں کو فارغ کرنے کے لیے کہا تو ڈاکٹر فوزیہ نے منصوبے کے مطابق انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سدھوراں کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے، اسے شہر پہنچانے تک ادھر ہی کیمپ میں رہنا ہوگا فی الحال ورنہ اس کی زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر منشی خیر بخش سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ مزید آگے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، اس لیے خاموشی سے واپس لوٹ گیا، اس بار اس کے وہ دونوں کارندے بھی اس کے ساتھ لوٹ گئے۔

ڈاکٹر فوزیہ نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا۔ یہ اسی دن کا ذکر تھا کہ دوپہر کے قریب انہیں ایک ہیلی کاپٹر لینے آ گیا، ڈاکٹر فوزیہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اس کے خیال کے مطابق سدھوراں کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کا یہ بہترین موقع تھا کیونکہ اب تو جہاں داد کے وہ دونوں کارندے بھی واپس لوٹ گئے تھے، راستہ صاف تھا لہٰذا جلدی جلدی کیمپ سمیٹا جانے لگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ڈاکٹر فوزیہ کو دور ایک لینڈ کروزر تیزی سے دوڑتی ہوئی نظر آئی، وہ بری طرح ٹھٹکی اور چونک کر ریت کے بگولوں کو دیکھنے لگی پھر اگلے ہی لمحے لینڈ کروزر ریت کے بادل اڑاتی ان کے بالکل قریب آکر رک گئی، اس کے بعد جو بھاری بھرکم شخص اجرک کاندھوں پر ڈالے بڑے کروفر کے ساتھ نیچے اترا، اسے دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ کو اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا، وہ جہاں داد تھا۔

جہاں داد کے لینڈ کروزر سے اترتے ہی اس کے ساتھ تین چار مسلح کارندے بھی نیچے اتر آئے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! آپ ہماری مریضہ کو فارغ کیوں نہیں کر رہی ہیں...... منشی ہم کو بتا رہا تھا کہ......!'' جہاں داد کا جملہ حلق میں ہی اٹک گیا۔

دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر فوزیہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''جہاں داد صاحب......! آپ میرے ساتھ آئیں...... یہاں باتیں کرنا مناسب نہیں''۔

جہاں داد نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا...... اسے اچانک ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

''دیکھئے جہاں داد صاحب......! یہ معاملہ ایسا نہ تھا کہ باہر سب کے سامنے گفتگو کی جا سکتی۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اسے کیمپ کے اندرونی گوشے میں لے جا کر چالاکی سے کہا۔ یہاں سدھوراں بھی اسٹریچر پر دراز تھی اور پہلے سے سوچے سمجھے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں پٹک رہی تھی اور تکلیف کے مارے کراہ بھی رہی تھی۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! کیا ہوا اسے، یہ تو بھلی چنگی تھی...... ؟'' اچانک جہاں داد سدھوراں کی حالت دیکھ کر قدرے تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''اس کی طبیعت تو اب تک سنبھل ہی نہیں سکی ہے۔ جہاں داد صاحب......!'' ڈاکٹر فوزیہ نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ بہت کمزور تھی مگر آپ کی ضد تھی کہ یہ کام اسی وقت ہو۔ اب خون زیادہ بہنے کی وجہ سے بلڈ پریشر مزید گرتا چلا جا رہا ہے''۔

''تو پھر اب کیا ہوگا......؟''

''گھبرانے کی بات نہیں...... میں اسے شہر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں، وہاں ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر ہے جو ایسے کیس حل کرنے میں ماہر ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحبہ......! میں خود ہی کیوں نا......''

''نہیں......! یہ خطرہ آپ نہ مول لیں تو اچھا ہے، اس سے مریضہ کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے اور پھر یہ کیس بھی میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے، اس لیے میں ہی زیادہ تفصیل دے سکتی ہوں تاکہ اس کا علاج کرنے میں آسانی ہو...... ہمارے پاس ہیلی کاپٹر ہے، ہم چند منٹوں میں شہر پہنچ جائیں گے جبکہ آپ کو گاڑی میں بہت دیر لگے گی۔'' ڈاکٹر فوزیہ کی ٹھوس دلیلوں نے جہاں داد کو رام کر لیا ورنہ وہ یہی تہیہ کر کے آیا تھا کہ سدھوراں کو خود ہی شہر لے جائے گا۔

''اچھا ڈاکٹرنی صاحبہ......! مگر شہر میں، میں آپ کو کہاں تلاش کروں گا...... ؟''

ڈاکٹر فوزیہ نے اُسے ایک بڑے پرائیویٹ میڈیکل سینٹر کا پتہ بتایا جہاں وہ سدھوراں کو داخل کروانا چاہتی تھی۔ جہاں داد نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور ڈاکٹر فوزیہ کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ عندیہ دے گیا تھا کہ وہ جلد ہی مذکورہ میڈیکل سینٹر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس بلا کے ٹلتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے سکھ کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر گئی تھی کہ اس بلا سے کیسے جان چھڑائے گی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اس بات کا بھی شکر ادا کیا تھا کہ جہاں داد نے اس بار اپنے کسی کارندے کو اس کے سر پر مسلط نہیں کیا تھا اور دوسری سب سے اہم اور خوش آئند بات اس نے یہ محسوس کی تھی کہ جہاں داد نے اس سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ، جہاں داد کو جتنا شاطر سمجھ رہی تھی، اس سے کہیں زیادہ وہ بے وقوف نکلا تھا۔

☆======☆======☆

''سانول......!'' ملوکاں نے زیرلب اور بڑی وارفتگی سے یہ نام دہرایا جسے قریب کھڑی میراں نہیں سن سکی البتہ اس نوجوان سانول نے اپنا نام ضرور سن لیا...... اپنا نام سن کر قدرے چونک کر ملوکاں کا چہرہ تکنے لگا...... ملوکاں اسے بڑی مخمور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی پھر اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں جب سانول نے ان سے تفصیلاً ان کے بارے میں پوچھا تو ملوکاں نے اپنی ساری رام کتھا اسے سنا ڈالی۔

''کیا تم دونوں کو پورا یقین ہے کہ تمہارے ماں، پیو بدین ہی کی طرف گئے ہیں؟'' ساری داستان سننے کے بعد سانول نے ان سے پوچھا تو ملوکاں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ اپنے ماں، باپ کے ذکر پر ملوکاں اور میراں دونوں کے چہرے غمگین ہو گئے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر مجھے وہاں کا راستہ آتا ہے...... وہاں میرے رشتے کا ایک ماما اللہ رکھیو رہتا ہے، وہ بے اولاد ہے، کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے، میں بھی اسی طرف جا رہا تھا۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نوجوان کی بات سن کر، دونوں خوشی سے نہال ہوگئیں۔ملوکاں زیادہ خوش تھی کہ یہ بانکا سجیلا نوجوان ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے...... وہ اس کی ہمراہی میں اب تک وارفتگی اور عجیب سا سرور محسوس کرنے لگی تھی۔

بہرطور ان لوگوں نے فی الفور کوچ کرنے کا قصد کیا اور آگے چل پڑے...... خیمے کا مختصر سا سامان سانول نے لپیٹ کر اپنے اوپر لاد لیا تھا۔

خوش قسمتی سے اگلے دن صبح یہ لوگ ایک کارواں سے جا ملے جو ٹنڈو باگو کی طرف جا رہا تھا۔بدین وہاں سے زیادہ دور نہ تھا...... وہاں سے انہیں کوئی بیل گاڑی مل سکتی تھی لہٰذا وہ اس کارواں میں شامل ہوگئے۔یہ قافلہ خاصا منظم تھا، اس میں مال، مویشی بھی تھے اور بیل گاڑیوں کے علاوہ اونٹ بھی۔

ان تینوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔کارواں چلتا رہا اور دو تین روز بعد یہ لوگ ٹنڈو باگو پہنچ گئے اور پھر یہاں سے انہیں ایک لاری مل گئی، وہ اس میں سوار ہوکر بدین کے ایک چھوٹے سے نواحی گوٹھ میں پہنچ گئے، یہی ان کا مطلوبہ گوٹھ تھا، یہاں پہنچ کر سانول کو آسانی سے اپنے ماما اللہ رکھیو کے گھر کا پتہ مل گیا، یہ پتہ ایک چھپر ہوٹل میں چائے پینے کے دوران ایک شخص سے ملا، یہ شخص اس گوٹھ کا دھوبی تھا۔

تھوڑی دیر میں یہ تینوں اس شخص کے ساتھ ایک گارے مٹی والے چھوٹے کچے گھر کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔

''یہ لو بابا...... ! یہی اللہ رکھیو کا گھر ہے، میں چلتا ہوں۔'' اس بھلے مانس آدمی نے سانول سے کہا۔

سانول از راہ تشکر بولا۔''سائیں...... ! تیری وڈی مہربانی۔''

''اڑے بابا! مہربانی کیسی...... اچھا چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر بھلا مانس شخص چلا گیا۔

سانول نے پردے کے طور مستعمل جھولتی بوسیدہ سی رلی کے ٹاٹ کو ہٹا کر دروازے پر دستک دی۔

''اڑے بابا کون ہے...... آجاؤ اندر...... در کھلا ہے۔'' اندر سے ایک کھانستی ہوئی آواز ابھری۔

سانول نے دھیرے سے دروازے کو دھکیلا اور پھر پہلے ملوکاں اور میراں کو اندر داخل ہونے کا راستہ دیا پھر خود بھی اندر چلا گیا۔

سامنے ہی کچے صحن میں ایک عمر رسیدہ شخص کھری چارپائی پر چائے کی پیالی تھامے ہوئے نظر آیا، یہی سانول کا ماما اللہ رکھیو تھا۔عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ماما اللہ رکھیو کی نظریں تیز تھیں۔صحن خاصا بڑا تھا اور چارپائی بھی دروازے سے دور بچھی ہوئی تھی مگر ماما اللہ رکھیو اپنے بھانجے سانول کو فوراً پہچان گیا اور جلدی سے پیالی ایک طرف رکھ کر چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا، دونوں ماما بھانجے بڑی محبت اور گرمجوشی سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔

پھر ماما نے ملوکاں اور میراں کے سر پر بھی باری باری از راہ شفقت ہاتھ دھرا اور سانول سے ان کے بارے میں پوچھا۔سانول نے مختصراً ملوکاں اور میراں کے بارے میں بتایا کہ یہ دونوں اپنے ماں، باپ کی تلاش کر رہی ہیں جو اسی گوٹھ میں آئے ہیں۔

''پٹ...... ! بھا خدا بخش اور ادی نہالاں کدھر ہیں...... وہ تیرے ساتھ نہیں آئے؟''
اچانک ماما نے سانول سے پوچھا تو سانول کا چہرہ سوگوار ہوگیا۔

''ماما...... ! ہاں، پیو تو گزر گئے...... بہت بیمار ہوگئے تھے وہ......'' سانول نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر ماما کو ایک جھٹکا لگا وہ چارپائی پکڑ کر بیٹھ گیا۔بہنوئی اور بہن کی موت کی خبر نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔

سانول نے ماما کے کاندھے پر کپکپاتا ہوا ہاتھ رکھا اور غم سے چور لہجے میں بولا۔''ماما...... ! ہمارے گھر میں جو قیامت ٹوٹی ہے، اس میں تو جوان لوگ قحط کی وجہ سے اپنی جانیں ہار بیٹھے ہیں، بوڑھوں کا کیا حال ہوا ہوگا، تم خود سوچ لو۔''

ذرا دیر کی سوگوار خاموشی کے بعد ماما نے اپنے کاندھے پر دھری میلی چیکٹ اجرک سے اپنے آنسو پونچھے پھر زیر لب دعا پڑھی اور ''حکم اللہ کا'' کا کہا پھر ملوکاں اور میراں سے بولا۔''اڑی دھیو...... ! تم کیوں کھڑی ہو...... آجاؤ بیٹھو ادھر تُو بھی بیٹھ سانول...... ! میں تمہارے لیے مانی ٹکر کا بندوبست کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ قریب ہی بنی ایک چھوٹی سے رسوئی کی طرف بڑھنے لگا۔

ملوکاں نے ایک دم کھڑے ہوکر کہا۔''ماما...... ! تُو کیوں تکلیف کرتا ہے، میں مانی بنا لیتی ہوں۔''

''نا دھیئے نا...... ! تم لوگ پہلے ہی تھکے ٹوٹے ہوئے ہو...... میں خود ہی بنا لیتا ہوں...... بے چاری بھاگی کے گزرنے کے بعد پچھلے دس بارہ سال سے میں خود ہی کھانا بنا رہا ہوں۔''

ماما اللہ رکھیو نے طویل سانس لے کر کہا اور اپنا سر دھنتا ہوا رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا تیرے ماما کا دنیا میں کوئی نہیں ہے ڑے سانول...... یہ اکیلا ہی رہتا ہے اس گھر میں......؟'' ملوکاں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ہاؤ...... مامی بھاگی کو گزرے دس سال بیت گئے ہیں...... بے چارے مارے مامے اللہ رکھیو نے جانے کیوں دوسری شادی بھی نہیں کی، بس اڑیں ہی حال میں مست رہتا ہے۔''

''یہ کرتا کیا ہے...... میرا مطلب ہے اپنی گزر بسر کیسے کرتا ہے......؟'' ملوکاں نے اگلا سوال کیا۔

''رہاکی (کھیت مزدوری) کرتا تھا پہلے تو، اب پتہ نہیں کیا کرتا ہے...... آئے تو پوچھوں گا۔'' سانول نے کہا۔

پھر تھوڑی دیر بعد میراں نے سانول سے پوچھا۔ ''ادا سانول...... ! کیا ہمارے ماں، پیو اسی گوٹھ میں ہوں گے......؟ مجھ سے اڑیں ماں، پیو کی دوری اب برداشت نہیں ہوتی...... پتہ نہیں وہ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے...... تُو نے ہم پر بہت احسان کیا ہے ادا...... ! ایک اور احسان کر دو ہم پر، ہمیں اڑیں ماں، پیو سے ملا دے۔''

''اللہ سائیں کرے گا تیرے ماں، پیو ضرور مل جائیں گے تُو کیوں گھبرائی ہے...... مجھے ادا کہا ہے تو میں اڑاں یہ وعدہ ضرور پورا کروں گا، میں ابھی ماما سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔'' سانول نے اسے تسلی دی۔

اتنے میں ماما اللہ رکھیو ایک بڑی سی ڈلیہ میں چاولوں کی پانچ چھ بڑی بڑی روٹیاں لے کر آ گیا، جس پر دیسی گھی کے تڑکے کے علاوہ ساگ بھی رکھا ہوا تھا پھر ان تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس وقت شام کے سائے سرمئی ہونے لگے تھے اور حبس زدہ ماحول میں ذرا کمی واقع ہونے لگی تھی۔ اس دوران مامانے صحن میں تازہ پانی کا چھڑکاؤ کیا تو کچے صحن کی زمین اور دیواروں سے سوندھی مٹی کی مہک سی اٹھنے لگی۔

''ماما...... ! اب سب سے پہلا کام ان دونوں چھوکریوں کے ماں، پیو کو تلاش کرنا ہے...... تیرے کو کچھ پتہ ہے ماما کہ تھر سے آئے ہوئے کتنے خاندان ادھر آ کر بسے ہیں؟'' سانول نے پوچھا۔

ماما اللہ رکھیو نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ''ہاؤ پٹ...... ! تھر سے آئے ہوئے یوں تو بہت سے لوگ ہیں بلکہ ابھی تک آمد ہے یہاں اور آس پاس کے گوٹھ میں بھی کچھ آباد ہوئے ہیں، انہیں ڈھونڈنا پڑے گا۔'' وہ ملوکاں اور میراں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''دھیو...... ! تمہارے ماں، پیو کے نام کیا ہیں اور وہ جس قافلے میں تھے، اس کا سالار کون تھا؟''

ملوکاں اور میراں نے اپنے والدین کا نام اور سالار کارواں سائیں بخش کا ذکر کیا۔

پھر میراں نے قدرے تفکر آمیز بے چینی سے پوچھا۔ ''ماما...... ! کیا ہمارے ماں، پیو ہمیں مل جائیں گے؟''

اس کے اس معصومانہ سوال پر ماما نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ ''ہاؤ دھیئے...... ! تم کیوں حوصلہ ہارتی ہو، میں ہوں ناں...... ڈھونڈ ہی لوں گا، اللہ سائیں ہماری رہبری کرے گا، اچھا یہ بتاؤ دھیو...... ! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ جس قافلے میں تمہارے ماں، پیو شامل تھے، ان کی منزل یہی تھی......؟''

''ہاں ماما...... ! میر کارواں چاچا سائیں بخش کی منزل بدین کا یہی گوٹھ تھا۔'' اس بار ملوکاں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ماما اللہ رکھیو پورے یقین سے بولا۔ ''اگر یہ بات ہے تو تم بالکل بے فکر ہو جاؤ، صبح اٹھ کر سب سے پہلے کام یہی کروں گا۔''

''تیری وڈی مہربانی چاچا...... !''

''اڑی دھیو...... ! مہربانی کیسی، اڑیں مٹھری دھیوں کے کام آنا کوئی مہربانی تھوڑا ہی ہوتی ہے، یہ تو میرا فرض ہے۔'' ماما اللہ رکھیو نے شفقت آمیز محبت سے کہا پھر بولا۔ ''اچھا تم دونوں اب آرام سے سو جاؤ، آؤ تم دونوں کو اندر لے چلوں۔'' یہ کہہ کر ماما اللہ رکھیو ان دونوں کو پاس پاس بنے دو کوٹھری نما کمروں میں سے ایک میں لے آیا، یہاں صرف ایک رلی بچھی چارپائی پڑی تھی، میراں اور ملوکاں چارپائی پر لیٹ گئیں، لیٹنے سے پہلے انہوں نے ماما کی ہدایت کے مطابق اپنی کوٹھری کے دروازے کی اندر سے کنڈی لگالی۔

☆======☆======☆

سارنگ کے اس طرح چونک کر اٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی جانور کی تھوتھنی اس کے چہرے کو سہلا رہی تھی...... سارنگ گھبرا کر یکدم بدک کر اٹھ بیٹھا تب وہ جانور بھی اچھل کر وہاں سے بھاگ اٹھا...... سارنگ نے بغور اسے دیکھا، وہ ایک صحرائی لومڑی تھی، اس کا رنگ سفیدی مائل بھورا تھا، وہ سارنگ سے ذرا دور کھڑی ہو کر اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے دیکھ رہی تھی...... سارنگ نے اسے ہشکارا دیا تو وہ فوراً بھاگ اٹھی۔

دور مشرق میں پو پھٹنے لگی تھی...... ارد گرد کا ماحول ہنوز نیم تاریک تھا، شفاف آسمان پر ٹکا چاند اب پھیکا پڑنے لگا تھا، کہیں کوئی ستارہ کسی مایوس دل میں امید کی موہوم سی جوت کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔

سارنگ نے متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا تو دھک سے رہ گیا...... اسے سانڈنی کہیں بھی نظر نہ آئی، وہ پریشان سا ہو گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو حوصلہ دیا اور قریب ہی تالاب سے منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا پانی پیا...... پانی نے دانستہ تھوڑا پیا تھا شاید کسی بیماری کے خوف سے، بہرطور وہ پھر رکا نہیں اور جس سمت اسے نخلستانی آبادی کے آثار نظر آئے تھے، وہ اس طرف بڑھ گیا۔

سارنگ کے دل و دماغ میں اب بار بار اپنی بھابی اللہ وسائی، اس کے ننھے معصوم بچے منٹھار اور نو سالہ فریدو کا چہرہ گردش کر رہا تھا اور انہیں یاد کر کے اسے اپنے سینے میں دل گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اسے وسوسوں نے گھیر لیا تھا اور وہ اس منحوس گاتریا کے خون کا پیاسا ہونے لگا تھا...... چلتے چلتے وہ بار بار اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں غضب ناک انداز میں اس طرح بھینچے جا رہا تھا جیسے وہ گاتریا کی گردن دبا رہا ہو...... غم و غصے کی اس کیفیت میں اس کے قدموں کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہونے لگی تھی۔

سارنگ نے آس پاس پھیلی ہوئی غیر معمولی ہریالی سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنی اصل تھر کی دھرتی سے کافی دور بلکہ بہت دور نکل آیا تھا۔ اتنا تو اس نے بھی اپنے بڑوں سے سن رکھا تھا کہ پڑوسی ملک بھارت کی ایک اور صحرائی دھرتی ان کی سرزمین کی حدود سے ملتی تھی جسے راجستھان کہا جاتا تھا۔ تو کیا وہ بھارت کی سرحد کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے خاصے متفکر انداز میں سوچا۔ کیا اس منحوس گاتریا کا تعلق اس ملک کی دھرتی سے تھا......؟

اس کا ذہن ایک بار پھر زہریلے اور تشویشناک وسوسوں کی آماجگاہ بننے لگا تھا مگر اس کے چلتے رہنے کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی...... وہ بدستور اسی طرح پُرعزم انداز میں آگے بڑھا چلا جا رہا تھا...... آبادی کے قریب پہنچ کر اسے کچھ لوگ نظر آئے، یہ لوگ بھی اس کی طرح غربت اور فلاکت کے مارے ہوئے تھے لیکن یہاں قحط سالی کا دیو ابھی نہیں پہنچا تھا، یہاں اسے ایک بوڑھا شخص ملا، اس نے اپنی کمزور سی کمر پر سوکھی ٹہنیوں کا بہت بڑا گٹھڑ اٹھا رکھا تھا اور اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی، سارنگ نے ازراہ ہمدردی اس سے وہ گٹھڑ لے لیا اور نرم لہجے میں کہا۔ ''چاچا...... ! میں یہ پہنچا دیتا ہوں...... کدھر ہے تیرا گھر......؟''

اس بوڑھے کے جھریوں بھرے چہرے پر تشکر کی بجائے ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرے اور وہ بغور اس کا چہرہ گھورنے لگا۔ سارنگ شرمندہ سا ہونے لگا، وہ سمجھا شاید اس بوڑھے کو اس کی یہ ہمدردانہ حرکت بری لگی ہے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بوڑھا عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تیری مہربانی، کیا مسافر ہو، کہاں سے آئے ہو......؟''

سارنگ نے قدرے اطمینان کی سانس لی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں چاچا...... ! مسافر ہی ہوں بلکہ حالات کا مارا ہوا بھی...... میرے کچھ عزیز کھو گئے ہیں، انہیں تلاش کرتا ہوں یہاں تک پہنچا ہوں شاید تم کچھ مدد کرو میری......!'' سارنگ نے فوراً اپنا مدعا بھی بیان کر دیا۔

اس نے دیکھا، وہ بوڑھا اس کی بات سن کر ایک لمحے کو ٹھٹکا تھا پھر اچانک وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھ...... اچھا...... ! آ جا میرے ساتھ...... مڑھی میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا اور سارنگ اس کے پیچھے ہو لیا۔

سارنگ نے اس بوڑھے میں ایک عجیب بات محسوس کی کہ اس کا لب و لہجہ اس دھرتی کے لوگوں سے میل نہیں کھاتا تھا پھر اچانک سارنگ کو گاتریا کا بھی اندازِ گفتگو یاد آنے لگا...... کم و بیش ان دونوں کا لہجہ ملتا جلتا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ بوڑھا اسے اپنی پھونس کی بنی جھونپڑی میں لے آیا...... جھونپڑی خاصی کشادہ تھی اور اندر اس کا ایک اور بھی چھوٹا سا گوشہ تھا، وہاں اسے ایک سانولی سی دبلی پتلی مگر تیکھے نقوش والی ایک لڑکی نظر آئی شاید یہ اس بوڑھے کی بیٹی ہے...... سارنگ نے اندازہ لگایا اور اس نے جھاڑیوں کا گٹھڑ فرش پر پٹخ دیا۔

''باپو...... ! یہ کون ہے......؟'' وہ لڑکی سارنگ کو تیکھے چتونوں کے ساتھ گھورتے ہوئے بولی۔ اس کے ''باپو'' کہنے کے انداز پر سارنگ ایک بار پھر ٹھٹکا تھا۔

''بٹی...... ! یہ مسافر ہے، اس بے چارے کے عزیز رشتے دار کھو گئے ہیں، انہیں تلاش کرتا ہوا یہ یہاں تک آ پہنچا ہے۔'' اس کے باپ نے جواب دیا پھر سارنگ کو ایک جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیوں رے...... ! کیا نام ہے تیرا......؟'' لڑکی تیکھے انداز میں اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

سارنگ کو اس کا انداز برا لگا...... اس نے بھی خاصے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

''سارنگ......!''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تیرا کون کھو گیا ہے......؟''

''ارے املی......! تُو نے تو اس بے چارے پر بھی تھانیداری شروع کر دی......اسے گریب کو دم تو لینے دے...... میں خود اس سے پوچھتا ہوں۔'' بوڑھے نے اپنی بیٹی کو ٹوکا تو سارنگ کو اس تیکھے چتونوں والی لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا جسے سن کر اس کا مسکرانے کو جی چاہا مگر وہ املی کے تیور دیکھ کر اپنی خواہش کو دبا گیا۔ اس کے بعد وہ بوڑھا سارنگ کے سامنے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے اپنی بیٹی سے بولا۔ ''تو جا تھوڑا کھانے پینے کو لے آ......''

املی وہاں سے ٹلی تو بوڑھے نے سارنگ کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی بالکے......! اب ذرا تفصیل سے مجھے بتا آخر معاملہ کیا ہے...... تیرا کون کھو گیا ہے اور کیسے......؟''

بوڑھے کے استفسار پر سارنگ نے اسے قربی گاتریا کے متعلق بتا دیا، ساتھ ہی اس کا ناک نقشہ بھی بیان کیا، اب تو اس بوڑھے کے چہرے پر پہلے سے بھی زیادہ گہری پُراسراریت کھنڈ آئی تھی اور وہ کافی دیر تک گم صم سا بیٹھا رہا۔

سارنگ اپنے تیئں اس بوڑھے کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے سمجھا کہ اس بوڑھے کو مردود گاتریا کے بارے میں علم ہے پھر بے اختیار اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

''چاچا......! تم نے کیا ایسے شخص کو دیکھا...... وہ اس بستی میں ہی آیا ہے؟''

''ہاں......! دیکھا تو ہے۔'' بوڑھے نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

سارنگ یکدم پُر جوش مسرت سے بولا۔ ''کک...... کیا تُو صحیح کہہ رہا ہے، مجھے بتا کہاں ہے وہ...... میں ابھی اس کے جا کر ٹوٹے کرتا ہوں۔''

''میں بتاتا ہوں...... وہ شخص یقیناً گاتریا ہی ہوگا پر اس کے ساتھ میں نے کسی عورت یا بچے کو نہیں دیکھا مگر وہ تو یہاں سے آگے نکل گیا ہے۔'' بوڑھے کی بات سن کر سارنگ کی امیدوں پر اوس پڑنے لگی۔ ''پر تُو چنتا نہ کر...... آرام سے بیٹھ...... وہ جس کے پاس آ کر رکا تھا، میں اسے جانتا ہوں تُو یہاں ذرا بھوجن کر میں ابھی آتا ہوں۔''

''میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔'' سارنگ نے کہا۔

''نہیں......! اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں، مجھے لگتا ہے وہ جس کے پاس کچھ دن رہا تھا، وہ ضرور اس کا ساتھی ہوگا، تیرے کو دیکھ کر وہ چونک جائے گا، میں خود اسے اپنے طور پر کریدوں گا۔'' یہ کہہ کر بوڑھا اٹھا اور باہر چلا گیا۔ سارنگ کی بھوک اڑ گئی تھی...... وہ اب بے چینی سے اس کے لوٹنے کا منتظر تھا۔

''ارے یہ بابو کدھر چلا گیا...... میں تو اس کے لیے بھی روٹی لائی تھی۔'' اچانک سارنگ کے کانوں میں املی کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری تو وہ چونکا۔ املی ایک بڑا سا تھال پکڑے اس کی چار پائی کے قریب کھڑی تھی۔

''چل لے تو ہی کھا لے سارا...... تُو بہت بھوکا ہوگا۔'' املی نے ایک خاص کھنکتی ہوئی آواز کے ساتھ کہا اور تھال اس کے سامنے چار پائی پر رکھ دیا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے تیری مہربانی......!'' سارنگ اس وقت پریشان تھا، بھوکا ہوتے ہوئے بھی اس کا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، اچانک اسے احساس ہوا کہ املی کھڑی اسے خاموشی سے تکے جا رہی ہے۔ سارنگ نے اچانک سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، املی کے ملیح چہرے پر گہرے تاثرات کھنڈے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔

''ارے نخرے کاہے کو دکھاتا ہے...... اتنی محبت سے تیرے لئے روٹی بنا کر لائی ہوں خالص کھمبیوں کا سالن ہے کھا تو سہی......!'' اس کا لہجہ بھی اس کے نام کی طرح ترش تھا۔

سارنگ پھر انکار نہ کر سکا اور جلدی سے روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جوار کی روٹی اور کھمبیوں میں سارنگ کو بڑی لذت محسوس ہوئی۔

''میں نے تیری باتیں سن لی تھیں...... بڑا پریم کرتا ہے رے تُو اپنی بھابی اللہ وسائی سے......!'' املی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور سارنگ کے سامنے ہی چار پائی پر بیٹھ گئی۔

جانے کیوں سارنگ کو اس لڑکی کا بے باک اور نڈر پن کھلنے لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کھٹی میٹھی چھوکری کی باتوں سے لطف ضرور اٹھاتا مگر وہ اس وقت خود پریشان تھا، اس لیے اس لڑکی کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھی اور ویسے بھی اس کے تصور جاناں میں میراں بسی ہوئی تھی لہٰذا وہ جواباً خاموش رہا۔

''ویسے تُو ہے بڑا سوہنا...... اپنے نام کی طرح سریلا سارنگ......! ہائے نام لیتے ہی دل میں یکتارا سا بجنے لگتا ہے۔'' املی کی بے باکی نے اس بار سارنگ کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کر دیا اور پہلی بار سارنگ نے اگلا نوالہ توڑے بغیر سر اٹھا کر اس کے سانولے چہرے کا جائزہ لیا۔

اس کا چہرہ کتابی تھا، ناک ستواں اور آنکھیں کھنچی ہوئی کمان...... اس نے رنگ دار گھاگرا اور زرد چولی پہن رکھی تھی، ناک پر چاندی کا ابلق بھی جھول رہا تھا، اسی طرح چاندی ہی کا ایک بڑا سا کنٹھا اس کی صراحی دار گردن پر بھی موجود تھا...... ناگن کی طرح بل کھاتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھلملاتے پراندے والی چوٹی اس کی کمر پر رینگتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ایسے کاہے دیکھے ہے رے......؟'' وہ سارنگ کی آنکھوں کو گھورتے پا کر یکدم شرما کر بولی تو سارنگ اپنا سر جھٹک کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ بڑی کامیابی کے ساتھ سدھوراں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے شہر لے آئی تھی۔

کراچی جیسے گنجان شہر میں سدھوراں کو پہلے تو کافی گھبراہٹ ہوئی مگر پھر جہان داد جیسے بھیڑیے صفت انسان سے نجات کی خوشی میں اس نے سب کچھ بھلا ڈالا تھا، اگر نہیں بھلا سکی تھی تو ڈاکٹر فوزیہ کا احسان عظیم...... ڈاکٹر فوزیہ کی بڑی سی عالیشان کوٹھی میں پہنچ کر بے چاری سدھوراں دنگ ہو کر رہ گئی، اس سادہ لوح اور دور افتادہ گوٹھ میں رہنے والی لڑکی نے تو کبھی خوابوں میں بھی ایسا شاندار گھر نہ دیکھا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ کے والد کا شہر کے نامی گرامی سرجنز میں شمار ہوتا تھا، وہ ہارٹ سرجن تھے، دل کی پیوند کاری کے انہوں نے کئی پیچیدہ آپریشن کیے تھے جو ایک ادھ کے سوا سارے ہی کامیاب ہوئے تھے، علاوہ ازیں انہیں بین الاقوامی سیمینار میں بھی بڑی عزت سے مدعو کیا جاتا تھا، ان کا نام حیدر شاہ تھا، وہ ایک سنجیدہ مزاج اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے، ڈاکٹر فوزیہ کی والدہ ڈاکٹر خورشید بھی ایک معروف گائنا کالوجسٹ تھیں اور انتہائی پُر وقار شخصیت کی مالک تھیں۔

ڈاکٹر فوزیہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور دونوں میاں، بیوی کی آنکھوں کا تارا تھی مگر انہیں اپنی اس اکلوتی اور لاڈلی بیٹی سے ہمیشہ ہی شکایت رہی تھی، وہ ڈاکٹر فوزیہ کے جذبۂ انسانی ہمدردی سے سخت عاجز تھے اور اکثر وہ اس کے جذبۂ انسانی ہمدردی کو سرپھرا جذبہ کہہ کر ٹوکتے رہتے تھے، اس پر ڈاکٹر فوزیہ انہیں یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

''کتنے افسوس کی بات ہے پاپا......! ہم ڈاکٹر بننے سے پہلے انسانی خدمت کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر ڈاکٹر بن جاتے ہیں تو ہماری نگاہ مریض کے مرض پر نہیں، اس کی جیب پر ہوتی ہے کہ آیا وہ ہماری بھاری فیس ادا بھی کر پائے گا یا یونہی وقت ضائع کرے گا اور وقت کے زیاں کی خاطر چیمبر سسٹم اور پرچی سسٹم رائج کر لیا گیا ہے...... ذرا سا مشورہ بھی کرنا ہو تو پہلے پرچی کٹواؤ، چیمبر میں داخلے کا ٹوکن خریدو۔''

یہ تھے ڈاکٹر فوزیہ کے افکار...... جس کے سامنے اس کے دونوں مما پاپا بھی جز بز سے ہو

کر رہ جاتے۔ فوزیہ چونکہ ان کی لاڈلی اولاد تھی چنانچہ وہ اسے ناراض کرنے کا خطرہ ہرگز مول لینا نہیں چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ انہوں نے سدھوراں جیسی ایک دیہاتی لڑکی کو دیکھا تو وہ اسے ملازمہ ہی سمجھے تھے تاہم انہوں نے اپنی مصروفیت کی بناء پر اپنے اس اندازے کی بیٹی سے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

یوں سدھوراں اس کی بہن بن کر رہنے لگی...... سدھوراں کو البتہ کبھی کبھی جہان داد کی طرف سے خوف سا محسوس ہوتا تھا مگر فوزیہ اسے ہمیشہ حوصلے کی تلقین کرتی تھی۔ ایک دن موسی نے ڈاکٹر فوزیہ کو تنہائی میں سدھوراں کے سلسلے میں ایک مشورہ دیا۔

''بیٹا......! سدھوراں تو ماں بننے والی ہے، تم جانتی ہو اس کا کنواری ماں بننا گھر میں کتنا فساد کروا سکتا ہے...... بی بی جی اور صاحب کی بڑی عزت ہے، کہیں ایسا نہ ہو......؟''

''میں تمہاری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں موسی......! اب تم ہی بتاؤ نا کیا کیا جائے...... بے چاری سدھوراں کو اس طرح اب بیچ منجدھار میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

درحقیقت وہ خود بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔

''بیٹا......! اس کی شادی کر دو بہت جلدی......'' موسی نے صائب مشورہ دیا۔

''تم ہی کوئی ایسا رشتہ ڈھونڈو جو اسے اس حالت میں قبول کر لے۔''

''ظاہر ہے بیٹا......! ب کوئی جوان لڑکا تو اس سے شادی کرنے سے رہا اور ہمیں بددیانتی سے بھی کام نہیں لینا...... میرا خیال ہے کوئی بچوں والا رنڈوا ہی ٹھیک رہے گا۔'' موسی نے کہا۔

''ہاں یہی بہتر رہے گا...... کم از کم سدھوراں اپنے گھر میں عزت کی زندگی تو گزارے گی، اس طرح اس کے ہونے والے بچے کو بھی باپ کا نام مل جائے گا لیکن سدھوراں مانے تب ناں......''

''وہ کیسے نہیں مانے گی بیٹا!'' موسی بولی۔ ''اسے ماننی ہی پڑے گی ہماری بات، اپنے لیے نہیں تو اپنے بچے کے لیے ہی سہی۔''

''ٹھیک ہے...... تم پہلے کوئی رشتہ ڈھونڈو پھر دیکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے ہامی بھرتے ہوئے کہا پھر یکدم بولی۔ ''مگر موسی! تم ساری بات صاف صاف بتا دینا...... چھپانا کچھ نہیں، پہلے ہی انکار ہو جائے اچھا ہے بعد میں مصیبت ہو جاتی ہے۔''

''جی ہاں بیٹا......! میں تو خود بھی چاہتی ہوں کہ کچھ نہ چھپایا جائے۔'' موسی اس کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطلب سمجھتے ہوئے سر ہلا کر بولی۔

سدھوراں یہاں آ کر بہت خوش تھی...... وہ اب موسی کے ساتھ بنگلے کا سارا کام خود کرتی تھی...... یہ بنگلہ ایک پوش علاقے میں تھا...... آزادانہ ماحول اور کھلا کھانا پینا اور آرام نے سدھوراں کا شہابی رنگ مزید نکھار دیا تھا...... ڈاکٹر فوزیہ نے اسے اپنے کئی قیمتی سوٹ دے دیئے تھے جنہیں پہن کر سدھوراں دیہاتی لڑکی لگتی ہی نہیں تھی...... وقت کے ساتھ ساتھ سدھوراں کی نشست و برخاست میں بھی قرینہ اور خوش سلیقگی آتی چلی گئی...... وہ ڈاکٹر فوزیہ کے کمرے میں ہی رہتی تھی۔

ایک روز ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے یونہی پوچھا۔ ''سدھوراں......! تمہیں سانول یاد آتا ہے؟''

یہ سن کر سدھوراں کے شہابی چہرے پر دور تک اداسی کی گھٹا چھاتی چلی گئی پھر جب بولی تو اس کی آواز دور...... بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''باجی......! یاد تو آتا ہے، سانول میری پہلی محبت تھا...... مجھے یقین ہے اگر وہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مل گیا تو نفرت سے میری طرف سے منہ موڑ لے گا۔''

''ہاں......! یہ مردوں کا شیوا ہے، وہ اپنی مجبوری تو چھپاتے ہیں مگر عورت کی مجبوریوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے تلخ لہجے میں کہا پھر بولی۔ ''سدھوراں......! دیکھو میں تمہاری بہن ہوں ناں...... اس ناتے مجھے تمہاری اب فکر رہنے لگی ہے...... تم یہ بتاؤ سانول کو ڈھونڈنے کی تمہارے اندر جستجو ہے یا پھر تم اب صرف اپنے ہونے والے بچے کی خاطر اپنی بقیہ زندگی گزارنا چاہو گی؟''

سدھوراں پھر بولی۔ ''باجی......! آپ میری سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر ہیں ضرور میرا بھلا ہی سوچیں گی پر جہاں تک سانول کو ڈھونڈنے والی بات ہے، وہ رہنے دیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں اور ویسے بھی آپ کی بات ٹھیک ہے کہ مجھے اب اپنے ہونے والے بچے کی خاطر ہی زندگی کاٹنا پڑے گی...... آپ جو فیصلہ کریں، مجھے قبول ہوگا۔''

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کا یہی عندیہ لینا چاہتی تھی...... اس نے خوش ہو کر اسے اپنے گلے لگا لیا۔

☆======☆======☆

اگلے روز صبح ملوکاں اور میراں ذرا دیر سے جاگیں۔

ماما اللہ رکھیو باہر جا چکا تھا البتہ سانول گھر پر ہی موجود تھا، وہ بے چارا خاموشی سے باہر صحن کی چارپائی پر بیٹھا ان دونوں کے جاگنے کا منتظر تھا۔

''تم دونوں منہ ہاتھ دھو کر چائے وغیرہ پی لو پھر میں نے بھی باہر جانا ہے، ماما کے پیچھے......''

ملوکاں شوخ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''یہ عورتوں والے کام تُو کیوں کر رہا ہے بس تُو چلا جا...... ہم خود چائے بنا کر پی لیں گے۔''

''اچھا......! ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔'' سانول اس سے نظریں چراتے ہوئے اب رسوئی کی بجائے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو ملوکاں نے پھر اسے پکارا۔ ''ڑے سانول......!''

''اب کیا ہے......؟'' وہ رکا مگر پلٹے بغیر پوچھا۔

''تُو کب تک آ جائے گا......؟'' ملوکاں نے دھیرے سے بڑے گہرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تم دونوں کے ماں، پیو کو ہی تلاش کرنے جا رہا ہوں...... پتہ نہیں کتنی دیر لگے، اب ماما کے ساتھ ہی لوٹوں گا، دیر ہو جائے تو رسوئی میں آٹا، چاول اور پلی رکھی ہوئی ہے، بنا کر کھا لینا۔'' سانول نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ملوکاں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی، اس کے لبوں پر دھیمی مسکان چسپاں تھی۔

''تُو بڑا اس کے گلے پڑ رہی ہے...... آخر چاہتی کیا ہے تُو اس سے......؟'' میراں نے معنی خیز انداز میں چٹکی لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''چاہتی تو بہت کچھ ہوں پر وہ ظالم رخ ہی نہیں دے رہا۔'' ملوکاں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر گہرے لہجے میں جواب دیا۔

میراں مسکرا کر بولی۔ ''اڑی چریِ......! رخ کیسے دے گا، اس بے چارے کا دل تو اس چھوکری سدھوراں میں اٹکا ہوا ہے۔''

میراں کی بات سن کر ملوکاں منہ بنا کر بولی۔ ''نہیں، سدھوراں نے سانول کے ساتھ بے وفائی کی تھی، اب وہ اس سے نفرت کرتا ہے، اس کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔''

میراں خاموش ہو گئی۔ جانے کیا بات تھی سانول کے ذکر پر میراں کو اپنا دکھ یاد آنے لگتا تھا، اس کی اچانک سوگواری خاموشی پر ملوکاں نے بھی گویا بدلہ چکاتے ہوئے چٹکی لی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معنی خیز انداز میں اسے اپنی کہنی کا ٹھوکا مارتے ہوئے بولی۔ ''کیوں ڑی منچلی...... ! تیرے کو میرا ادا سارنگ تو یاد نہیں آ رہا؟''

میراں کا چہرہ مزید بجھ گیا، دونوں ایک دوسرے کی چچا زاد کے علاوہ گہری اور رازدار سہیلیاں بھی تھیں، وہ اب ایک دوسرے کے حالِ دل سے بخوبی واقف تھیں تاہم میراں بات بناتے ہوئے بولی۔ ''ملوکاں...... ! دعا کرو ہمارے ماں، پیو مل جائیں...... پتہ نہیں وہ کتنا پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''کاش...... ادا خالقو، بھاجائی اللہ وسائی کو نہ چھوڑتا تو ادا سارنگ بھی تم سے جدا نہ ہوتا...... تم تو جانتی ہو گی میراں، ادا بڑے بھائی کے برعکس کتنا دردمند اور رحمدل انسان ہے۔''

''اس نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا...... بے چاری اللہ وسائی کے ساتھ یہ ظلم کم تو نہ تھا کہ ایک طرف قافلے والوں نے اسے الگ کر دیا، دوسرے خالقو نے بھی اسے چھوڑ دیا، یہ انسانیت تو نہیں ہوئی ناں...... ! ایک گود کے بچے والی عورت کو جلتے سلگتے صحرا میں بھوکا پیاسا تنہا چھوڑ دیا جائے، میں سارنگ کے اس فیصلے پر خوش ہوئی تھی مگر اب نجانے وہ لوگ بے چارے کس حال میں ہوں گے۔''

''اللہ بہتر کرے گا میراں...... ! سارنگ ایک گبرو جوان ہے، ایک نہ ایک دن وہ ہم سے ضرور آن ملے گا۔'' ملوکاں نے رنجور میراں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''چل آ رسوئی میں چل کر چائے پیتے ہیں۔''

ماما اللہ رکھیو اور سانول بعد دوپہر لوٹے اور خاصے خوش خوش نظر آ رہے تھے۔

''ماما...... ! کیا ہوا...... ؟ ہمارے ماں، پیو کا کچھ پتہ چلا...... ؟'' میراں نے بے قراری سے پوچھا۔

سانول ملائمت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھر کر بولا۔ ''ہاؤ ادی...... ! تمہارے ماں، پیو مل گئے ہیں۔''

''کک...... کہاں ہیں وہ...... ہمیں اسی وقت لے چلو ان کے پاس...... پتہ نہیں ہمارے بغیر ان بے چاروں کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔'' اس بار ملوکاں نے غم اور خوشی کے ملے جلے بے قرارانہ انداز سے کہا۔

ماما اللہ رکھیو نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت سے کہا۔ ''دھیو...... ! تم کیوں فکر کرتی ہو اب...... وہ سب خیریت سے ہیں بس ابھی ہم سب روٹی کھا کر چلتے

ہیں۔''

''ماما سائیں...... ! ہماری تو بھوک ہی اڑ گئی ہے، ہم سے روٹی نہیں کھائی جائے گی۔'' میراں نے مجبور لہجے میں کہا۔

ملوکاں اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ''اڑی چریی...... ! ان دونوں بے چاروں کو تو بھوک لگی ہو گی ناں...... ! صبح سے باہر نکلے ہوئے تھے۔''

''دھی میراں...... ! میں نے کہا ناں اب تُو بالکل بے فکر ہو جا...... چل روٹی کھا لے تو چلیں۔''

ان لوگوں نے جیسے تیسے کھانا کھایا پھر سانول ایک چھکڑا لے آیا، یہ سب اس میں سوار ہو کر پہلے کسی موجو نامی ہاری کے گھر اترے، اس نے ہی انہیں بتایا تھا کہ مٹھل اور سکھیو نامی دو بھائیوں کا خاندان تھر سے آنے والے لٹے پٹے قافلے میں شامل تھے جو اب قریب کے ایک گوٹھ میں رہا کرتے ہیں۔

بہرطور اسے بھی چھکڑے پر سوار کیا گیا، میراں اور ملوکاں کی سارے راستے عجیب حالت ہوتی رہی...... ماں، باپ کے ملنے کی خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی، وہ یہی دعائیں مانگے جا رہی تھی کہ خدا کرے موجو ہاری کی بات درست ثابت ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ لوگ پندرہ بیس جھونپڑیوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے بستی نما گوٹھ میں پہنچ گئے، میراں اور ملوکاں بے تابانہ انداز میں چھکڑے سے اتر کر متلاشی نگاہیں دوڑانے لگیں، لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے، ان کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ایک ہی دھرتی تھر کے باشندے تھے چنانچہ ان سے پوچھ گچھ کرنے پر ایک شخص ان سب کو لے کر دو برابر برابر بنی جھونپڑیوں کے قریب لے گیا...... فرطِ جذبات سے میراں اور ملوکاں کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں، جھونپڑی پر جھولتے ٹاٹ کے قریب آ کر اس شخص نے بیک وقت سکھیو اور مٹھل کو پکارا۔

دونوں بھائی شاید اس وقت ایک ہی جھونپڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، آواز سن کر دونوں ہی ایک ساتھ باہر نکلے تو میراں اور ملوکاں ایک چیخ مار کر ان دونوں سے لپٹ گئیں۔

سکھیو اور مٹھل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، انہوں نے اپنی اپنی لختِ جگر کو گلے سے لگا لیا اور وہ بے چارے دونوں بوڑھے، بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے، اس اثناء میں ان کی بیویاں بھی نکل آئیں، ان کے ضعیف چہروں پر اولاد کا غم کھنڈ کر رہ گیا

تھا، بیٹیوں کو پا کر ان دونوں ماؤں کے پژمردہ چہرے بھی کھل اٹھے۔

قصہ کوتاہ یہ رقت آمیز طوفان تھمنے کے بعد مٹھل اور سکھیو کو سانول اور ماما اللہ رکھیو نے ساری تفصیل مختصراً بتانے کے بعد اجازت چاہی تو مٹھل اور سکھیو احسان مندی کے بوجھ تلے مغلوب ہو کر اپنی ٹوپیاں اتار کر ان کے قدموں پر رکھنے لگے۔

سانول اور ماما رکھیو نے فوراً انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے گلے سے لگا لیا اور بعد میں ماما اللہ رکھیو ان سے بولا۔ ''اڑے بابا......! ہم بھی بچیوں والے ہیں...... یہ بھی ہماری دھیوں کے برابر ہیں...... اللہ سائیں ان کا پردہ رکھے، اب ہم کو اجازت دو۔''

''اڑے نا...... بھار کھیو! مانی ٹکر تو کھاؤ ناں، ایسے کیسے......؟'' سکھیو نے کہا۔

''نہیں مانی تو تم کو میرے گھر کھانی پڑے گی...... کل صبح صادق میں تم سب کو لینے آؤں گا، مل بیٹھ کر روٹی بھی کھائیں گے اور کانبھ باندھ کر کچہرا بھی کریں گے، بڑی خالص بھنگ بھی منگواؤں گا۔''

مٹھل اور سکھیو، ماما اللہ رکھیو کے دوستانہ اور بے تکلفانہ لہجے سے بہت متاثر ہوئے پھر انہوں نے باری باری ایک بار پھر سانول اور ماما اللہ رکھیو کو بڑی محبت سے گلے لگایا اور جب وہ دونوں جانے لگے تو سانول کو جاتا دیکھ کر ملوکاں کے دل میں اچانک ایک مجبوری ہوک اٹھی...... وہ اسے پکارنا چاہتی تھی مگر نہ پکار سکی...... سانول بھی اس کی طرف آخری نظر ڈالے بغیر لوٹ گیا...... ملوکاں کو اس کی بے مروتی بری نہیں لگتی تھی، اس نے حسین اور خواب آگیں انتظار میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆======☆======☆

سارنگ کھانا کھا چکا تو اس نے دیکھا کہ املی اس کے چہرے کی طرف بغور تکے جا رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہے......؟''

''آں...... ہاں...... کک...... کچھ نہیں۔'' وہ خیالات سے چونکی پھر بولی۔ ''رے سارنگ......! کیا تُو اپنی بھابی اللہ وسائی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تُو اس کی خاطر اپنے ماں، باپو سے بھی جدا ہو گیا اور اب اتنا کشٹ بھوگ کر یہاں تک آن پہنچا......؟''

''ہاں......!'' سارنگ نے کہا۔ ''بھابی اللہ وسائی نے مجھے سگی بہنوں جیسا پیار دیا ہے، وہ بہت دکھی ہے، پتہ نہیں غریب کدھر خوار ہو رہی ہوگی، اگر مجھے یہ منحوس گاتریا مل جائے تو اس مردود کی بوٹیاں نوچ لوں۔''

''سارنگ......! تُو نے کسی سے پیار کیا ہے...... میرا مطلب ہے کسی ناری، چھوکری سے......؟'' املی نے بے اختیار پوچھا۔

سارنگ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

''املی......! ایک بات تو بتا، کیا تیرے باپو کو معلوم ہے کہ گاتریا کدھر رہتا ہے؟''

''ہاں......! وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے اور......!'' اچانک املی کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

سارنگ کو پہلے ہی کچھ کچھ بوڑھے پر شک ہو گیا تھا کیونکہ ان کا لب و لہجہ بھی کم و بیش گاتریا سے ہی ملتا جلتا تھا، اس نے فوراً پوچھا۔ ''اور کیا...... آگے بول......!''

''ن...... نہیں......! کچھ نہیں......'' یہ کہہ کر املی جلدی جلدی اس کے آگے سے برتن سمیٹنے لگی...... وہ گھبرا سی گئی تھی۔ سارنگ نے ایک داؤ کھیلا، اس نے املی کا ہاتھ پکڑ لیا، سارنگ کی مضبوط گرفت اپنی نازک کلائی پر محسوس کر کے اسے یوں لگا جیسے اس بانکے سجیلے نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اس نے کلائی چھڑانے کی بھی کوشش نہ کی اور سارنگ کا چہرہ تکنے لگی۔

''تُو مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہی......؟'' سارنگ نے دانستہ مسکرا کر کہا تو املی کو اپنے دل کی دھڑکنیں بے طرح انداز میں دھڑکتی محسوس ہونے لگیں۔

''اچھا برتن رکھ کر آتی ہوں پھر بتاتی ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور سارنگ نے اس کی کلائی چھوڑ دی، وہ چلی گئی تو سارنگ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی اس کے کام آ سکتی ہے اور گاتریا کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہے، اسے مصنوعی محبت سے رام کیا جا سکتا تھا لہٰذا جب املی دوبارہ آئی تو سارنگ چارپائی سے اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دھیرے سے اس کے شانوں کو تھاما اور محبت پاش لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''املی......! کیا تُو مجھ سے کچھ چھپائے گی...... میرا دل تو اب تیرے نام پر دھڑکنے لگا ہے۔''

سارنگ کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ املی اس کے لہجے میں حلاوت پر پگھل گئی اور بے اختیار اس کے قریب آ گئی...... سارنگ کو کوفت تو ہوئی مگر اس نے مطلب برآری کی خاطر یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کڑوا گھونٹ پی لیا۔

''املی ...... ! مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے، میں تیرے سے اب کچھ نہیں پوچھوں گا، یقیناً میرا برا نہیں سوچے گی۔'' اس بات پر املی تڑپ اٹھی اور لرزتی آواز میں بولی۔

''نہیں رے سارنگ ...... ! بھلا میں تیرا کیوں برا سوچوں گی تُو مجھ سے نہیں بھی پوچھے تو تب بھی میں تجھے، ساری بات بتا دوں گی ...... سن ! گاتریا میرے باپو کا دوست ہے، وہ سرحد پار سے جوان عورتوں اور بچوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ راجستھان لے جاتا ہے، وہاں انہیں بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے جو بعد راجوں، مہاراجوں کے محل میں یا ہندو سیٹھوں کے ہاں غلام بنالئے جاتے ہیں ...... گاتریا ادھر آیا تھا، اس کے ہمراہ ایک عورت، اس کا بچہ اور ایک نو دس سالہ لڑکا بھی تھا، وہ بے چارے رو رہے تھے مگر گاتریا نے انہیں نجانے کیسی نشہ آور دوا پلا رکھی تھی کہ وہ بالکل نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے، میرا باپو بھی گاتریا کی مدد کرتا ہے اور اسے سرحد پار کرانے میں مدد دیتا ہے بلکہ میرا باپو خود بھی یہی ذلیل دھندا کرتا ہے، اس نے اس گوٹھ کے بھی کئی بچوں اور جوان عورتوں کو جو اپنی غربت سے تنگ آئی ہوئی ہوتی ہیں، انہیں گاتریا کے حوالے کر دیا ہے اور گاتریا میرے باپو کو بہت سا روپیہ دیتا ہے، ادھر آ میرے ساتھ ...... !'' املی نے صراحت سے کہا اور اسے اپنے ساتھ جھونپڑی کے اندرونی گوشے میں لے آئی، یہاں ایک کونے میں لوہے کا زنگ آلود صندوقچہ رکھا ہوا تھا، اسے املی نے کھولا تو سارنگ کی آنکھیں پھٹ گئیں، وہ نوٹوں سے بھرا تھا، سارنگ ساری حقیقت جان کر غم و غصے، سے بے حال ہو گیا اور اسے اب گاتریا کے ساتھ املی کے باپو پر بھی طیش آنے لگا جو اس گھناؤنے اور مکروہ دھندے میں اس دغا باز گاتریا کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

اس کے بعد املی نے اسے یہ بھی بتایا کہ گاتریا نے اس کے باپو کو یہ بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے، میرا تعاقب کرتا ہوا ایک نوجوان یہاں تک آن پہنچے تو اسے زہر دے کر ہلاک کر دینا۔

سارنگ املی کی بات سن کر بری طرح ٹھٹکا اور بغور املی کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

''پھھ ...... پھر ......؟'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''پھر کیا ...... ! جب تُو یہاں آیا اور میرے باپو نے مجھے تجھے روٹی دینے کو کہا تو ساتھ ہی مجھے زہر کی ایک پڑیا بھی تیرے کھانے میں ملانے کو دی تھی تاکہ تُو روٹی کھاتے ہی مر جائے مگر میں نے وہ چھپا لی۔'' املی نے کہا اور پھر اپنے دوپٹے کی گرہ کھول کر زہر کی پڑیا

اسے دکھائی۔

سارنگ کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا معاً املی کا باپ اندر داخل ہوا، وہ اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس کی بیٹی نے اپنا کام نمٹا دیا ہو گا مگر جب اس نے سارنگ کو اپنے سامنے جیتا جاگتا ہوا دیکھا تو بری طرح ٹھٹکا، اس نے قہر آلود نظروں سے اپنی بیٹی املی کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کم بخت تُو نے ابھی تک اپنا کام نہیں کیا۔

سارنگ غصے میں بھرا بیٹھا تھا لہٰذا اس بوڑھے کو دیکھتے ہی وہ زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔

بوڑھا بوکھلا گیا۔ سارنگ نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ ''بول خنزیر انسان ...... ! تیرا ساتھی گاتریا کہاں ہے ...... بتا ورنہ ابھی تیرا گلا دبا دوں گا۔'' سارنگ نے غیظ آلود لہجے میں کہا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، بوڑھے کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز برآمد ہونے لگی، سارنگ نے اسے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے ذرا گرفت ڈھیلی کی تو بوڑھا پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل بولا۔ ''مجھے ...... نہیں ...... مالوم ...... !''

''جھوٹ بکتا ہے تُو ...... وہ تیرا ساتھی تھا، بتا ورنہ ابھی تیرا ٹینٹوا دباتا ہوں۔'' سارنگ غصیلے لہجے میں غرایا اور ایک بار پھر اپنی گرفت اس کی گردن پر سخت کر دی۔ سارنگ نے ویسے بھی اسے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ یہ انسانوں کی اسمگلنگ جیسے مذموم کاروبار میں گاتریا کا ساتھی اور دست راست تھا۔ بوڑھے کی حالت پھر غیر ہونے لگی، وہ گھٹی گھٹی آواز کے ساتھ کچھ بولنے کی سعی کرنے لگا تو سارنگ نے اسے کھینچ کر چارپائی پر دے مارا، وہ بلبلا گیا۔

''بول کمینے ...... کم ذات ...... ! تُو یہ بردہ فروشی کا دھندہ کب سے کر رہا ہے ...... دیکھ مجھ پر اس وقت خون سوار ہے ...... مجھے گاتریا کا پتہ بتاتا ہے یا نہیں ...... اس بار میں تیری گردن نہیں چھوڑوں گا۔'' سارنگ قہر بار نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

مگر بوڑھا بھی بڑا مکار اور ہٹ کا پکا تھا ...... باوجود اس کے وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ بولا۔ ''میں ...... صحیح کہہ رہا ہوں ...... تم کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' بوڑھے کے جھوٹ نے سارنگ کو مزید چراغ پا کر دیا ...... ویسے اگر اسے املی نے اپنے ''باپو'' کے بارے میں سب کچھ سچ نہیں بتا دیا ہوتا تو شاید سارنگ اسے شک کا فائدہ دیتے ہوئے چھوڑ دیتا۔ بہر طور سارنگ نے بھی جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا ...... اس نے قریب کھڑی املی کو بازو سے پکڑ کر بوڑھے کے سامنے لا کھڑا کیا اور اسے غراتے ہوئے بولا۔ ''اس نے

...... تیری بیٹی نے ...... مجھے تیرے شیطانی کرتوتوں کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ گاتریا کی حقیقت بھی کھول دی ہے میرے سامنے ...... بول اب کیا کہتا ہے؟'' سارنگ کی بات سن کر پہلے تو وہ بوڑھا بھونچکارہ گیا پھر دوسرے ہی لمحے نفرت انگیز نظروں سے اپنی املی کو گھورنے لگا جیسے اس کی تکا بوٹی کر کے رکھ دے گا۔

''ذلیل ...... ! کمینی ...... تُو نے ...... تُو نے ...... !'' معاً بوڑھا اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا غرایا اور سارنگ کی پروا کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ غصے سے پاگل ہو کر اپنی بیٹی پر جھپٹتا، اچانک سارنگ نے اسے بڑھ کر دبوچ لیا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ کر اپنا سوال دہرایا۔ اس بار وہ بوڑھا واقعی ڈھٹائی پر اتر آیا تھا۔ سرد سے لہجے میں بولا ''میں نہیں بتاؤں گا ...... تُو میرا کیا بگاڑ لے گا ...... مجھے قتل کر کے تُو بھی اس بستی سے زندہ سلامت نہیں نکل پائے گا۔''

''تُو کیا سمجھتا ہے کہ تیری لاش کا میں پورے گوٹھ والوں کے سامنے کریا کرم کروں گا، ارے خبیث بڈھے ...... ! تیری تو لاش کو میں ادھر گاڑ دوں گا اور خود تیری بیٹی کے ساتھ آگے نکل جاؤں گا، مگر میں تجھے اس بار آخری موقع دے رہا ہوں ...... بتا مجھے مردود گاتریا کدھر گیا ہے؟'' سارنگ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس بوڑھے میں جانے کس طرح اچانک ہمت جاگی، اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن سارنگ کے ہاتھ سے چھڑائی اور ایک دم باہر کی طرف بھاگا، سارنگ بھی یکدم چونک کر اس کے پیچھے لپکا ...... دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے تھے، بوڑھا زیادہ دیر سارنگ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا تھا چنانچہ سارنگ پل بھر میں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے کاندھے پر اٹھا کر دوبارہ اندر لے آیا اور اسے کھری چارپائی پر پٹخ دیا۔ بوڑھے کے حلق سے گالیوں کا طوفان امڈ پڑا جو اگلے ہی لمحے سارنگ کے گلا دبوچنے پر خرخراہٹ میں بدل گیا ...... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

''ختم کر دے سارنگ اس بے غیرت کو ...... اس مردود نے مجھے بھی گاتریا کے حوالے کرنے کی کوشش کی تھی ...... یہ میرا سوتیلا باپ ہے۔'' قریب کھڑی املی نے حیرت انگیز انکشاف کیا۔

''نہیں ...... میں اس مردود کو اتنی آسان موت نہیں ماروں گا ...... اسے میں زندہ زمین میں دفن کروں گا۔'' سارنگ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ بوڑھے نے اپنے کپکپاتے ہاتھ جوڑے تو سارنگ نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے غرا کر کہا۔ ''اگر تُو اپنی زندگی چاہتا ہے تو سچ سچ بتا ...... گاتریا کدھر گیا ہے؟''

''بب ...... بب ...... بتاتا ہوں۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا تو سارنگ نے دوبارہ غصیلے لہجے میں تہدید کی۔

''مجھے اگر ذرا بھی شبہ ہوا کہ تُو جھوٹ بول رہا ہے تو تیری ایک نہیں سنوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پاس کھڑی املی سے بولا۔ ''تُو زمین کھودنے کے لئے کدال لے آ ......'' اس کے کہنے کی دیر تھی کہ املی ایک کدال اٹھا لائی۔

تب بوڑھے نے فرفر بتانا شروع کر دیا۔ ''وہ مشرق کی سمت جدھر جوار کے کھیت اور کھجور کے جھنڈ ہیں ...... اس راستے سے سرحد پار گیا ہے، وہاں جیوش بابا نامی ایک جیوتشی ہے، اس کے پاس ٹھہرتا ہے، اسے سب معلوم ہے کہ گاتریا وہاں سے کدھر کا رخ کرتا ہے۔''

سارنگ نے چند ثانیے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا، اسے بوڑھے کی بات پر یقین سا ہونے لگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا مگر اسی لمحے املی نے سارنگ سے کہا۔ ''سارو ...... ! مجھے جیوش بابا تک پہنچنے کا راستہ آتا ہے ...... گاتریا نے ہی مجھے ایک روز دارو کے نشے کی پنک میں بتایا تھا تُو بے فکر ہو جا، اس خبیث کو جان سے مار ڈال ......''

''نہیں ...... ! اس کی ضرورت نہیں ہے ...... میں بلاوجہ اپنے ہاتھ اس کے گندے خون سے نہیں رنگنا چاہتا تُو ادھر ٹھہر، میں بستی کے کسی مکھیا سے مل کر اسے اس خبیث کے کرتوتوں سے آگاہ کر کے آتا ہوں پھر وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔'' سارنگ نے کہا پھر تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے لرزہ خیز چیخ سنائی دی، سارنگ ٹھٹک کر رکا اور پھر واپس مڑا، اندر پہنچا تو ایک لرزہ خیز منظر اس کا منتظر تھا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کا عندیہ پانے کے بعد مطمئن ہو گئی تھی ...... سدھوراں نے بھی حالات اور اپنے ہونے والے بچے کی وجہ سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اس نے موسی کو بھی سدھوراں کے لیے کوئی موزوں رشتہ تلاش کرنے کی ہدایت دے دی تھی۔ موسی اس گھر کی ایک صحیح معنی میں نمک حلال ملازمہ تھی، وہ اس گھر کا بھلا چاہتی تھی اور بھلائی اسی میں تھی کہ سدھوراں کا جلد سے جلد رشتہ طے ہو جائے لہٰذا وہ بڑی تندہی کے ساتھ اس کام میں لگ گئی۔

ایک روز ڈاکٹر فوزیہ ڈیوٹی سے واپسی اپنی آلٹو میں لوٹ رہی تھی، اپنی گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی البتہ اس کے مما اور پاپا کی الگ الگ بی ایم ڈبلیو گاڑیاں تھیں جن کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شوفر بھی علیحدہ علیحدہ تھے، ڈاکٹر فوزیہ یہاں پیری فری کے ایک چھوٹے سے سرکاری ہیلتھ سینٹر میں میڈیکل آفیسر تھی، جو شہر کی ایک چھوٹی سی مضافاتی بستی پچل گوٹھ میں تھا۔

اس نے دانستہ انسانی خدمت اور بالخصوص ان نادار عورتوں کو طبی سہولت بہم پہنچانے کی خاطر اس دور افتادہ سرکاری ڈسپنسری میں اپنی تعیناتی کروائی تھی جدھر زچگی سے متعلق کیس وہ خود ڈیل کرتی تھی، ادھر ہی ڈاکٹر جواد بھی تھا، وہ ملیر کینٹ کے علاقے میں رہتا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر فوزیہ کے مما، پاپا نے اس کی بھی مخالفت کی تھی مگر ڈاکٹر فوزیہ کی ضد نے انہیں آخر خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈاکٹر جواد کو سدھوراں کی فکر لاحق تھی مگر ڈاکٹر فوزیہ نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اب سدھوراں کی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی ہے، بہر طور ڈیوٹی سے آف ہوتے ہی ڈاکٹر فوزیہ اپنی آلٹو میں یونیورسٹی روڈ سے واپس گھر لوٹ رہی تھی لہٰذا جیسے ہی وہ حسن اسکوائر کے سگنل پر رکی تو اچانک اس کی نگاہ ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر پر پڑی، وہ بری طرح چونک پڑی، اس کے چونکنے کی اصل وجہ لینڈ کروز کی اگلی نشست پر براجمان ایک بھاری بھرکم شخصیت تھی، اس شخص کو دیکھ کر جانے کیوں ڈاکٹر فوزیہ نروس سی ہونے لگی، وہ جہاں داد خان تھا۔

سگنل کی بتی سرخ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ کی آلٹو کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گاڑیوں کا جم غفیر سا نظر آ رہا تھا اور وہ سفید رنگ کی لینڈ کروزر اس کی کار کے چند گاڑیوں کو چھوڑ کر عقب میں کھڑی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے جہاں داد کی اس لینڈ کروزر کو اپنی کار کے بیک ویو میں دیکھا تھا، گرمی اور دھوپ کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ نے آنکھوں پر سیاہ گاگلز چڑھا رکھے تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو یقین تھا کہ جہاں داد کی ابھی اس پر نظر نہیں پڑی تھی مگر وہ اس تصور سے ہی لرزاں ہوئی جا رہی تھی کہ اگر اس کا موڑ پر جہاں داد سے سامنا ہو گیا تو حالات مخدوش تر صورت حال اختیار کر سکتے تھے، اس کے دل کی رفتار ایک دم تیز تر ہو گئی تھی۔

اسی وقت سبز بتی جل اٹھی، ٹریفک کار کا ہوا ریلا آگے رواں ہوا، ڈاکٹر فوزیہ نے دانستہ کار کی رفتار بڑھا دی اور ساتھ ہی وہ بیک ویو مرر پر بھی گاہے بگاہے نگاہ ڈالتی رہی جہاں داد کی لینڈ کروزر ابھی تک ٹریفک کے اژدھام میں پھنسی ہوئی تھی، ڈاکٹر فوزیہ اپنی چھوٹی سی آلٹو کو گھما کر اوورٹیک کرتی ہوئی خاصی رفتار کے ساتھ دوڑائے چلی جا رہی تھی اس نے دانستہ جیل چورنگی سے بائیں جانب نیوٹاؤن کی طرف کار موڑ لی، یہ نسبتاً ویران سڑک تھی مگر بہر حال یہاں بھی منی بسوں اور لاریوں کی ریل پیل تھی۔

اپنی کار موڑتے ہی اچانک ڈاکٹر فوزیہ نے غیر ارادی طور پر عقبی آئینے میں دیکھا تو اسے اپنا خون رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہونے لگا، وہ سفید رنگ کی لینڈ کروزر اب اس کے تعاقب میں آ رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے گھبرا کر اپنی آلٹو کی اسپیڈ بڑھانے کی کوشش کی مگر عقب میں آنے والی جہاں داد کی سفید لینڈ کروزر آندھی طوفان کی طرح تیزی سے دوڑتی ہوئی اس کی کار کے قریب سے گزرتی ہوئی نکلی اور اگلے ہی لمحے اس کے ٹائر زور سے چرچرائے، وہ اب ڈاکٹر فوزیہ کی آلٹو کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی، اس کی آلٹو کی رفتار ویسے ہی ذرا کم تھی، فوزیہ نے فوراً بریک پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا، اس کی کار لینڈ کروزر سے بس ٹکراتے ٹکراتے بچی، فوزیہ نے ایک طویل سانس لے کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی اور بدستور اسٹیئرنگ سنبھالے سیٹ پر جمی رہی اور ہونٹ چباتی رہی، لینڈ کروزر کے دروازے دھماکے سے کھلے، جہاں داد خان غصے سے بھناتا ہوا اپنی لینڈ کروزر سے اترا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آناً فاناً ڈاکٹر فوزیہ کی کار کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے گھورنے لگا، اس کے چار گن بردار حواری بھی ساتھ تھے۔ ''باہر نکلو ڈاکٹرنی صاحبہ......!'' اس نے غصے سے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ کسی بھی قسم کے خوف اور گھبراہٹ پر اب بتدریج قابو پانے لگی تھی مگر کسی انجانے خطرے کے پیش نظر تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی یہ سعی لاحاصل ہی رہی، وہ دروازہ کھول کر باہر اتر گئی اور جہاں داد سے خاصے درشت لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے...... میری کار کو اس طرح روکنے کا مطلب......؟''

جہاں داد کے لبوں اور پر بڑی زہر خند مسکراہٹ ابھری تھی پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے سے سیاہ گاگلز اتار لیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے تم نے ہمیں پہچانا نہیں، کدھر ہے سدھوراں......؟ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا......؟'' اس کے لہجے میں اچانک غراہٹ اتر آئی۔

''میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے متانت آمیز تلخی سے کہا اور پھر مزید بولی۔ ''سنو مسٹر......! میں اس اندازِ تخاطب کی عادی نہیں ہوں۔''

''مجھے صرف سدھوراں چاہئے جسے تم علاج کے بہانے اپنے ساتھ شہر لے کر آئی تھیں اور پھر نجانے تم دونوں کدھر غائب ہو گئی تھیں۔'' جہاں داد نے حتی المقدور ضبط سے کام لیتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''وہ بھلی چنگی ہو گئی تھی اور ایک روز ہسپتال سے اچانک غائب ہو گئی...... ہسپتال والوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کے پاس جانا چاہتی تھی۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنے متوحش ذہن میں جلدی سے ایک جھوٹ گھڑ کر اسے سنایا۔

''سدھوراں کو تم اپنی ذمہ داری پر لے کر گئی تھیں ڈاکٹرنی صاحبہ......! اور اس کی حفاظت اور اس پر نظر رکھنا بھی تمہاری ہی ذمہ داری تھی۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے اس کو اپنی باندی بنا رکھا تھا اور موقع پاتے ہی وہ فرار ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر جہاں داد کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کو گھورنے لگا...... اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا۔

''دیکھو ڈاکٹرنی صاحبہ......! وہ ہماری کیا تھی، اس سے تم کو کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے، تمہیں صرف اس بات سے مطلب رکھنا چاہئے کہ وہ ہماری ملکیت تھی اور سنو ڈاکٹرنی صاحبہ......!'' اتنا کہہ کر جہاں داد نے اپنی مونچھیں مروڑتے ہوئے اسے سنسناتی نظروں سے گھور کر دانستہ طور پر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتیں... شرافت سے مجھے سدھوراں کے بارے میں بتا دو کہ تم نے اس چھوکری کو کون سے دارالامان میں رکھا ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ اس کی زود فہمی پر دنگ رہ گئی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ایک نگاہ جہاں داد کے تمتماتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اس کے دائیں بائیں کھڑے اسلحہ بدست حواریوں کی طرف دیکھا، ان سب کے چہروں پر گھنی مونچھیں اور داڑھیاں تھیں اور وہ چاروں بڑے جارحانہ انداز میں کھڑے اس کی طرف خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔

''دیکھو مسٹر......! تم اپنے چھوٹے سے گوٹھ یا اپنی اوطاق میں نہیں ہو، یہ شہر ہے شہر......! سمجھے، ہٹو میرے راستے سے......!'' ڈاکٹر فوزیہ کے لہجے میں تلخی اتر آئی تھی، اس نے اسی غصے بھرے انداز میں جہاں داد کے ہاتھ سے اپنے گاگلز جھپٹے اور اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ......! اس بھرے پُرے شہر میں بھی ہم بہت آسانی سے اپنے دشمنوں کو خوار کر کے رکھ دیتے ہیں۔'' جہاں داد نے قدرے جھک کر اس کی کھڑکی کے قریب سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے یوٹرن لیا اور واپس مڑ گئی۔ وہ سخت مضطرب تھی، اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور وہ بری طرح اعصابی سوختگی کا شکار ہو رہی تھی، اسے جہاں داد کی دھمکی آمیز باتوں سے زیادہ اس کا سامنا کرنے پر پریشانی سی ہو رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر دیتے ہوئے کار چلانے

لگی۔ اس روٹ پر رش تھا، یہ سبزی منڈی کا روڈ تھا، ٹریفک کے رش کے ساتھ ساتھ جام بھی ہو رہا تھا، اچانک ڈاکٹر فوزیہ نے عقبی آئینے میں دیکھا تو بری طرح ٹھٹکی، وہی سفید رنگ کی لینڈ کروزر اس کے تعاقب میں آ رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا، وہ سمجھ گئی تھی کہ جہاں داد اس کی کار کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی رہائشگاہ کا پتہ چلانا چاہتا ہے، ڈاکٹر فوزیہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے پھر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی کنپٹیوں میں سنسناہٹ کا احساس ہوا، اس نے یکلخت اپنی اعصابی شوریدگی پر قابو پایا اور ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا، اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دی اور اپنی توجہ گاڑی کو ٹریفک کے اژدھام سے نکالنے پر مرکوز کر دی۔

وہ اب سفید لینڈ کروزر والوں پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنے تعاقب سے باخبر ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کا ارادہ اپنے گھر جانے کی بجائے اب اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دینا تھا لہٰذا وہ بے مقصد ایم اے جناح روڈ پر آ گئی، سفید رنگ کی لینڈ کروزر بدستور اس کے تعاقب میں تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے رمپا پلازہ کے قریب اپنی کار روک کر اندر جا کر آپٹیشنز، سولوشن لیں اور گاگلز وغیرہ کا معائنہ کرنے لگی، وہ لگ بھگ گھنٹے بھر بعد پلازہ سے باہر نکلی اور ادھر اُدھر نظریں دوڑائے بغیر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی، گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے کن انکھیوں سے عقبی آئینے میں دیکھا تو غصے سے دانت پیس لیے، سفید رنگ کی لینڈ کروزر آٹھ دس کاروں کے بعد کھڑی نظر آئی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے کار آگے بڑھا دی اور اب خاصی پریشان ہو رہی تھی، گھر پہنچنا بھی ضروری تھا، اس کا اپنا وقت بھی قیمتی تھا مگر وہ اپنے تعاقب میں لگے ہوئے صحرائی لومڑ جہاں داد خان کو کسی بھی صورت اپنی رہائشگاہ کا پتہ نہیں لگنے دینا چاہتی تھی ورنہ وہ اس کے لیے مستقل دردسری کا باعث بن سکتا تھا اور کوئی خطرناک حرکت بھی کر سکتا تھا، ڈاکٹر فوزیہ کے خیال کے مطابق کراچی جیسے بھرے پُرے شہر میں جہاں داد سے اچانک سامنا محض اتفاق ہی تھا، اب ایک بار اس سے پیچھا چھوٹ جاتا تو دوبارہ ان کا سامنا مشکل تھا۔

یہ محض ڈاکٹر فوزیہ کی خام خیالی تھی یا حد سے بڑھا ہوا اعتماد......! بہر طور ادھر جب ڈاکٹر فوزیہ نے دیکھا کہ سفید لینڈ کروزر کو وہ جل دینے میں ناکام ہوتی جا رہی ہے تو اچانک ایک ولولہ انگیز خیال آیا، اس نے اپنی کار ایک قریبی تھانے کی طرف موڑ لی اور احاطے میں لے جا کر روک دی، کار سے باہر نکل کر اس نے عقب میں دائیں بائیں دیکھا تو سفید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لینڈ کروزر کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔

☆======☆======☆

شام کا جھٹپٹا پھیلنا شروع ہو گیا تھا، دونوں بھائی سکھیو اور مٹھل کا آج کام میں نہیں لگا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ جلد ہی کھیتوں سے لوٹ آئے تھے بلکہ انہوں نے لوٹتے وقت آچر خان کے چھپر ہوٹل میں تاش کی بازی بھی نہیں لگائی تھی اور سلفی کے دم بھی نہیں لگائے تھے جس کے آچر خان پانچ روپے لیتا تھا، درحقیقت اس کی وجہ مٹھل کا رنجور ہونا تھا وہ اپنے چھوٹے بیٹے سارنگ کے ابھی تک گھر نہ پہنچنے کے دکھ میں آزردہ تھا اور یہ دکھ اسے اب دل و بدن تڑپانے لگا تھا، اگرچہ اپنی بیٹی ملوکاں کے خیر خیریت سے گھر لوٹنے پر اسے کچھ سکون ملا تھا، اس کا بھائی سکھیو بھی اپنی بیٹی میراں کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھا مگر اب چونکہ ملوکاں کے ساتھ وہ بھی واپس لوٹ چکی تھی اس لیے سکھیو کو بھی اطمینان ہوا تھا مگر وہ اپنے بھائی مٹھل کا دکھ بانٹنے کی خاطر اس کے ساتھ جلدی گھر لوٹ آیا تھا، دونوں کی سرکنڈوں کی جھگیاں ساتھ ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں، سکھیو اپنے بھائی مٹھل کی اداسی کی وجہ سے اس کی جھگی میں ہی بیٹھا ہوا تھا، وہاں پہلے سے ہی اس کی بیوی نہالاں اور بیٹی میراں بھی موجود تھیں شاید وہ بھی اپنی جٹھانی مائی عجیباں اور بھتیجی ملوکاں کے ساتھ دکھ بانٹ رہی تھیں، ان سب نے مل کر بے دلی سے کھانا کھایا پھر جھگی کے ننگے فرش پر رلی بچھا کر بیٹھ گئے، اتنے میں ملوکاں چائے کے پیالے لے آئی، دونوں خاندانوں کے افراد وہیں براجمان تھے البتہ مٹھل کا بڑا بیٹا خالقو حسب معمول باہر اپنے دوستوں کے ساتھ مشغول تھا۔

''بھا مٹھل ......! حوصلہ کر، اڑیں دونوں دھیاں کھیریت سے آئی ہیں، اب اللہ سائیں کرے گا اڑاں پٹ سارنگ بھی کھیریت سے ایک دن گھر آ پہنچے گا۔'' سکھیو بھائی کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

مٹھل نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ''بس بھا......! دعا کر میڈا پٹ جلدی گھر آ جائے...... میرے دل کا تو سکون ہی کٹ گیا ہے، آخر اسے ضرورت کیا تھی ہم سے جدا ہونے کی......''

''پیو ادا......! سارنگ کوئی خوشی سے تھوڑی ہم سے جدا ہوا تھا، وہ تو ادا خالقو نے بھابی اللہ وسائی اور معصوم منٹھار کو صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا تھا تو......!'' ملوکاں جو پہلے ہی اپنے بڑے بھائی خالقو سے نالاں تھی، یکدم بولی۔ مٹھل اس کی بات کاٹ کر جھڑکتے ہوئے بولا۔

''اڑی تو تیری بھابی کو بھی چین بلا کی بیماری لگ گئی تھی، اسے قافلے سے جدا نہ کرتے تو کیا ہم خود بھی سارے بیمار پڑ جاتے...... صرف اسے ہی نہیں بلکہ اور بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا جن کو چین بلا جیسی کھترناک بیماری تھی۔''

''پیو......! یہ تو ہم نے ان سب ہی پر ظلم کیا تھا ناں......!'' ملوکاں اپنی فطری سرکشی کی وجہ سے سپر ڈالنے کو تیار نہ تھی۔ ''ہمیں چاہئے تھا ایسے بیمار لوگوں کا ایک علیحدہ ٹولہ بناتے مگر انہیں خود سے تو جدا نہ کرتے۔''

''مجھے تو اب یہ خوف آنے لگا ہے کہ میرا پٹ سارنگ، اللہ وسائی کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو کہیں کھترناک بیماری نہ لگا بیٹھے۔'' اچانک مائی عجیباں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ملوکاں جیسے اب ماں کے پیچھے پڑ گئی اور قدرے تلخ لہجے میں بولی۔

''واہ امڑ......! تجھے اڑیں بیٹے کی تو فکر ہے مگر اس عورت اور معصوم بچے کی فکر نہیں ہے، جن معصوموں کو جلتے سلگتے ہوئے صحرا میں بے سہارا کر دیا گیا تھا...... آخر کو وہ بھی کسی کی اولاد تھی، بھابی اللہ وسائی کے ماں، پیو اگر زندہ ہوتے تو کیا وہ خود سے اسے علیحدہ کرتے...... ادا سارنگ نے بالکل ٹھیک کیا جو بھابی کا سہارا بنا اور مجھے پورا یقین ہے وہ ایک دن ضرور بھابی کو لے کر لوٹے گا۔''

''اڑی تُو چپ کر......!'' مٹھل نے اسے ڈپٹا۔ ''اللہ وسائی کو اگر سارنگ ادھر لے بھی آیا تو ہم اسے اڑیں پاس بالکل نہیں رکھیں گے اور ویسے بھی خالقو اسے چھوڑ چکا ہے۔''

''اتنا بے حس نہ بن پیو......!''

''اڑی تُو ماٹھ کر دھی ملوکاں......!'' اچانک سکھیو نے مداخلت کرتے ہوئے اپنی بھتیجی ملوکاں کو جھڑکا اور پھر اپنے بھائی مٹھل سے بولا۔ ''بھا مٹھل......! حوصلہ کر اللہ وسائی آ بھی گئی تو اس کا علاج کروائیں گے، دوسرے کے دکھ کو اڑاں دکھ سمجھے گا تو تیرا بھی بیڑہ پار ہو گا اور سارنگ بھی کھیریت سے گھر پہنچ جائے گا۔''

ماحول میں سوگواری خاموشی چھا گئی پھر اس کے بعد سکھیو اور نہالاں اپنی جھگی میں چلے گئے البتہ ان کی بیٹی میراں وہیں ملوکاں کے ساتھ موجود رہی، مائی عجیباں اپنے کام میں لگ گئی اور مٹھل وہیں رلی پر ہی دراز ہو گیا۔

''کیوں ڑی میراں......! تیرے کو ادا سارنگ بڑا یاد آتا ہو گا؟'' ملوکاں نے میراں کو چھیڑا۔ یہ حقیقت تھی کہ میراں کی گلنار آنکھیں جانے کب سے اپنے محبوب سارنگ کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملوکاں کے ٹھوکا دینے پر وہ مجبور سے لہجے میں بولی۔ ''ملوکاں...... ! مجھے تیرے ادا کی ہی نہیں بلکہ اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے منٹھار کی بھی فکر ہے...... پتہ نہیں وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔''

''اللہ سائیں...... ! تُو ادا سارنگ، بھابی اللہ وسائی اور اس کے معصوم بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھ اور خیر خیریت سے انہیں واپس گھر پہنچا۔''

''آمین...... اللہ سائیں کرے ایسا ہی ہو۔'' میراں نے زیر لب کہا۔

اسی لمحے ملوکاں کا بڑا بھائی خالقو جھگی میں داخل ہوا تو دونوں جلدی سے سر پر چادریں درست کرنے لگیں...... خالقو نے میلی چیکٹ اسکٹ پہن رکھی تھی، نیچے بھی اسی طرح کا تہبند باندھ رکھا تھا، بال کھچڑی اور میلے کچیلے چہرے پر چھدری چھدری داڑھی، آنکھوں میں سرخ سرخ تیرتے ہوئے ڈورے اسے ''گرنگ'' (کرک) موالی (نشئی) کی طرح بنا رہے تھے۔

وہ اللہ وسائی اور معصوم بچے کو خود سے دور کرنے کے بعد اور بھی لاپروا اور نکھٹو ہو گیا تھا، بوڑھے ماں باپ کی کمائی پر سارا دن جھگی میں ہی اینڈتا رہتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے تیز نظروں سے ملوکاں اور میراں کی طرف دیکھا پھر قریب بچھی جھلنگا سی چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا جیسے بڑی محنت مزدوری کر کے آیا ہو۔

''اڑی ملوکاں...... ! مانی دے میکوں۔'' (روٹی دے مجھے) وہ اپنی بہن سے جھلّے دار لہجے میں بولا۔ ملوکاں کی آنکھوں میں تلخی اتر آئی، اتنے میں میراں رخصت ہوتے ہوئے اس سے بولی۔

''چنگو ادی...... ! میں اب چلتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد ملوکاں کا منہ بناتی ہوئی رسوئی میں آ گئی، اسے بھائی کا اس طرح حکم چلانا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا مگر وہ چپ رہتی تھی۔

بھائی کو روٹی دینے کے بعد ملوکاں جھگی کے شکستہ صحن میں آ گئی، یہاں ایک چھوٹے سے چھپر نما برآمدے کے بدنما بانس سے جھولتی لالٹین روشن کی پھر اندر رسوئی میں بیٹھ کر برتن دھونے لگی، اندر اکلوتی کوٹھری نما گوشے میں مٹھل اور مائی عجیباں سستے تمباکو کی گڑگڑی پی رہے تھے۔

روٹی کھا چکنے کے بعد چارپائی پر بیٹھے خالقو نے بے ہنگم ڈکار لی اور ملوکاں کو آواز

دی۔ ملوکاں بے دلی سے اٹھی اور چارپائی کے قریب آ کر خالی برتن سمیٹنے لگی۔

''پیو کو بھیج ذرا میرا پاس...... !'' خالقو نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑ کر پونچھنے کے انداز میں اپنے سر کے بالوں پر پھیرتے ہوئے اس سے کہا اور ملوکاں کوئی جواب دیے بغیر برتن اٹھا کر رسوئی میں چلی گئی پھر وہاں سے کوٹھری میں آئی اور سامنے شکستہ فرش پر بیٹھے باپ سے بولی۔ ''پیو...... ! خالقو تجھے بلا رہا ہے۔''

''کیوں بلا رہا ہے...... کیا کوئی کام ڈھونڈ لیا ہے اس ہڈحرام نے......؟'' اس کا باپ مٹھل کھانستے ہوئے بولا۔

''مجھے پتہ نہیں کیوں بلا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر ملوکاں باہر نکل گئی۔

جب کافی دیر گزر گئی اور مٹھل نہ آیا تو خالقو نے باپ کو پکارا۔ ''پیو...... ! ذرا ادھر آ تیرے سے بات کرنی ہے ایک ضروری......''

''آتا ہوں...... آتا ہوں ماٹھ کر ذرا...... !'' مٹھل ناگواری سے بولا اور پھر تلخی سے بڑبڑایا۔ ''میرا پیو بننے کی کوشش کرتا ہے، بڑا آیا ہے بلانے والا ہنہ...... !''

''جا...... جا کر اس کی بات سن لے، آخر تیرا وڈا پٹ ہے۔'' پاس ہی بیٹھی اس کی بیوی مائی عجیباں نے شوہر سے کہا۔

مٹھل اسے ڈپٹ کر بولا۔ ''تُو چپ کر کے بیٹھ...... بڑا آیا وڈا پٹ...... کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا...... !'' پھر وہ دو چار مزید کش لینے کے بعد اٹھا اور صحن میں آ گیا۔

''کیا بات ہے کیا کوئی کام ڈھونڈ لیا ہے یا پھر میرے ساتھ صبح تڑکے کام پر جانے کا ارادہ ہے؟'' باپ نے طنزیہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''کام بھی مل جائے گا، آخر کو جوان ہوں، کوئی نہ کوئی مزدوری تو مل ہی جائے گی۔'' خالقو بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

''مجھ بڈھے کو تو کام فوراً مل گیا، تیرے جیسے جوان کو کیوں نہیں مل رہا......؟'' مٹھل بدستور تلخی سے بولا اور خالقو کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''پہلے میری ایک بات سن لے، یہ بھی کام ہی کی بات ہے۔'' خالقو نے قدرے چاپلوسی سے کہا۔

اس کا باپ بیزاری سے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... ہاں بول سن رہا ہوں میں...... !''

''پیو...... ! وہ ہے ناں اپڑاں آچر خان ہوٹل والا، وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔''

خالقو نے بتایا تو مٹھل ذرا سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ آچر خان کس بلا کا نام ہے، گوٹھ میں ایک واحد ہوٹل اس کا ہی تھا جو تھا تو چھپر نما مگر چلتا خوب تھا، اس کے ہوٹل میں ٹی وی تھا، تاش کی بازی بھی وہیں جمتی تھی، مٹھل اور سکھو کھیتوں سے واپسی پر وہیں چائے پینے بیٹھتے تھے اور تاش بھی کھیلتے تھے، آچر خان کی عمر پچاس کے قریب تھی، وہ شادی شدہ بھی تھا مگر اس کی کوئی اولاد نہ تھی مگر مٹھل کو اپنے بیٹے خالقو کی بات پر قدرے تعجب ہوا تھا کہ آخر اسے اس کی شادی کی فکر کیوں لاحق ہوگی۔

''اڑے بابا...... ! وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو کرے، ہم نے کب روکا ہے اسے......'' مٹھل بولا۔

''اڑے پیو...... تُو سمجھتا کیوں نہیں، بڑا پیسے والا ہے، وہ کہہ رہا تھا کوئی اچھا سنگ (رشتہ) ملے تو پورے ڈیڑھ لاکھ عوضانہ دوں گا اور دونوں طرف کا خرچا بھی خود بھی اٹھاؤں گا۔'' خالقو نے صراحت سے بتایا۔ مٹھل کچھ سمجھے بغیر بولا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے پھر ڈھونڈ لے اپنی عمر کی کوئی پکی پاٹھی عورت...... !''

''اڑے پیو! تُو سمجھتا کیوں نہیں...... !'' خالقو چڑ کر بولا۔

بالآخر مٹھل بھی بھنا کر بولا۔ ''اڑے تو پھر تُو ہی سمجھا میرے پیو...... !''

''پیو...... ! اڑیں ملوکاں جو ہے، اس کا سنگ (رشتہ) دے دیتے ہیں اسے بہت عیش...... !'' خالقو کی بات حلق میں ہی رہ گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے مٹھل اپنے لالچی بیٹے کی بات سن کر فوراً غصے سے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر قریب ہی رسوئی میں بیٹھی برتن دھوتی ہوئی ملوکاں کے کانوں تک بھائی اور باپ کی آواز صاف پہنچ رہی تھی، اپنے خودغرض بھائی کی بات سن کر اس کا دل بھی دھک سے رہ گیا اور اس کے ہاتھ سے پتیلا چھوٹ گیا۔

''اڑے بے غیرت، تیری عقل کو نشہ چڑھ گیا ہے جو تُو اڑیں جوان گڈی جیسی معصوم ملوکاں کا سنگ ایک بڈھے اوباش سے کرنا چاہتا ہے...... ہمت کیسے ہوئی اس جواری کی، اس نے میری پھول سی بچی پر گندی نظر رکھی۔'' مٹھل غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

خالقو بھی قدرے تڑخ کر بولا۔ ''پیو...... ! کیوں غصے میں اپنی بوڑھی ہڈیوں کو ہلکان کر رہا ہے، اس نے تھوڑی اڑیں ملوکاں پر نظر رکھی ہے بلکہ اس نے تو دیکھا بھی نہیں ہے اسے...... تُو، تُو بھی خواہ مخواہ غصے میں آ گیا، تُو خود بھی تو اس کے ہوٹل میں تاش کھیلنے جاتا ہے۔''

''اڑے تو میں جوا تھوڑا ہی کھیلتا ہوں...... سادی بازی لگاتا ہوں...... تھک جاتا ہوں

سارا دن کام کر کے۔''

مٹھل کا غصہ ابھی تک آسمان کو چھو رہا تھا، باپ بیٹے کی گرماگرمی پر اندر سے مائی عجیباں حیران پریشان سی صحن میں آ گئی، ملوکاں بھی رسوئی سے نکل آئی اور ناگواری سے اپنے لالچی اور خودغرض بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ ''سن لے عجیباں...... ! کیا کہہ رہا ہے تیرا پٹ خالقو...... روپے کے لالچ میں کہتا ہے اڑیں معصوم ملوکاں کا بیاہ اس بڈھے آچر خان سے کر دے...... سمجھا اس کو میرا پیو بننے کی کوشش نہ کرے۔'' یہ کہہ کر مٹھل غصے سے پاؤں پٹختا ہوا دوبارہ کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

☆======☆======☆

سامنے چارپائی پر وہ بوڑھا خون میں لت پت پڑا تھا اور چارپائی کے قریب املی ہاتھوں میں خون آلود کدال اٹھائے وحشیانہ نظروں سے اپنے باپ کی لاش کو گھور رہی تھی۔ یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر سارنگ جیسے بت بن گیا پھر دوسرے لمحے وہ آگے بڑھا۔

''یہ تُو نے کیا کر دیا املی...... !''

''میں نے وہی کیا جو مجھے اسی وقت کر دینا چاہئے تھا جب یہ خبیث انسان مجھے مردود گاتریا کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔'' املی نے خون آلود کدال کو پرے پھینکتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت بھرے شعلے پھوٹ رہے تھے پھر وہ اپنی پھولی پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بتانے لگی۔

''تیرے باہر نکلتے ہی یہ خبیث مجھ پر چڑھ دوڑا تھا اور دھمکی دینے لگا کہ اس بار گاتریا آیا تو تجھے اس کے حوالے کر کے ہی چھوڑوں گا ہنہ...... ! گاتریا تو نہ آیا اس کی موت آ گئی۔'' املی کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

سارنگ اپنی جگہ گم صم سا کھڑا اس عجیب لڑکی کو دیکھنے لگا پھر وہ املی سے بولا۔

''اتنی بہادر تو نظر نہیں آتی تھی تُو...... چلو اچھا کیا اس شیطان کے خون سے تُو نے ہی اپنے ہاتھ رنگ ڈالے...... جب وہ مردود گاتریا ادھر آیا تھا تو کاش اسے بھی اسی طرح ختم کر ڈالتی۔''

''سارنگ...... ! یہ بہادری تو میں نے تیری وجہ سے کی ہے، اب میں تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔'' املی نے مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو بے چارہ سارنگ یکدم گھبرا گیا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا کہ یہ پاگل چھوکری خواہ مخواہ اس کے گلے کا

ہار بننے لگی ہے۔

''میرے ساتھ رہ کر تُو کیا کرے گی...... میں تو خود بے گھر ہوں، اب تُو اس کی لاش کا کریا کرم کر، میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر سارنگ جلدی سے پلٹا اور فوراً جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

وہ رکے اور پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا، اچانک اسے اپنے عقب سے املی کی آواز سنائی دی۔ ''ارے او بے مروت......! تیری خاطر میں نے اس شیطان کو ہلاک کر ڈالا...... اب تُو بھی مجھے چھوڑ کر چلا ہے...... رک تو ذرا میں آئی۔''

سارنگ نے قدرے گھبرا کر اور رکے بغیر عقب میں دیکھا تو املی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑی چلی آ رہی تھی، وہ بھی بے چارہ یکدم بدحواس ہو کر دوڑا، بڑی مضحکہ خیز صورت حال ہو گئی تھی، سخت گرمیوں کے موسم کی وجہ سے آس پاس سناٹا طاری تھا، اکا دکا لوگ سروں پر گیلے انگوچھے دھرے گھروں کو لوٹ رہے تھے، سارنگ دوڑتا ہوا بہت دور نکل آیا اور پھر ایک جنگل میں داخل ہو گیا، یہاں کھجوروں کے درختوں کی بہتات تھی، اکا دکا صحرائی پاپلر بھی ایستادہ تھے، وہ یہی سمجھا تھا کہ اس دیوانی لڑکی کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے مگر جب اس نے ایک چوڑے تنے والے پاپلر کے سائے میں رک کر اپنے عقب میں دیکھا تو ششدر رہ گیا، املی ہانپتی کانپتی بہت دور سے آتی دکھائی دی، سارنگ بہت تھک چکا تھا، گرمی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا، پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، وہ بے دم سا ہو کر پاپلر کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد املی بھی گرتی پڑتی اور ہانپتی ہوئی اس کے قریب آ کر نڈھال سی ڈھیر ہو گئی۔ دونوں میں بولنے کی ہمت نہیں تھی، ذرا دیر دونوں ہانپتے رہے پھر اس کے بعد سارنگ نے قدرے سخت لہجے میں املی کو مخاطب کر کے کہا۔ ''چھوکری......! تُو پاگل تو نہیں ہو گئی، خواہ مخواہ میرے گلے کا ہار بن رہی ہے؟''

سارنگ کے سرد رویے پر املی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ قدرے تنک کر بولی۔ ''کیوں رے......! اتنی جلدی مجھے بھول گیا تُو تو مجھے پسند کرتا تھا اور یہ تُو مجھے چھوکری کاہے کو کہتا ہے، میرا نام تجھے نہیں معلوم......؟'' سارنگ اس کی جوابی کارروائی پر زچ ہو کر رہ گیا۔ وہ آفت ناگہانی سے چھٹکارا پانے کی سوچنے لگا، وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ہٹیلی اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی، اسے پیار سے رام کر کے ہی چھٹکارا پایا جا سکتا تھا لہٰذا وہ ناچار اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے اسے سمجھانے کی غرض سے بولا۔

''دیکھ املی......! میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل میں تجھے اپنے ساتھ خوار نہیں کرنا چاہتا، پتہ نہیں مجھے اس مردود گاتریا کی تلاش میں کتنی دور جانا پڑے اس لئے میں چاہتا تھا کہ اپنی بھابی اللہ وسائی کو تلاش کرنے کے بعد میں ادھر ہی تیرے پاس لوٹوں۔''

سارنگ کی جادو بھری گفتگو نے کام کر دکھایا اور وہ بھی اس کی طرف مخمور نگاہوں سے تکتے ہوئے گہرے لہجے میں بولی۔ ''دیکھ رے......! میں تیرا ساری زندگی انتظار کرنا چاہتی ہوں، پر مجھ پر تُو بھروسہ کیوں نہیں کرتا، میں تجھ پر بوجھ نہیں بنوں گی، دیکھ سارو......! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، مجھے اس منحوس گاتریا کے سارے ٹھکانوں کا علم ہے، میں تیری اس کام میں مدد کرنا چاہتی ہوں۔''

سارنگ کا اس کی بات سن کر اپنا ماتھا پیٹنے کو جی چاہا مگر وہ سردست بیزاری کا کوئی تاثر اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ دل ہی دل میں اس سے پیچھا چھڑانے کا آسان راستہ سوچ چکا تھا اس لئے وہ خاموش ہو رہا، املی اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا، سارنگ نے آگے بڑھنے کا قصد کیا اور پھر دونوں آگے ہو لئے۔ وہ مسلسل چلتے رہے، نخلستان اور آبادی بہت پیچھے چھوڑ آئے اور اب وہ ایک بار پھر ریت کے حدِ نگاہ ویرانے میں نکل آئے۔ املی، سارنگ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسے جیوش بابا کے ٹھکانے کے بارے میں بتانے لگی۔

املی کی یہ معلومات خاصی کارآمد ثابت ہوئیں جس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد ''ڈالی'' سے گزرنے کے بعد سرحد پار کے گاؤں ''گورا'' کے قریب پہنچ گئے ورنہ سارنگ نے یہی تہیہ کر رکھا تھا کہ املی کو سوتا چھوڑ کر آگے نکل پڑے گا، اگرچہ اب بھی وہ اپنے فیصلے پر قائم تھا، وہ موقع کی تلاش میں تھا مگر جیسے جیسے صحرا میں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اسے بار بار اپنے راہ سے بھٹک جانے کا ڈر محسوس ہونے لگا تھا لیکن ایسے میں املی کا ساتھ اسے غنیمت محسوس ہوتا۔

رات سر پر آ گئی تھی۔ سامنے تھوہر کے گھنے ڈھینگر تھے۔ ایک اجڑا اجڑا...... پاپلر کا درخت بھی طلسمی چاندنی میں عجیب سوگوار سا تاثر دے رہا تھا۔ انہیں اب بھوک ستانے لگی تھی۔ سامنے بہت دور انہیں ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ املی کا خیال تھا یہاں سے بدین کی سرحدی پٹی شروع ہوتی ہے، یہاں خاردار باڑھ بھی تھی اور دونوں اطراف کی بارڈر سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آنے کا بھی احتمال تھا۔

''اب کیا کریں...... پٹی عبور کئے بنا ہم آگے کس طرح بڑھ سکتے ہیں۔'' سارنگ نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے املی سے پوچھا۔ وہ اب اس پر اعتماد کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لگا تھا۔

''نہیں ...... یہ ممکن ہے مگر اس میں بھی بڑا کشٹ (تکلیف) بھوگنا پڑے گا۔'' املی نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب...... کیسا کشٹ......؟''

''ذرا ٹھہر بتاتی ہوں۔'' املی نے کہا اور پھر نقرئی چاندنی میں ریت پر اپنی سانولی انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔ سارنگ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے سارنگ کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ''ادھر آ...... تیرے کو بتاؤں۔'' سارنگ اس کے قریب سرک آیا۔ وہ بولی۔ ''یہ دیکھ...... اس وقت ہم بدیسی سرحد کے پورب تھوہر کے جھل میں موجود ہیں۔'' املی بڑے ماہرانہ انداز میں ریت پر کھینچی ہوئی لکیروں پہ انگلی کے اشارے سے اسے سمجھانے لگی۔ سارنگ بڑے انہماک سے سن اور دیکھ رہا تھا۔

''اگر ہم یہاں سے پورب کی بجائے پچھم کا راستہ اپنالیں تو یہاں سے کوئی لگ بھگ آٹھ دس کوس کے فاصلے پر بھیل اور میگھواڑ قبیلے کا قصبہ آئے گا۔ یہ قبیلہ چونکہ دونوں طرف کی سرحدی پٹی پر واقع ہے اس لیے یہ ایک خاص تہوار پر قافلوں کی صورت میں آتے جاتے رہتے ہیں۔'' اتنا بتا کر املی تھمی۔

سارنگ جیسے فوراً اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے خیال ہے ہمیں پونڈوں کی اس بستی تک پہنچ کر ان کا بھیس بھرنا ہوگا۔''

''ہاں...... پھر ہی ہم بآسانی اور بے خطر سرحد پار کر سکتے ہیں۔'' املی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور سارنگ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہوگیا۔ اسے یوں تو املی کی بات سے اتفاق تھا مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح سرحد پار کرنے اور جیوش بابا تک پہنچنے کے بعد گاتریا کو تلاش کرنے میں کافی وقت لگ جائے گا تب تک وہ مردود گاتریا اللہ وسائی، اس کے معصوم بچے اور فرید کا جانے کیا حشر کر چکا ہو لیکن اگر وہ املی کی تجویز کو رد کر کے خاردار باڑھ تک پہنچ کر سرحد پار کرنے کی کوشش کرتا تو دھر لئے جانے کا خطرہ تھا اور ایسی صورت میں پھر وہ جہاں سے ہلا تھا، اس سے بھی پیچھے چلا جاتا۔ لہٰذا اس نے املی کی تجویز پر ہی عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیوں رے...... کیا سوچنا پڑا ہے۔'' املی نے اسے ٹھوکا دے کر پوچھا۔

سارنگ نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... مجھے تیری تجویز سے اتفاق ہے، اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔''

''پر چلنے سے پہلے پیٹ کا دوزخ بھرنا پڑے گا۔ مجھ سے تو اب ایک قدم بھی خالی پیٹ نہیں چلا جا رہا۔'' املی نے کہا پھر دوسرے ہی لمحے اچانک جیسے کچھ سوچ کر بولی۔ ''دیکھ رے سارنگ...... اتو اگر کسی چھوٹے موٹے جانور کا شکار کر لے تو اسے بھون کر پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی ہے۔ میرے پاس ماچس ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے گریبان سے ماچس کی ڈبیا نکال کر اسے دکھائی۔

''پر...... یہاں...... ریت کے سمندر میں کیا شکار ملے گا۔'' سارنگ بولا۔

''کوشش کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کوئی جنگلی خرگوش تو نظر آ ہی جائے گا۔'' املی نے کہا۔

سارنگ نے ایک لمحہ بغور اس کے کٹیلے سلونے چہرے کی طرف دیکھا، جو مدھم چاندنی میں بڑی ملاحت بکھیر رہا تھا۔ سارنگ کو اچانک اس کے چہرے میں اپنی محبوبہ دل نواز میراں کا چہرہ نظر آنے لگا۔ دونوں میں اسے خاصی مشابہت سی محسوس ہونے لگی۔ املی کے چہرے پر اپنی میراں کا صبیح چہرہ دیکھ کر سارنگ کے چہرے پر ایک وارفتگی چھانے لگی۔ وہ جیسے ارد گرد سے بیگانہ ہوگیا۔ ادھر املی نے...... جو پہلی بار سارنگ کو اپنے چہرے کی طرف عالم محویت میں دیکھتے ہوئے پایا تو جیسے اس کی مراد بر آئی۔ وہ سارنگ کے والہانہ پن کو اپنی ''میراث'' سمجھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر کر اسے مخمور نگاہوں سے تکنے لگی۔

سارنگ پر سرشاری طاری ہونے لگی۔ وہ خود سے بیگانہ ہو کر املی کی طرف جھکا۔

املی نیم باز آنکھوں سے اسے اپنے قریب آتا دیکھنے لگی۔ تب اس نے وفور جذبات سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ لب ترساں وا ہو گئے۔ پھر املی کو سارنگ کی عالم سرشاری میں زیرلب بولنے کی آواز سنائی دی۔ ''میراں......''

املی کے اندر چھناکا ہوا اور جیسے اس کے اندر کا تاج محل ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔ سرشاری کی جگہ اچانک رقابت کی بھڑکتی ہوئی آگ نے لے لی۔ اس نے قریب آتے سارنگ کو زور سے پرے دھکا دے دیا۔

☆======☆======☆

اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ واپس اپنی کار کی طرف لوٹی تو ایک باوردی پولیس والا فوراً اس کی طرف بڑھا اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے محترمہ...... خیریت تو ہے؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں ..... کچھ غنڈے میری گاڑی کا تعاقب کر رہے تھے۔ شاید اب ڈر کر لوٹ گئے ہیں۔" ڈاکٹر فوزیہ نے جواباً اس سے کہا۔

پولیس والے کا سینہ فخر سے پھول گیا اور جوشیلے لہجے میں بولا۔ "ہاں..... ہماری دھاک ہی کچھ ایسی ہے، آپ کہیں تو پولیس کی موبائل آپ کے ساتھ کر دوں"۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ..... میں اب خود چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ دوبارہ اپنی کار میں آ بیٹھی اور تھانے کے احاطے سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ پھر جب اس نے عقب میں اچھی طرح تسلی کر لی کہ جہاں داد کی لینڈ کروزر اس کے تعاقب میں نہیں ہے تو اس نے گاڑی بڑی شاہراہ پر موڑ دی۔

اپنی کوٹھی کے وسیع احاطے میں داخل ہونے کے بعد اس نے سکون کی سانس لی اور اندر آ گئی۔ اس نے اس کا ذکر سدھوراں سے کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ موسیٰ اس کی شدت سے منتظر تھی۔

"بیٹا..... !سدھوراں کے لیے میں نے ایک رشتہ ڈھونڈا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا..... یہ تو بڑی اچھی خبر ہے، کون ہے وہ، کیا کرتا ہے؟" ڈاکٹر فوزیہ نے پوچھا۔

"پرویز نام ہے اس کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔" موسیٰ بتانے لگی۔ "چالیس پینتالیس کے قریب عمر ہے اس کی..... پہلی بیوی سے اس کی بنی نہیں..... وہ اپنے دونوں بچے لے کر چلی گئی تھی۔ اب وہ اکیلا ہے اور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر موسیٰ..... وہ رہتا کہاں ہے..... اور پہلی بیوی اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟"

"وہ آوارہ تھی جبکہ پرویز خود ایک غیرت مند اور شریف انسان ہے۔ قیوم آباد میں اس کا اپنا دو کمروں کا گھر ہے۔"

"تجھے کسی نے یہ رشتہ بتایا ہے..... یا تو بذاتِ خود اسے جانتی ہے۔" ڈاکٹر فوزیہ نے کسی خیال کے تحت موسیٰ سے پوچھا۔

"میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں ہے۔ وہ نرسری میں ایک پہلوان دودھ، دہی والا ہے ناں..... اس کی بیوی کلثوم نے بتایا ہے، پرویز اس کے شوہر کا گہرا دوست ہے۔"

"اچھا..... تو نے پھر کلثوم کو کیا جواب دیا؟"

"ابھی تو میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچا پہلے آپ سے بات کر لوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے پر....." ڈاکٹر فوزیہ نے کہا پھر لحہ بھر توقف کے بعد کچھ سوچتے

ہوئے دوبارہ بولی۔ "میں پہلے پرویز کے ماں باپ سے ملنا چاہوں گی..... انہیں کبھی لے کر آ میرے پاس....."

"وہ جی..... اس کے ماں باپ تو گزر گئے دنیا سے..... اس بے چارے کا تو کوئی نہیں۔" موسیٰ بولی۔

"اور..... کوئی دور پرے کا رشتہ دار؟"

"نہیں جی..... اس کا کوئی نہیں اور..... بس پہلوان دودھ والے کے گھر ہی اس کا آنا جانا ہے۔"

"اچھا....." ڈاکٹر فوزیہ گومگو سے لہجے میں بولی۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی۔ "موسیٰ..... !تو نے کلثوم سے سدھوراں کے بارے میں ذکر کیا تھا، ایسا نہ ہو وہ بعد میں انکار کر دے اور بلاوجہ بدمزگی پیدا ہو اور وقت کا بھی زیاں ہو۔"

"ہاں جی..... میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق پہلے ہی ساری بات بتا دی تھی۔" موسیٰ نے کہا۔ "کلثوم بتا رہی تھی کہ پرویز بڑا نیک اور ہمدرد انسان ہے، وہ خود یہی چاہتا ہے..... کسی مجبور اور بے سہارا غریب عورت کا سہارا بنے۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔" ڈاکٹر فوزیہ یکدم خوش ہو کر بولی۔ "تو ان دونوں میاں بیوی کو پیغام دے آ جا کر کہ وہ لوگ پرویز کو لے کر کسی وقت یہاں آ جائیں۔"

"جی بہت اچھا" موسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

دو دن بعد ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی کوٹھی میں رات کے وقت ایک فون اٹینڈ کیا۔ تعارف کروانے کے بعد دوسری جانب سے ایک کھرکھراتی ہوئی جانی پہچانی آواز ابھری۔

"ہاں بابا..... جہاں داد عرض کرتا پڑا ہوں۔"

جہاں داد کی آواز سن کر ایک لمحے کو ڈاکٹر فوزیہ سن ہو کر رہ گئی مگر فوراً ہی وہ درشت لہجے میں بولی۔ "تم..... تم نے جرأت کیسے کی مجھے فون کرنے کی.....؟"

"ڈاکٹرنی صاحب..... !مجھ سے دشمنی مول لے کر تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہی ہو۔" دوسری طرف سے جہاں داد کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری تو ڈاکٹر فوزیہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تاہم وہ اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر بدستور درشت لہجے میں بولی۔

"دیکھو مسٹر..... !اگر تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی، مجھے..... دوبارہ مجھے فون کرنے کی جرأت مت کرنا۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر فوزیہ نے فون پٹخ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا۔ اس کی سانس تیز چل رہی تھی، وہ چند ثانیے ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد ٹیلیفون سیٹ پر نصب سی ایل آئی اسکرین پر جہاں داد کا نمبر پڑھنے لگی، جب اس نے اس نمبر پر ڈائل کیا تو وہ نمبر کسی پبلک بوتھ کا نکلا۔

''کیا ہوا باجی...! خیریت ہے، کس کا فون تھا؟'' سدھوراں نے قدرے تشویش سے پوچھا۔ وہ اس وقت اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی پھر سر جھٹک کر بولی۔ ''تھا کوئی پاگل...! خیر چھوڑو... آؤ میں نے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''جی باجی...!''

''آؤ بیٹھو یہاں، آرام سے...'' ڈاکٹر فوزیہ نے ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے سدھوراں کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔ سدھوراں جھکے جھکے سر کے ساتھ ڈاکٹر فوزیہ کے قریب بیٹھ گئی۔

''سدھوراں...! موسی نے ایک رشتہ دیکھا ہے، مجھے بہتر محسوس ہوا ہے۔''

جواباً سدھوراں گردن جھکائے خاموش رہی۔ شادی سے متعلق جب بھی ذکر ہوتا، سدھوراں کی آنکھوں کے سامنے جانے کیوں سانول کا چہرہ گھوم جاتا۔

''سدھوراں...! کہاں کھوئی ہو... تم نے پوچھا نہیں کون تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟'' اسے سوچ میں گم پا کر ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے پوچھا۔

سدھوراں نے قدرے چونک کر سر اٹھایا اور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو جانے کیوں فوزیہ کو سدھوراں کی اداس آنکھوں میں جلتے زخموں کی تپش محسوس ہوئی۔

''باجی...! میں نے سب کچھ اپنے خدا پر چھوڑ رکھا ہے، آپ کو رشتہ پسند ہے تو ٹھیک ہے، میں کیا پوچھوں...؟'' سدھوراں نے کہا تو اس کی آواز زخم نہاں سے بوجھل ہو رہی تھی، یاسیت بھرے غم نے اسے مروڑ کر رکھ دیا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس کی حیثیت کیا تھی، یہی کیا کم تھا کہ اس کے گناہ آلودہ وجود کو ایک شریف النفس نے سہارا دے رکھا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے ازراہِ ملائمت اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''سدھوراں! موسی نے ایک رشتہ دیکھا ہے، پرویز نام ہے اس کا۔ ہے تو پکی عمر کا مگر اچھا کھاتا کماتا ہے، پہلی بیوی سے اس کی بنی نہیں، بال بچہ بھی کوئی نہیں، دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اب، میں نے موسی سے کہا ہے کہ اسے بھی یہاں لے کر آئے۔''

''باجی! کیا اسے میرے بارے، میں سب بتا دیا گیا میرا مطلب ہے ایسا نہ ہو کہ بعد میں...!'' سدھوراں کچھ کہتے کہتے دانستہ چپ ہو گئی۔

''ہاں...! ظاہر ہے، ہم کسی کو دھوکے میں بھلا کیوں رکھیں گے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور ازراہِ تشفی مزید بولی۔ ''مجھے تو وہ شریف اور خدا ترس انسان ہی لگتا ہے جو تمہارے سارے حالات جانتے ہوئے بھی تم سے شادی کے لیے راضی ہے۔''

''ہاں باجی...! مجھے اب کوئی خدا ترس ہی اپنا سکتا ہے جبکہ میں ہمدردی کے بھی لائق نہیں۔'' سدھوراں نے غم سے چور لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ سدھوراں کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''مایوسی گناہ ہے سدھوراں...! اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کا جوڑا بنایا ہے، تمہاری قسمت میں اگر یہی شخص لکھا ہے تو تم اس کے ساتھ ضرور ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرو گی۔'' جواباً سدھوراں خاموش رہی۔

پھر ایک روز پرویز، پہلوان دودھ والے اور اس کی بیوی کلثوم کے ہمراہ آیا، موسی انہیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور صبح کے گیارہ بجے تھے، ڈاکٹر فوزیہ نے انہیں اپنے کمرے میں ہی بلا لیا تھا اور سدھوراں البتہ دوسرے کمرے میں تھی۔

دیکھنے میں پرویز بھلا مانس نظر آیا تھا، اس کی عمر پینتالیس برس رہی ہو گی، وہ قدرے سانولی رنگت اور دبتے ہوئے قد کا مگر خاصا صحت مند آدمی تھا، اس نے اجلے کپڑے پہن رکھے تھے، مونچھوں اور سر کے بال کلر کیے ہوئے لگ رہے تھے، بائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں چاندی کی قدرے موٹی انگشتری نظر آ رہی تھی۔

''لو جی بیگم صاحبہ...! لڑکا حاضر ہے، آپ نے جو اس سے پوچھنا ہے، پوچھ لیں۔'' شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے توندیل دودھ والے پہلوان جی نے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے پہلو بدلا اور پرویز سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کیا تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس لڑکی کے ساتھ تمہاری بات چل رہی ہے، وہ کس حالت میں ہے؟''

''وہ جی بیگم صاحبہ...! آپ بے فکر رہیں، میں نے اپنے یار پرویز کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'' پہلوان جی نے لقمہ دیا تو برابر میں بیٹھی اسی جیسی موٹی تازی بیوی نے شوہر کو کہنی مار کر کہا۔

''تم چپ رہو... بیگم صاحبہ خود جو پوچھ رہی ہیں۔''

''جی؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے پرویز کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے گہری سنجیدگی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے کہا۔

پرویز ہولے سے بولا۔ ''جی...... جی...... بیگم صاحبہ...... ! مجھے بھابی اور پہلوان جی نے لڑکی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''تم پھر بھی ایسی لڑکی سے شادی کرنا کیوں چاہتے ہو......؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے اچانک چبھتا ہوا سوال داغا تو بجائے پرویز کے پہلوان جی اور ان کی اہلیہ کے چہرے پر یکدم بدحواسی کے آثار پھیل گئے مگر پرویز بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

''بیگم صاحبہ...... ! اللہ تعالیٰ سب کا پردہ رکھے، دراصل شادی کرنا ایک تو میرے گھر بسانے والی مجبوری ہے، دوسرا میں خود ایک گناہگار شخص ہوں، چاہتا ہوں کسی ایسی لڑکی کو اپنی شریک حیات بناؤں جو حالات کی ستائی ہوئی ہو تاکہ کچھ ثواب کما لوں، ویسے میرا دعویٰ ہے کہ ایسی عورت آگے چل کر بہت اچھی گھریلو عورت اور خدمت گزار بیوی ثابت ہو گی۔''

ڈاکٹر فوزیہ کو پرویز کی صاف گوئی بہت پسند آئی اور وہ اس سے متاثر نظر آنے لگی۔

''ہوں...... تمہاری اپنی پہلی بیوی سے کیوں نہیں بن سکی......؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے اگلا سوال کیا۔

''جی...... ! اس میں بھی میرا ہی قصور تھا۔'' وہ جھینپ کر کر بولا۔ ''کیا کروں بیگم صاحبہ...... ! ہوٹل میں کام ہی اتنا ہوتا ہے، آپ کو تو معلوم ہے صبح پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک ہوٹل کھلا رہتا ہے، میرا اپنا ہوٹل ہے ناں جی، اس لئے نگرانی بھی خود ہی کرنی پڑتی ہے ورنہ گاہکی ٹوٹنے لگتی ہے، میں نوکروں کے حوالے تو کرنے سے رہا، نوراں کو اسی بات کی چڑ رہتی تھی۔'' اتنا بتا کر اس نے نہایت سعادت مندی سے اپنا سر جھکا لیا۔

ادھر وہ دونوں دو پہلوان مارکہ میاں، بیوی پرویز کی صاف گوئی سے پریشان نظر آ رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ اب لڑکا زبانی امتحان میں فیل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے سوچا، یہ شخص کچھ نہیں چھپا رہا اور صاف گوئی اور انکساری سے اپنے عیب بھی گنواتا جا رہا ہے، پہلی بیوی سے نبھا نہ ہونے کی وجہ بھی ڈاکٹر فوزیہ کے دل کو لگی تھی کہ اس میں پرویز کا بہرحال کوئی قصور نہ تھا، ظاہر ہے اس کا اپنا ہوٹل تھا اور وہ خود محنت کرتا تھا، کام سے جی تو نہیں چراتا تھا، بعض بیویاں چاہتی ہیں کہ ان کا مرد ان کے گھٹنوں سے بندھا رہے۔

رسمی گفتگو کے بعد ڈاکٹر فوزیہ نے رضامندی ظاہر کر دی اور پھر ایک دو روز کے بعد

سدھوراں اور پرویز کو بھی آمنے سامنے کر دیا پھر اس کے بعد شادی کی تاریخ طے پا گئی۔

سدھوراں کی پرویز سے نسبت طے کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی، موسیٰ نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

☆======☆======☆

ملوکاں کو اپنے چچری بھائی خالقو سے اسی دن سے نفرت ہوگئی تھی جس دن وہ اس کی شادی کی بات کسی آچر خان نامی بڈھے سے روپوں کے لالچ میں طے کرنا چاہتا تھا مگر وہ خوش بھی تھی کہ اس کے باپ نے لالچی خالقو کو خوب کھری کھری سنائی تھیں لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ملوکاں کے سینے میں اندیشوں کے سنپولیے بھی کلبلانے لگے تھے اور اس بانکے سجیلے نوجوان سانول کا حسین تصور اسے بے چین سا کرنے لگا، دن بھی تو بہت گزر رہے تھے اسے دیکھے ہوئے، وہ دل ہی دل میں اس سے شکوہ کرنے لگی۔ ایسی بھی کیا بے مروتی، دوبارہ آیا ہی نہیں، ٹھیک ہے میں ہی مل آتی ہوں۔ اس نے دل میں تہیہ کیا اور پھر ایک روز وہ پاس کی نہر سے پانی بھرنے گئی تو اس نے ایک بوڑھے سے بیل گاڑی والے کو دیکھا، وہ سوکھی گھاس لادے اس طرف ہی جا رہا تھا جدھر سانول کے ماما اللہ رکھیو کا گھر تھا، دونوں گوٹھ آپس میں رلے ملے ہوئے تھے بس درمیان میں چاولوں، جوار، باجرے کے کھیت تھے، بیل گاڑی والے بابے کو چاچا سائیں کا لقب دے کر وہ خالی گھڑے سمیت اس پر سوار ہوگئی، وہ جانتی تھی اس کا باپ اب شام گئے ہی لوٹے گا، ماں تو اس کی ویسے ہی سہیلی تھی، بھائی خالقو رات کو ہی اپنا چہرہ کھاتا تھا، وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ محبوب کے قریب پہنچ کر بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر اتری اور ہاتھ ہلا کر گاڑی بان کا شکریہ ادا کیا، وہ مسکراتا ہوا آگے ہوگیا۔

یہ کچے گھروں کی ٹیڑھی میڑھی سی گلی تھی، محبوب کی گلی پہنچ کر ملوکاں کا دل میٹھی میٹھی چٹکیاں لینے لگا، تین گھر چھوڑ کر سانول کے ماما اللہ رکھیو کا گھر تھا، گلی ویران تھی، وہ خالی مٹکا پہلو سے ٹکائے ہوئے مٹک مٹک کر آگے بڑھ رہی تھی، مٹکا رکھنے کا اینڈوا اس نے سر پر ہی رہنے دیا تھا، دوسرے ہی لمحے وہ محبوب کے دروازے پر تھی، اس نے اپنے بے طرح دھڑکتے دل پر مقدور بھر قابو پاتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔

وہ دل میں یہی دعا مانگنے لگی کہ سانول گھر پر ہی ہو لیکن اندر سے کوئی آواز نہ ابھری، اس نے اس بار ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو تب کہیں جا کر اندر کسی کوٹھری سے نحیف سی آواز آئی سنائی دی۔ ''کون ہے...... اندر آ جاؤ...... دروازہ کھلا ہے۔''

ملوکاں پہلے تو اس کمزور سی آواز کو پہچان ہی نہ پائی پھر دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چونکی، اندر کوئی بری طرح کھانس رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بیمار پڑا ہو، ملوکاں کے چہرے کے تاثرات متغیر ہوگئے، وہ فوراً دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوگئی، کچا صحن ویران پڑا تھا، سامنے کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا، اندر ایک کھری چارپائی پر اسے کوئی لیٹا ہوا دکھائی دیا، ملوکاں گھڑا کچے فرش پر رکھ کے بے تابانہ آگے بڑھی، کوٹھری میں داخل ہوتے ہی وہ دھک سے رہ گئی، کھری چارپائی پر سانول نڈھال سا لیٹا ہوا تھا، وہ کافی کمزور نظر آ رہا تھا، اس تنگ و تاریک کوٹھری میں عجیب سی گھٹن آمیز بو پھیلی ہوئی تھی، سانول ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اس نے ملوکاں کو اپنی نیم وا آنکھیں کھول کر دیکھ لیا تھا۔

''ہائے ڑے سانولے...... ! تیرے کو کیا ہوگیا یہ، تُو نے اڑیں کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' ملوکاں کرب سے تڑپ اٹھی۔ وہ اس کے قریب چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ چکی تھی اور اس نے جب اپنا ایک ہاتھ سانول کی پیشانی پر رکھا تو اس کی پریشان کن تشویش مزید بڑھنے لگی۔ ''اڑے تیرے کو تو بڑا تیز بخار ہے...... ڑے کب سے تو بیمار پڑا ہے؟'' اس نے تفکر بھرے لہجے میں کہا۔ اپنے محبوب کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس کی سرمگیں آنکھیں نمناک ہونے لگی تھیں۔

''تت...... تت تُو ادھر کیوں آئی ہے، تیرا اب یہاں کیا کام، جا جا چلی جا واپس اڑیں گھر......'' سانول نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا تو ملوکاں کو محبوب کی یہ بے مروتی گھائل کرنے لگی لیکن وہ اسے کوئی اہمیت دیئے بغیر اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''کیوں ڑے اتنا کٹھور کیوں بنتا ہے...... ماما کدھر ہے، کیا تُو نے کوئی دوا دارو لی ہے......؟''

''ماما کام پر گیا ہے، دوا لایا تھا میں حکیم سے، کھا رہا ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گا، پر تُو جا یہاں سے......'' سانول نے پھر اسے دھتکارا۔

ملوکاں بھی ایک ہٹیلی تھی، وہ اسے سنگدل محبوب کی ایک ادائے بے رخی پر محمول کرتے ہوئے اپنے مخصوص ضدی لہجے میں بولی۔ ''نہیں...... میں ایسے نہیں جاؤں گی، چل تیرے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں، وہ تیرے کو جب تک سوئی نہیں لگائے گا، تیرا بخار ٹھیک نہ ہو گا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سانول کو اچانک کھانسی کا شدید دورہ پڑا، ملوکاں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قریب ہی اسے پانی کی صراحی جس پر جست کا گلاس اوندھا دھرا تھا، نظر آئی، اس نے جلدی سے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ سانول کی کھری چار پائی کے قریب آ کر اسے ایک ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے اٹھایا پھر گلاس اس کے لرزتے ہونٹوں سے لگا دیا، چند گھونٹ پانی کے پینے کے بعد سانول کو سکون ملا۔

"کیا یہ ملوکاں کی قربت کا اثر ہے.....؟" اس نے پہلی بار چور دل سے سوچا مگر پھر اس کے اندر صحرا کی بادِ سموم چلنے لگی۔

"تیری کوئی دوا دارو بھی رکھی ہوئی ہے یا نہیں؟" اچانک ملوکاں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"حکیم جی نے دی تھی، ختم ہوگئی۔" سانول نے نحیف سی آواز میں کہا۔

ملوکاں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، اسے اب ماما اللہ رکھیو پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "دوا ختم ہوگئی تھی تو اور لانی تھی، کیوں نہیں لائے..... اچھا چل چھوڑ، اللہ بہتر کرے گا، میں جا کر کسی ڈاکٹر، حکیم کو دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی۔

سانول نے اسے کمزور سی آواز میں پکارا۔ "ملوکاں.....! تُو کیوں مجھ بیمار کو تنگ کرنے آ گئی ہے، تیرے کو اللہ کا واسطہ تو یہاں سے چلی جا چلی جا..... یہاں سے....." یہ کہتے ہوئے سانول کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔

ملوکاں کا دل اپنے محبوب کی بے رخی پر کٹ کر رہ گیا، وہ پلٹ کر سانول کی طرف بڑھی اور فرش پر رکھا پانی سے بھرا گلاس اٹھا لیا پھر جب اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے سہارا دینے کی غرض سے چھوا تو سانول نے بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا، پانی کا گلاس ملوکاں کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

سانول کھانسی کے درمیانی وقفے کے درمیان دوبارہ اس سے غصیلے لہجے میں بولا۔
"جا چلی جا یہاں سے..... اور ادھر کبھی مت آنا..... جا....."

ملوکاں دل مسوس کر رہ گئی پھر کوٹھری سے باہر صحن میں آ کر سسک سسک کر رونے لگی، اس نے اپنی چادر سے آنسو پونچھے اور جب قریب رکھے اپنے گھڑے کو اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی تو اچانک دروازہ کھلا، وہ ٹھٹک کر رکی، سامنے ماما اللہ رکھیو کھڑا اس کے آنسو بھرے چہرے کو حیرت سے تکنے لگا۔

"دھیئے.....! تُو یہاں..... خیر تو ہے.....؟" وہ حیرت سے اس کے چہرے کو تکتا ہوا

اندر داخل ہو کر بولا۔

"ماما.....! وہ..... وہ اندر سانول کو تو بہت تیز تاپ (بخار) چڑھا ہوا ہے، کوئی دوا بھی نہیں ہے۔" ملوکاں نے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

ماما اللہ رکھیو بغور اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ تکنے لگا، اس کی باراں دیدگی نے ملوکاں کی چشمِ تر کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ آنسو کسی تعلق خاطر ہی کے غماز ہیں۔ بہر طور وہ ملوکاں کے سر پر اپنا دستِ شفقت دھرتے ہوئے بولا۔ "دھیئے! میں اس کی دوائی ہی لینے گیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض کی جیب سے تھیلی میں لپٹی چند پڑیاں نکالیں اور دوسری جیب سے ایک چھوٹی سی دوا کی بوتل بھی۔

"ماما! حکیم کی دوائی سے تو لگتا ہے سانول کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، تو اس کو کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتا، اسے سوئی کے بغیر آرام نہیں آئے گا۔" ملوکاں نے قدرے تفکر سے کہا۔

ماما اللہ رکھیو سر ہلاتا ہوا اندر کوٹھری کی طرف چلا گیا، ملوکاں وہیں کھڑی رہی، چند لمحوں بعد ماما اللہ رکھیو اس کے قریب آیا، ملوکاں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، ماما کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات چھائے ہوئے تھے، ملوکاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو، کوئی گہری بات.....!

"دھیئے.....! تُو ایک سمجھدار چھوکری ہے، میری بات کا برا نہیں منائے گی۔" وہ کہنے لگا۔ "تیرا اس طرح اکیلے اِدھر آنا اچھا نہیں، تیرے ماں، پیو ہوتے تیرے ساتھ تو اور بات تھی۔"

وہ خاموش ہوا تو ملوکاں نے ایک نظر ماما کے چہرے پر ڈالی پھر خاموشی سے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

تب پھر ماما اللہ رکھیو نے اس کے سر پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا۔ "دھیئے.....! میں سمجھ رہا ہوں تیرا دکھ، تُو مجھے اچھی لگتی ہے بالکل دھیوں کی طرح..... تُو فکر نہ کریں میں سانول کو سمجھا دوں گا اور میں کوشش کروں گا کہ تیرے ماں، پیو سے بھی آ کر ایک ملاقات کروں۔"

ماما کی بات سن کر ملوکاں کا دل زور سے دھڑکا، اس نے دیپ جلی آنکھوں سے ماما کے چہرے کی طرف دیکھا پھر موہوم سی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ لوٹ گئی۔

ملوکاں چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے دل کا راز ماما تک پہنچ جائے، وہ خود بعد کے حالات سنبھال لے گی۔ درحقیقت ملوکاں نے جب سے اپنے لالچی اور خود غرض بھائی خان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے خطرناک ارادے جان لئے تھے، وہ پریشان ہوگئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سانول کی دلہن بن جائے مگر چونکہ وہ ایک شریف لڑکی تھی اسی لئے خود سے کبھی بھی اپنے دل کا حال نوکِ زباں پر نہیں لاسکتی تاہم اب وہ خوش تھی کہ اس کے حالِ دل سے ماما اللہ رکھی واقف ہوگیا تھا لیکن پھر جب وہ سانول کی بے اعتنائی محسوس کرتی تو اس کا دل کٹ کر رہ جاتا۔

بہر طور ملوکاں آس و نراس کی کیفیت میں غاطاں نہر پر پہنچی، گھڑا پانی سے لبالب بھر کر پرانے کپڑوں کی دھجیوں اور کترنوں سے بنایا ہوا اینڈوا سر پر رکھا اور منکا اس پر دھر کر اپنے گھر کی طرف ہولی۔ نہر سے اس کے گھر کا فاصلہ زیادہ دور نہ تھا، آس پاس چاول، جوار اور باجرے کے کھیتوں کا سلسلہ تھا، نہر ان سلسلوں سے نصف فاصلے پر تھی جدھر کیکر اور آسریں کے درختوں کے جھنڈ تھے، یہاں سے پتلی بل کھاتی پگڈنڈی سامنے کچے گھروں کی طرف جاتی تھی، ملوکاں اسی پر چلی جارہی تھی، پگڈنڈی کے اختتام پر گھنی جھاڑیوں اور ڈھینگروں کا سلسلہ تھا۔

پھر جیسے ہی ملوکاں نے ایک موڑ کاٹا تو اسے سامنے سے ایک شخص آتا دکھائی دیا، ملوکاں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنے راستے پر چلتی رہی البتہ وہ شخص ملوکاں کو دیکھ کر ایک دم ٹھٹک کر رکا پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا، ملوکاں ٹھٹک کر رک گئی۔

☆======☆======☆

دھکا لگنے سے سارنگ جیسے اچانک ہوش میں آگیا، میراں کا دلکش چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے محو ہو چکا تھا بلکہ اب اس کی جگہ املی کا غصیلا چہرہ نظر آرہا تھا، وہ بپھرا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا، املی اسے بدستور تند خو نظروں سے گھورے جارہی تھی، بیچارہ سارنگ سمجھا شاید اس سے میراں کے دھوکے میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے جبکہ صورت حال اس کے برعکس تھی، املی تو خود اس کی طرف مائل تھی لیکن سارنگ کے ہونٹوں سے بے اختیار میراں کا نام نکلتے ہی املی کا وجود رقابت کی آگ سے بھر گیا تھا۔

''یہ میراں کون ہے رے جس کا ابھی تُو نے نام لیا......؟'' وہ اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر ٹکائے جارحانہ انداز میں سارنگ کو گھورتے ہوئے بولی تو سارنگ کو صورت حال کی نزاکت کا علم ہوا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا، اب چھپانا بے سود تھا چنانچہ سارنگ نے ایک گہری سانس لے کر اسے بتادیا کہ میراں اس کی منگیتر تھی اور وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

یہ سننے کی دیر تھی کہ املی زخمی ناگن کی طرح اس پر جھپٹی اور اس کا گریبان جھنجھوڑ کر زہرناک لہجے میں بولی۔ ''اگر تو اس سے پریم کرتا تھا تو مجھ سے تو نے کیوں چھل بما (دھوکا) کیا......؟''

''میں نے تیرے ساتھ کوئی چھل فریب نہیں کیا، تُو تو خود میرے گلے کا ہار بنی ہے۔'' سارنگ نے رکھائی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔ املی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، اس نے طیش میں آکر سارنگ کے چہرے پر تھپڑ رسید کرنا چاہا تو سارنگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نفرت سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے غصے سے غرا کر بولا۔ ''اپنی اوقات میں رہ چھوکری......! ورنہ تجھے مزہ چکھادوں گا۔''

''تُو مجھے کیا مزہ چکھائے گا، فریبی انسان......! مزہ تو میں تجھے چکھاؤں گی۔'' املی اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑاتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ ''میں نے...... میں نے تیری کھاتر (خاطر) اپنے باپو کو ہلاک کیا اور تیری مدد کے لئے یہاں تک آئی......اور تُو نے...... تو نے......!'' وہ غصے سے ہانپنے لگی۔

''میں نے تو تجھے نہیں کہا تھا کہ تُو اپنے باپو کو قتل کردے اور میرے ساتھ چل پڑ، تُو تو خود اپنے سوتیلے باپو پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔'' سارنگ نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔

املی چند ثانیے سارنگ کو قہرناک نگاہوں سے گھورتی رہی پھر مخاصمانہ لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے، پر میں دیکھتی ہوں تو کس طرح سرحد پار کرکے گاتریا تک پہنچتا ہے۔''

اس کی دھمکی پر سارنگ کو بھی غصہ آگیا اور آنکھوں میں اس کی معاندانہ چمک تیر کر آئی، وہ دانت پیستے ہوئے اس پر جھپٹا اور اس کی نازک گردن دبوچ کر خونخوار لہجے میں بولا۔ ''دیکھ چھوکری......! اگر تُو نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا سمجھی......! جا اب بھی وقت ہے، لوٹ جا واپس اپنے گھر کی طرف......!''

اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ اگلے ہی لمحے جب سارنگ نے اس کی پتلی سی گردن چھوڑی تو املی نے بھل بھل آنسو بہانے شروع کردیے، اب سارنگ کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ وہ بہر حال فطرتاً ایک نرم دل انسان تھا تاہم وہ چپ چاپ کھڑا املی کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔

رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی، چاند کی طلسماتی روشنی میں لق و دق صحرا بڑا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پراسرار منظر پیش کر رہا تھا، ہر سو ویرانی مسلط تھی، املی نے اب تک رونا بند نہیں کیا تھا، اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے روئے چلی جارہی تھی، اگرچہ سارنگ کو ایک طرف املی پر ترس آرہا تھا تو دوسری طرف وہ اس سے خائف بھی ہونے لگا تھا، اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ املی اس کے لیے کسی بھی وقت مصیبت کھڑی کر سکتی ہے، اس کے یہ آنسو مگرمچھ کے آنسو بھی ہو سکتے تھے، اس نے یکدم اپنی کینچلی بدلنے کی کوشش کی ہے اور موقع ملتے ہی اسے ڈس لے گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ وہ اس چنڈالنی کو ادھر ہی روتا چھوڑ کر آگے نکل جائے یہ سوچ کر وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک عقب سے اسے املی کی روہانسی آواز سنائی دی۔" سارنگ......! رک جا...... میں آرہی ہوں۔"

لیکن سارنگ نہیں رکا، وہ بدستور مدہم چاندنی میں ریت پر آگے بڑھتا رہا، اتنے میں املی بھی دوڑتی ہوئی اس کا راستہ روک کے کھڑی ہوگئی اور آنسوؤں بھرے چہرے کے ساتھ ملتجیانہ لہجے میں اس سے بولی۔" سارنگ......! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل، بیشک مجھے اپنی باندی بنالینا، پر مجھے اکیلا نہ کر کے جا، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

مگر سارنگ رکا نہیں اور کوئی جواب دیئے بغیر برابر آگے بڑھتا رہا، املی بھی گرتی پڑتی اس کے ساتھ ہولی اور بدستور گڑگڑانے لگی۔

" سارنگ......! میں نے...... میں نے غصے میں تجھے جانے کیا کچھ کہہ ڈالا دیکھ...... دیکھ مجھے معاف کر دے...... میں قسم کھاتی ہوں کہ تیرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی۔"

اس کی بات سن کر اچانک سارنگ چند لمحے رک کر اس کے چہرے کو گھورتا رہا پھر درشت لہجے میں بولا۔" تو نے اگر میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا سمجھی......؟" یہ کہہ کر سارنگ آگے بڑھ گیا۔ املی اس کے عقب میں چلی آرہی تھی۔

صبح دم وہ سرحد کے قریب کولہی قبیلے کی بستی کے قریب پہنچ گئے، یہ بستی تقریباً دو درجن نفوس پر مشتمل تھی، بچوں اور عورتوں نے خالص تھری طرز کے لباس زیب تن کر رکھے تھے عورتوں اور لڑکیوں کے رنگ کھلتے ہوئے تھے مگر مرد ان کے دبلے پتلے اور خاکستری رنگوں کے تھے، وہ ان دونوں کو حیرت سے دیکھنے لگے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا، ان کے قبیلے میں انہی کی طرح دیگر خانہ بدوش بھی تھے۔

سارنگ اور املی نے خود کو میاں، بیوی ظاہر کیا تھا، نیز اپنے متعلق یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں راستہ بھٹک کر ادھر آنکلے ہیں اور درحقیقت ان کا تعلق سرحد پار کے علاقے سے تھا، وہ خود بھی پوندے ہی تھے۔

بستی کے لوگ اسے مکھیا (سردار) کے پاس لئے گئے جو ایک خاصے بڑے سرکنڈوں کے جھونپڑے میں اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ رہتا تھا، اس کا نام مکھڑوں کولہی تھا، وہ ایک موٹا تازہ اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا، رنگ الٹے توے کی طرح سیاہ تھا، گینڈے جیسی موٹی سی گردن تھی اور سر انڈے کے چھلکے کی طرح بالوں سے بے نیاز تھا، کانوں میں بالے جھول رہے تھے، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور ان میں ایک خاص قسم کی چمک ہلکورے لے رہی تھی، اس کے گینڈے جیسے جسم پر صرف ایک کھلے بٹنوں والی واسکٹ اور کھلے پائنچوں والی گھیردار شلوار تھی، سارنگ کو پہلی نظر میں یہ شخص کسی بستی کے مکھیا کی بجائے صحرائی لٹیروں کا سردار محسوس ہوا، وہ چند ثانیے گھورتی ہوئی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں بالخصوص املی کے چہرے پر جم گئیں، دوسرے ہی لمحے وہ ایک سنسناتی ہوئی سانس بھرتے ہوئے بیک وقت دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے گونجدار آواز بولا۔" تم دونوں کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟" اسے شاید ابھی تک ان کے بارے میں پوری طرح آگاہ نہیں کیا گیا تھا یا پھر کسی اور مقصد کے تحت ان سے براہ راست معلومات چاہتا تھا۔

" ہم دونوں میاں، بیوی ہیں ادھر سرحد پار (راجستھان) کے ایک پوردائی (گوٹھ) "گدا" سے بھٹک کر یہاں آنکلے ہیں۔" سارنگ نے مقدور بھر اپنا لہجہ بنجاروں جیسا بنانے کی کوشش کی تھی۔ راجستھان اور تھر میں ویسے ہی بنجاروں کی بہتات تھی اور سارنگ ان کے بیچ رہا تھا، سندھ میں آباد ہونے والے زیادہ تر بنجاروں کو سندھی آتی تھی۔ یہی حال راجستھان کے بنجاروں کا تھا، انہیں بھی سندھی آتی تھی یہی وجہ تھی کہ مکھڑوں کولہی کو سارنگ کی باتوں پر شبہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے پھر رہی سہی کسر املی کی بنجاروں والی وضع قطع نے پوری کر دی۔

" سائیں......! ہم دوبارہ واپس اپنی دھرتی پر جانا چاہتے ہیں، اگر ہمیں ہماری دھرتی پر پہنچا دیا جائے۔" سارنگ نے جلدی سے ہاتھ جوڑ کر دوبارہ ملتجیانہ لہجے میں اسے کہا۔

" تیرا نام کیا ہے رے......؟" مکھڑوں کولہی نے سارنگ سے اس کا نام پوچھا۔

" میرا نام ہاتو ہے اور...... اور یہ میری پتنی شرمادیوی ہے۔" سارنگ نے اپنا اور املی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا غلط نام بتاتے ہوئے کہا۔

''ہوں ...... !'' مکھیا نے ایک بار پھر ان دونوں کو برماتی نظروں سے گھورتے ہوئے گونجیلی آواز میں کہا۔ ''سرحد پار اب تمہارا لوٹنا بہت مشکل ہے ...... لیکن ناممکن نہیں ...... تم دونوں ابھی ہمارے مہمان بن کر رہو، بعد میں کچھ سوچیں گے۔''

سارنگ بے چین سا ہو گیا پھر اپنے چہرے پر پریشانی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''مکھیا جی ...... ! تیری بڑی مہربانی مگر ادھر میرے ماتا پتا میری بڑی چنتا کر رہے ہوں گے، اگر ہم دونوں کو جلدی سرحد پار پہنچا دو تو تیرا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔''

اس کی بات سن کر مکھڑوں کو لبی ایک لمحے کو آنکھیں سیکڑ کر سارنگ کے چہرے کو گھورتا رہا پھر وہ بیل جیسا اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ...... اچھا ...... ! ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں ...... کرتے ہیں کچھ تمہارے لئے۔''

سارنگ کو تسلی ہو گئی پھر ان دونوں کو جھونپڑی کے ایک مہمان گوشے میں جگہ دے دی گئی۔ ان دونوں کو بکری کا تازہ دودھ اور مکھن چپڑی جوار کی روٹی اور ساگ دیا گیا، تھوڑے ابلے ہوئے چاول بھی تھے، ان دونوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا، اس کے بعد انہیں پیالوں میں چائے دی گئی، سارنگ ان بنجاروں کا رہن سہن دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ بیشک یہ خانہ بدوش تھے مگر جہاں بھی ڈیرا ڈالتے تھے، پورے آرام و سکون سے رہتے تھے اور ضرورت کی ہر شے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شکم سیر ہوتے ہی سارنگ اور املی کو نیند نے آلیا، چارپائیوں کا کوئی تصور نہ تھا البتہ فرش پر تین چار رلیوں کو جوڑ کر دری سی بنائی ہوئی تھی، دو تین میلے سے بوسیدہ تکیے بھی دھرے تھے، دونوں ذرا ذرا فاصلے پر لیٹتے ہی بے سدھ ہو کر گہری نیند میں ڈوب گئے۔

☆======☆======☆

سدھوراں اور پرویز کا بڑی سادگی سے نکاح پڑھوا دیا گیا۔ سدھوراں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا اور یہ بھی درست تھا کہ اس نے اپنے ہونے والے بچے کی خاطر ہی پرویز سے شادی کرنا گوارا کیا تھا، وہ اپنے کرتوت کی سزا اس معصوم کو نہیں دینا چاہتی تھی ورنہ اس کے دل و دماغ میں ابھی تک اپنے محبوب سانول کی شبیہ بسی ہوئی تھی۔ سدھوراں کا خیال تھا کہ وہ گھر بار میں مصروف ہو جائے گی تو سانول کو فراموش کر دے گی مگر پرویز سے شادی کے بعد تو سانول کا خیال اسے مزید پریشان کرنے لگا تھا، سانول کو فراموش کرنا اب اس

کے اختیار میں نہ رہا تھا۔

بہر طور پر پرویز اسے دلہن بنا کر اپنی قیوم آباد والی رہائش گاہ میں لے آیا، ڈاکٹر فوزیہ نے سدھوراں کے منع کرنے کے باوجود اسے چند تولے سونے کا زیور بھی بنا کر دیا تھا اور جہیز بھی دیا تھا جو ایک سوزوکی ڈین میں لادا گیا تھا، موسیٰ، سدھوراں کے ساتھ گئی تھی جو گھنٹے دو گھنٹے بعد لوٹ آئی تھی۔

سدھوراں اپنے شوہر پرویز کے ساتھ شام 9 بجے کے قریب اس کے گھر پہنچی، وہ دو کمروں کا ایک عام سا گھر تھا، ہر شے ابتر حالت میں تھی، موسیٰ نے ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہنے کا حق ادا کرتے ہوئے گھر کی حالت قدرے بہتر کر دی تھی پھر جہیز کا سامان ترتیب وار رکھا گیا، سدھوراں نے محسوس کیا تھا کہ پرویز کا گھر بالکل خالی خالی سا تھا، اس کے جہیز کا سامان رکھتے ہی خالی گھر اب بھرا بھرا محسوس ہونے لگا تھا۔

حجلۂ عروسی کے نام پر ایک کمرے کو پہلے ہی سے سجا رکھا تھا، سدھوراں اکیلے کامدار دلہنوں والے ریشمی سوٹ میں بڑی سی پلنگ نما چارپائی پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی، اداس چاند کی مثل ......!

رات گیارہ بجے کے قریب پرویز چند مہمانوں اور دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد صحن کے دروازے کو کنڈی چڑھانے گیا تھا۔ سدھوراں بت بنی پلنگڑیا پر بیٹھی تھی، نئی نویلی دلہنوں والے ارمانوں سے بے نیاز ...... نہ اس کی سماعتیں اپنے مجازی خدا کی چاپ سننے کے لیے بے چین تھیں اور نہ دل میں بے طرح دھڑکن تھی، نہ اس کی اداس آنکھوں کی جھیل میں اپنے مجازی خدا کی آمد کے منتظر کنول کھلے تھے اور نہ ہی اس کے حنائی لبوں پر دلہنوں والی ہلکی سی مسکان تھی، جوان وجود میں کوئی ہلچل نہ تھی، وہ زندہ لاش کی مثل بیٹھی تھی۔

کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی، دروازہ بھڑا ہوا تھا، سدھوراں کا سر جھکا ہوا تھا۔ دفعتاً قدموں کی چاپ ابھری مگر سدھوراں کے اندر کوئی ہلچل نہ تھی پھر کوئی اس کے قریب آ کر چارپائی پر دھنس سا گیا، دلہنوں والا تقاضا نبھانا مقصود تھا اسی لئے سدھوراں نے اپنا سر جھکا رہنے دیا تھا تب کوئی ہولے سے کھنکارا پھر اپنے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی، سدھوراں بہر حال مشرقی عورت تھی، اس کا چہرہ اٹھا تو پلکیں جھک گئیں پھر اسی لمحے بھاری کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''تُو واقعی بہت کھوب صورت ہے، تیرا چاند چہرہ دیکھ کے تو میں جیسے جوان ہو گیا ہوں۔'' سدھوراں کی جگہ کوئی اور دلہن ہوتی تو اپنے مجازی خدا کے محبت انگیز یہ الفاظ اس کے نازک وجود کو گرما دیتے اور دل دھڑکنے لگتا مگر سدھوراں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موئن جودڑو کے اداس کھنڈر کی طرح بے تاثر اور خاموش بیٹھی رہی۔

اس کی اداسی گرگ باراں دیدہ پرویز نے فوراً بھانپ لی۔ وہ بولا۔ ''دیکھ! یہ بے شک تجھ سے عمر میں بڑا ہوں مگر تجھ سے محبت کرتا رہوں گا اور تیرا پورا خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بولے جارہا تھا۔ سدھوراں کو احساس ہوا پرویز ایک بھلا آدمی ہے اگرچہ اس کی خاموش اداسی سے غلط فہمی ہو رہی تھی، وہ سوچنے لگی، یہ کیا عجیب انسان ہے اپنے عیب گنوا رہا ہے اور میرا اتنا بڑا عیب یکسر فراموش کر رہا ہے تب سدھوراں نے فیصلہ کیا کہ ایسے فرشتہ صفت انسان کے ساتھ ''دل داری'' نہ کرنا گناہ عظیم ہے اور تب وہ قدرے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''یہ بات نہیں...... بس ویسے ہی ماں، پیو یاد آرہے تھے۔'' اس نے بہانہ تراشا۔ پرویز کا جیسے دل خوش ہو گیا، سدھوراں کا خیال تھا کہ پرویز اس سے ہونے والے بچے کے بارے میں ضرور پوچھ تاچھ کرے گا مگر اس نے ایسا کوئی ذکر نہ چھیڑا۔ بالآخر سدھوراں نے ہی ذرا جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''ایک بات بتاؤ گے......؟''

''ہاں...... ہاں...... ! پوچھ کیوں نہیں......'' وہ خوشی سے بولا۔ وہ اس قدر حسین اور جوان دلہن پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

''تُو نے میرے سے شادی کیوں کی...... تجھے پتہ بھی تھا کہ میں ایک بچے کی......!''

''سدھوراں ......! آج کے بعد مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کرنا۔'' پرویز ایک دم مصنوعی خفگی سے بولا مگر پھر دوسرے ہی لمحے لہجے کو نرم کر کے بولا۔ ''سدھوراں......! تُو مجھ سے ایک وعدہ کر کہ پچھلی تمام باتیں بھول جائے گی...... کر وعدہ......!''

سدھوراں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

''نہیں ......! منہ سے بول۔'' اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''وعدہ...... پھر میری ایک آخری بات کی تسلی کر دے۔''

''ہاں بتا......!''

''تُو میرے ہونے والے بچے کو اپنا نام دے گا نا......؟''

جواباً کمرے کے محدود ماحول میں خاموشی سی چھا گئی، سدھوراں کے اندر وسوسوں کے خوابیدہ سنپولے بیدار ہو کر اسے ڈسنے لگے، سدھوراں کی نگاہیں پرویز کے گم صم چہرے پر جمی ہوئی تھیں، وہ بڑی بے چینی سے اس کی بات سننے کی منتظر تھی۔

''دیکھ سدھوراں......! میری طرح تیرے کو بھی حقیقت پسند ہونا پڑے گا۔'' اچانک پرویز سنجیدہ لہجے میں بولا تو جانے کیوں سدھوراں اس کے ایکا ایکی بدلے بدلے سے لہجے پر بے چین سی ہو گئی اور بدستور مستفسرانہ نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

''دیکھ سدھوراں......! بے شک تُو ایک جوان لڑکی ہے مگر تیرے عیب نے تجھے ایسے داغدار کر دیا ہے جیسے روشن چاند کے دامن میں بدنما گڑھا آتا ہے، ہم دونوں کی شادی بے شک ہم دونوں کی ضرورت سہی مگر ہمیں ضرورت سے زیادہ ایک سمجھوتے کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔'' وہ اتنا کہہ کر تھما۔ سدھوراں اس کا چہرہ تکنے لگی، اسے اب اس کی باتیں عجیب سی محسوس ہو رہی تھیں اور اس کا رویہ اچانک ہی بدل گیا تھا۔

''سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں اپنے مفاد کی بھینٹ پر ایک مجبور عورت کو چڑھانے والے۔'' اس نے تلخی سے سوچا مگر چپ رہی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''ہماری زندگی بھی کچھ لو اور دو کے ساتھ ہی نبھ سکتی ہے۔'' وہ بولا۔ اور سدھوراں نے حیرت سے سوچا۔ ''یہ اس سے کیا لینا چاہتا ہے؟''

''اس طرح ہماری زندگی بھی ہنسی خوشی گزرے گی، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ تُو نے مجھ سے شادی ہی اس لئے کی ہے کہ تجھے باعزت زندگی گزارنے کا موقع ملے اور سب سے اہم بات یہ کہ تیرے ہونے والے بچے کو باپ کا نام ملے، معاف کرنا کچی بات شروع میں بری لگتی ہے مگر اس کے نتائج برے نہیں ہوتے، تیرے کو میں یہ کڑوے گھونٹ اس لئے پلا رہا ہوں تاکہ بعد میں تُو میرے ساتھ اور اپنے ہونے والے بچے کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارے۔'' وہ گہرے لہجے میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

سدھوراں کے دل و دماغ میں مہیب سناٹوں کی سائیں سائیں گونجنے لگی اور پھر اس نے بے اختیار پوچھا۔ ''تت...... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے جو کچھ چاہتا ہوں، وہ میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔'' پرویز نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور خاموش ہو گیا۔ سدھوراں بری طرح الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

سدھوراں کو بیاہ کر رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹر فوزیہ اب خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی مگر جہاں داد کے فون نے اسے بے چین ضرور کر دیا تھا، اسے اس بات کی بھی حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا جہاں داد کو اس کے فون نمبر کا کیوں کر پتہ چلا تھا پھر اس نے سوچا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی، آخر کو وہ ایک مشہور سرجن کی بیٹی تھی اور خود بھی ڈاکٹر تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ اگر جہاں داد نے اس کا فون نمبر کسی طرح حاصل کر لیا تھا تو یقیناً اس کی کوٹھی کا پتہ بھی جانتا ہوگا، وہ اب محتاط ہو کر رہنا چاہتی تھی اور اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ اگر جہاں داد نے اسے مزید تنگ کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوا دے گی۔

سدھوراں کو رخصت کیے کئی روز بیت چکے تھے، پہلوان دودھ والے کی بیوی اب ڈاکٹر فوزیہ کے پاس آنے جانے لگی تھی، اس کے ذریعے اسے سدھوراں کی خیریت ملتی رہتی تھی البتہ ڈاکٹر فوزیہ، موسیٰ کو بھی چند تحفے تحائف دے کر اسے پرویز کے گھر بھیجتی تھی، بہرطور ڈاکٹر فوزیہ اب سدھوراں کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر تھی۔

ایک روز ڈاکٹر فوزیہ نے فون اٹینڈ کیا۔

''جہاں داد بول رہا ہوں ڈاکٹرنی صاحبہ!'' دوسری طرف سے ایک کرخت آواز ابھری۔

''تم..... تم نے مجھے دوبارہ فون کرنے کی جرأت کیسے کی؟'' آواز پہچان کر فوزیہ نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔

''ابھی صرف زبانی کلامی جرأت کی ہے۔'' دوسری طرف سے جہانداد کی زہریلی آواز ابھری۔ ''اگر تم نے مجھے سدھوراں کا پتہ نہیں بتایا تو میں ایسی جرأت کر ڈالوں گا کہ ساری زندگی پچھتاتی رہو گی۔''

''یو شٹ اپ.....!'' ڈاکٹر فوزیہ غصے سے دھاڑی۔ اس وقت وہ تنہا تھی، اس کے مما، پاپا ابھی کلینک سے نہیں لوٹے تھے، موسیٰ بھی کہیں کام سے گئی ہوئی تھی۔

''آں..... نا بابا..... نا..... غصہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ڈاکٹرنی صاحبہ!'' جہانداد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے صرف سدھوراں کا پتہ چاہئے اور بس.....! کہاں ہے وہ.....؟''

ڈاکٹر فوزیہ کو حیرت ہوئی کہ جب اس شخص کو میرے فون نمبر کا علم ہو چکا تھا تو اسے اب تک یہ کیوں نہیں پتہ چل سکا تھا کہ سدھوراں تو اس کے پاس رہتی تھی اور اس کی شادی بھی ہو چکی ہے پھر اس نے سوچا کہ کیونکہ وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دے چکی تھی لہٰذا ہو سکتا ہے جہاں داد نے یا اس کے کسی کارندے نے ابھی اس کی کوٹھی کے قریب پھٹکنے کی کوشش نہ کی ہو، بہرطور اس نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے آخرکار

جہانداد کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو مسٹر!''

''خادم کو جہاں داد کہتے ہیں۔''

''مجھے تمہارے نام سے کوئی غرض نہیں، ایک بات کان کھول کر سن لو.....! سدھوراں اس وقت کہاں ہے، یہ میں نہیں جانتی، میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ.....!'' ڈاکٹر فوزیہ کی آواز حلق میں ہی دب گئی کیونکہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے بھی بیزاری سے ریسیور رکھ دیا، وہ جانتی تھی کہ اب دوبارہ جہاں داد اسے فون کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ چند ثانیے صوفے پر بیٹھی گہرے سانس لے کر اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتی رہی، ابھی اس نے صوفے سے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک دوبارہ فون کی گھنٹی بجی، وہ چونک کر فون کو تکنے لگی پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ریسیور کانوں سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''کیا بات ہے غصے میں لگ رہی ہو.....! ہاسپٹل میں آج کوئی بدمزگی تو نہیں ہو گئی؟'' دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد احمد کی چہکتی ہوئی آواز ابھری تو ڈاکٹر فوزیہ کے حلق سے بے اختیار ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی اور تب اس نے ڈاکٹر جواد کو جہاں داد کے فون سے آگاہ کر دیا۔

دوسری طرف سے لمحہ بھر خاموشی کے بعد ڈاکٹر جواد کی اس بار قدرے پُرتشویش آواز ابھری۔ ''فوزی..... ! میں نے تم سے کہا تھا ناں سدھوراں والا معاملہ تمہارے گلے میں اٹک سکتا ہے، دیکھ لو، اب وہ اوباش ریگستان سے یہاں تک تمہارے پیچھے آ گیا۔''

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' جواباً ڈاکٹر فوزیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تمہارا نہیں تو میرا تو وہ کچھ بلکہ بہت کچھ بگاڑ سکتا ہے ناں.....؟'' ڈاکٹر جواد کی آواز ابھری۔

فوزیہ نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب..... ! وہ بھلا تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

''فوزی..... ! تم میرا سب کچھ ہو، تمہارا نقصان میرا ہی نقصان ہے، تم نے اس وڈیرے زادے سے دشمنی مول لے کر اچھا نہیں کیا۔'' ڈاکٹر جواد نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔

فوزیہ کے لبوں پر ہلکی سی مخمور مسکراہٹ پھیل گئی تاہم دوسرے ہی لمحے وہ بولی۔ ''جواد! تم مجھے بے حوصلہ بنا رہے ہو؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ بات نہیں فوزی ڈیئر......!" ڈاکٹر جواد نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "دراصل میں اور جہاں داد جیسے اوباش لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، دشمنیاں ان کا کھیل ہ جبکہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک روگ...... بہرحال تمہیں بالکل ڈرنے کی ضرورت نہیں ہ ذرا محتاط ہو کر آیا جایا کرو بلکہ ہو سکے تو ایک مسلح گارڈ اپنے ساتھ رکھ لو۔"

"تم کس مرض کی دوا ہو پھر......؟" ڈاکٹر فوزیہ نے ماحول کے بوجھل پن کو دور نے کی غرض سے پُرشوخ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد کی فدویانہ سی آواز ابھری۔ "ارے بھئی ہم ناچیز تو پ سے آپ کے باڈی گارڈ ہیں۔"

"ایک ڈاکٹر کو یہ لوفر پن زیب نہیں دیتا جناب!" فوزیہ نے اپنی ہنسی ضبط کر ہوئے کہا اور دوسری طرف سے ڈاکٹر جواد نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا پھر اگلے دن چھٹی ہو کی وجہ سے سی ویو جانے کا پروگرام بننے لگا۔

اگلے دن شام پانچ بجے ڈاکٹر جواد اپنی ٹویوٹا کرولا میں ڈاکٹر فوزیہ کی کوٹھی پر آیا، ا وقت ڈاکٹر فوزیہ کے مما، پاپا یعنی سرجن وصی شاہ اور ڈاکٹر خورشید امان موجود تھے، وہ دو بھی ڈاکٹر جواد کو پسند کرتے تھے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر جواد ایک بڑے بزنس م کی اکلوتی اولاد تھا اور اسی طرح ان دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ کے حوالے سے انہوں نے فیصلہ محفوظ کر رکھا تھا۔ بہرطور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر فوزیہ گاڑی میں بیٹھ کر سی ویو کی طرف چ پڑے۔

شاہراہ فیصل کے بعد جواد نے کار کو کورنگی روڈ کی طرف موڑا، دو تین معروف چورنگیاں کراس کرنے کے بعد جب ان کی کار نسبتاً ایک ویران سڑک پر پہنچی تو اچانک ا کے عقب سے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر آندھی طوفان کی طرح نمودار ہو کر قریب۔ گزر گئی اور آگے جا کر ذرا فاصلے پر روڈ بلاک کر کے کھڑی ہو گئی، ڈاکٹر جواد نے جلدی۔ بریک پیڈل پر پاؤں کا دباؤ ڈال دیا، ٹائروں کے زور سے چرچرانے کی سمع خراش آ ابھری اور کار سامنے آڑی ترچھی کھڑی لینڈ کروزر کے قریب قریب جا کر ایک جھٹکے سے ر گئی، اس اچانک جھٹکے سے ڈاکٹر فوزیہ کا سر سامنے کار کے ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکرا بچا۔

لینڈ کروزر کے دو اطراف کے دروازے کھلے اور چار پانچ مسلح افراد جارحانہ انداز میں ان کی کار کی طرف بڑھے۔

اس صورت حال پر وہ دونوں بوکھلا سے گئے تھے۔

ڈاکٹر جواد احمد اور ڈاکٹر فوزیہ کی خوفزدہ نظریں ان پانچوں مسلح افراد پر جم گئی تھیں جو خاصے جارحانہ انداز میں گنیں تھامے ان کی کار کے قریب آ رہے تھے۔ ایک بھاری بھرکم سا شخص بھی انہیں لینڈ کروزر کے اندر اگلی نشست پر براجمان نظر آیا تھا، جسے ڈاکٹر فوزیہ اچھی طرح پہچان چکی تھی۔

"چلو بابا...... ڈاکٹرنی صاحبہ......! باہر نکلو!"

دو افراد ڈاکٹر فوزیہ کی کھڑکی کے قریب آئے تو ان میں سے ایک نے اسے گھورتے ہوئے درشتی سے کہا جبکہ باقی تین افراد دوسری طرف گھوم کر ڈاکٹر جواد پر نالیں سیدھی کر کے اسے گھورنے لگے۔ مقصد اسے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے پر مجبور کرنا تھا۔

"کون ہو تم لوگ!" ڈاکٹر فوزیہ نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ جان چکی تھی کہ یہ کون ہیں؟ اس شخص نے جواب دیئے بغیر ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر بڑی بیدردی سے فوزیہ کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

"اے اے...... یہ کیا کر رہے ہو...... تمہیں شرم نہیں آتی۔" ڈاکٹر جواد نے تلملا کر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کی مگر اس کی سمت کھڑے ہوئے تینوں افراد نے اسے دروازہ کھولنے نہ دیا۔ ادھر وہ دونوں چیختی چلاتی ڈاکٹر فوزیہ کو گھسیٹنے کے انداز میں بازو سے پکڑ کر لینڈ کروزر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اب ڈاکٹر جواد بے حس خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ پھرتی سے برابر والی نشست کے کھلے ہوئے دروازے سے نکل کر ان دونوں کی طرف لپکا جو ڈاکٹر فوزیہ کو لئے لینڈ کروزر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسی اثناء میں باقی تینوں مسلح افراد نے ڈاکٹر جواد کے قریب آ کر اپنی گن کا ٹھوس آہنی کندا اس کے سر پر رسید کر دیا۔ ڈاکٹر جواد کی پیشانی تڑخ گئی۔ وہ سڑک پر تیورا کر گرا اور پھر یہ سب لوگ فوزیہ سمیت لینڈ کروزر میں سوار ہوئے اور آناً فاناً وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

☆======☆======☆

اس اجنبی شخص کو اپنا راستہ روکے کھڑے دیکھ کر ملوکاں بھی رک چکی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ رنگت اس کی جھلسی ہوئی تھی۔ البتہ ڈیل ڈول کے لحاظ سے ایک صحت مند شخص تھا۔ چہرے پر عجیب سی کرختگی کھنڈی ہوئی تھی۔

"کیوں رے...... کون ہے تو...... میرا راستہ کیوں روک کر کھڑا ہے...... ہٹ

پرے......'' ملوکاں نے اسے مکروہ مسکراہٹ سے گھورتے ہوئے پا کر درشتی سے کہا۔

''تو مٹھل ہاری کی دھی ملوکاں ہے نا...... اور خالقو تیرا ہی بھائی ہے؟'' اس ادھیڑ عمر شخص نے گہری نظروں سے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... تیرے کوئی اعتراض ہے...... ہٹ راستہ چھوڑ میرا۔'' ملوکاں نے جواباً تڑسے کہا اور پھر خود ہی راستہ بدل کر اس کے پاس سے گزرنے لگی تو اچانک اس شخص نے اپنا ایک بازو سیدھا کر کے پھر اس کا راستہ روک دیا۔ اب ملوکاں کا بھی ماتھا ٹھنکا...... تاہم وہ خوفزدہ بالکل نہ ہوئی البتہ اس کے قدم ضرور جم گئے تھے۔

''اڑے مچھڑو...... ! تو آخر ہے کون، جو اس طرح میرا راستہ روکے ہوئے ہے؟'' ملوکاں نے اس کی بڑی بڑی مونچھوں کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میرا نام...... آچر خان ہے، ہوٹل کا مالک ہوں میں...... گوٹھ میں سب سے بڑا ہوٹل میرا ہی ہے۔'' وہ بولا۔ ''پر تو ناراض کیوں ہوتی پڑی ہے بابا...... یہ لے تیرا راستہ چھوڑتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ ملوکاں...... اس کے منہ سے ''آچر خان'' کا نام سن کر ایک لمحے کو بری طرح ٹھٹکی۔ اس کی فطری سرکشی سر اٹھانے لگی تو اس نے قدرے تیز نظروں سے آچر خان کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''ہوں! تو تیرا نام آچر ہے۔''

''ہاؤ...... تیرا پیو مٹھل اور چاچا سکھیو روزانہ میرے ہوٹل میں آ کر چائے پیتے اور تاش کی بازی جماتے ہیں اور تیرا وڈا ادا خالقو تو میرا گہرا یار ہے۔'' وہ ملوکاں کو اپنا نام دہراتے دیکھ کر کسی قدر خوش فہمی سے بولا۔ پھر یہی خوش فہمی اس کے لبوں تک بھی آ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ ملوکاں کے چہرے کی طرف معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے قدرے خوش امیدی سے بولا۔ ''لگتا ہے میرا ذکر گھر میں ہوتا رہتا ہے۔''

''ہاں...... ادا خالقو نے تیرا ذکر پیو سے کیا تھا؟'' ملوکاں کے لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔

آچر خان اس بات کو بھی اپنی خوش فہمی پر محمول کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''ہاں...... مگر پیو کے سامنے تجھ بڈھے کے ذکر پر ادا خالقو، پیو کے ہاتھوں مار کھاتے کھاتے بچا تھا اور اب تو بھی ذرا بچ کے رہنا میرے پیو سے...... کہیں تو بھی نہ پٹ جائے اور...... آج کے بعد دوبارہ میرے آگے آنے کی کوشش کی تو گھڑا مار کے تیرا یہ تربوز جیسا سر پھاڑ

ڈالوں گی۔'' ملوکاں اس کی خوش فہمی کو بیدردی سے ذبح کرتی ہوئی غصے سے آگے بڑھ گئی۔

آچر خان ہکا بکا سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

ملوکاں غصے میں پھنکتی ہوئی گھر لوٹی، مگر اس نے ماں سے آچر خان کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''ملو...... ! کدھر چلی گئی تھی تو...... اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' اس کی ماں مائی عجیباں نے پوچھا۔

''نہر پر دیر ہو گئی۔ عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں بھی وہاں ان سے باتیں کرنے کھڑی ہو گئی تھی۔'' ملوکاں نے جھوٹ بولا اور پھر گھڑا رکھ کر وہ اندر کوٹھڑی میں پہنچی۔ میلی چیکٹ رلی پر لیٹ گئی۔ سانول کی بیماری اور اس کی بے رخی نے ملوکاں کو آزردہ اور چڑچڑا سا کر دیا تھا۔ راستے میں آچر خان سے ملاقات نے اسے مزید چڑچڑا کر دیا۔

سرِ شام مٹھل کھیتوں سے تھکا ہارا گھر لوٹا۔ ملوکاں کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ اس نے اسے چائے بنا کر دی۔ بیٹے سے کل کی تلخ کلامی پر گھر کی فضا کھنچی کھنچی سی تھی۔ مائی عجیباں باپ بیٹے کی ناراضگی کی وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ ملوکاں رسوئی سے نکل کر اپنے شوہر مٹھل کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''خالقو کے پیو...... ہمیں اڑیں پٹ خالقو کی اب دوسری شادی کر دینی چاہیے۔'' عجیباں نے شوہر سے کہا۔

مٹھل جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا، خالقو کے ذکر پر بھنا کر بولا۔ ''تیرے پٹ میں کوئی گن ہو تو میں اس کی شادی کا سوچوں، بھلا ایک نکھٹو نوالہ توڑ اور کام چھوڑ کو کون اڑیں دھی دے گا؟''

''کر لے گا کام بھی...... بیوی سر پر آئے گی تو کام بھی ڈھونڈ لے گا۔''

''پہلی بیوی کو تو سنبھال نہ سکا۔ پتہ نہیں وہ بیمار عورت میرے دوسرے پٹ سارنگ کو بھی کھا گئی۔ جانے کدھر بھٹک رہا ہو گا سارو......'' مٹھل آزردگی سے بولا تو عجیباں بھی اپنے بیٹے سارنگ کی جدائی پر دکھی نظر آنے لگی۔ اس اثناء میں خالقو بھی کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مٹھل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ناگواری سے اپنا منہ پھیر کر چارپائی سے اٹھتے ہوئے بیوی سے بولا۔ ''عجیباں...... ! میرا حقہ تیار کر کے لے آ......'' یہ کہہ کر وہ اندر جھگی کے کوٹھڑی نما گوشے میں چلا آیا۔

خالقو حسبِ معمول میلی چیکٹ اور بغیر بٹنوں والی صدری اور تہبند پہنے تھا۔ اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ہاتھ کی مٹھی میں بیڑی کا ٹوٹا دبا ہوا تھا جیسے اس نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے آخری کش لیا پھر دور پھینکتا ہوا چارپائی پر یوں گرا جیسے بڑا محنت کا کام کر کے آیا ہو۔

''پٹ......! تُو سارا دن کدھر ہوتا ہے۔ روٹی کھانے تو آ جایا کر...... چل منہ ہاتھ دھو، میں تیرے لیے روٹی لاتی ہوں۔'' عجیباں نے کہا۔

خالقو...... ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لٹھ مار لہجے میں گویا اندر کوٹھڑی میں حقے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے باپ کو سنانے کی غرض سے قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''امڑ......! کیا مجھے باہر روٹی نہیں مل سکتی؟ بہت یار دوست ہیں میرے، مجھ پر جان دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کتنے روپے ہیں میرے پاس۔'' خالقو نے اپنی صدری کی اندرونی جیب سے چند میلے مگر بڑے بڑے نوٹ نکال کر ماں کو دکھائے...... کم عقل عجیباں نوٹ دیکھ کر بیٹے پر صدقے واری ہونے لگی وہ سمجھی شاید اس کا بیٹا کماؤ پوت بن گیا۔ وہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے حیرت آمیز خوشی سے بولی۔

''میں صدقے تھیاں......! پٹ...... کیا تجھے کام مل گیا ہے کوئی؟''

اندر سے مٹھل بھی خلاف توقع چہرے پر حیرت سمیٹے صحن میں آیا اور ماں بیٹے کے ہاتھوں میں روپے دیکھ کر غیر یقینی نظروں سے اپنے بیٹے خالقو کا چہرہ تکنے لگا پھر اسی لہجے میں بولا۔ ''تیرے کو کون سا کام مل گیا ہے رے، ذرا میں بھی تو سنوں؟'' اس کے لہجے میں تشکیک آمیز الجھن تھی۔

خالقو باپ سے نظر چرانے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولا۔ ''بس مل گیا تھا ایک کام...... بوریاں اٹھائی تھیں کھاد کی...... ٹرک پر لادی تھیں۔''

''ارے، خالقو کے پیو، تُو نے کیا تھانیداری شروع کر دی...... ہڈ مار کے آیا ہے اپڑاں خالقو...... کوئی چوری نہیں کی ہے، نا کرے کام تو تجھے اعتراض...... اب چار پیسے کر لایا ہے تو تُو نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔'' حسب معمول مائی عجیباں نے شوہر کے آگے خالقو کی حمایت میں ہاتھ نچا کر کہا تو باراں دیدہ مٹھل نے اپنے نکھٹو بیٹے کی طرف گھور کر دیکھا۔ اسے بیٹے کی پیشانی پر جفاکشی میں بہنے والے پسینے کی ایک لکیر تک نظر نہ آئی تھی۔

''خوب جانتا ہوں۔ یہ روپیہ کسی سے اینٹھ کر لایا ہے ورنہ آج نہیں روز...... ہے۔'' مٹھل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کہیں سے بھی لایا ہو...... یہ تیرا تو محتاج نہیں ہے نا...... تیری سخت مزاجی کی وجہ سے میرے پٹ نے دوپہر کی روٹی بھی گھر پہ کھانی چھوڑ دی ہے، بس رات کا ہی تو بچا کھچا کھا

ہے غریب......'' مائی عجیباں نے کہا اور آدھے نوٹ اپنے گریبان میں اڑس لئے۔

''تیرا پٹ دوپہری کا کھانا اس مردود آچر خان کے ہوٹل میں کھاتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے ہی اسے یہ روپے دیئے ہیں...... تاکہ اس کے ذریعے میرے گھر کے اندر نقب لگا سکے۔'' مٹھل نے زہریلے لہجے میں کہا۔ پھر گویا اٹل لہجے میں خالقو سے بولا۔ ''ایک بات یاد رکھنا خالقو......! تُو جس لالچ کی کھاتر آچر خان کا ''راتب'' کھا رہا ہے ناں...... تیرا وہ ذلیل مقصد میں کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا۔''

''امڑ......! پیو کو سمجھا لے مجھ سے ایسے لہجے میں بات نہیں کیا کرے ورنہ......؟''

''ورنہ کیا رے...... کیا کر لے گا تُو میرا...... ہیں......! میری بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنا دم ہے...... تُو میرے سامنے...... ذرا!'' مٹھل ایک دم چراغ پا ہو گیا، ایسے میں عجیباں، شوہر کے آگے آ گئی۔

''ہے گھوڑا...... کیا قہر کرتا ہے...... جوان پٹ کے ساتھ ایسا بولتے ہیں۔''

''تو پھر اپڑیں جوان پٹ کو سمجھا لے، خبردار جو اس خبیث آچر خان کا اس گھر میں ذکر کیا ہو۔'' مٹھل نے طیش میں آ کر کہا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا دوبارہ اپنی کوٹھڑی میں جا گھسا۔ اتنے میں ملوکاں اس کے لیے حقہ تازہ کر لائی اور ساتھ ہی سلور کے ایک کٹورے میں پانی بھر لائی۔ مٹھل نے چند گھونٹ پانی کے پیئے۔ مارے غیظ وغضب کے وہ کپکپانے لگا تھا پھر اس نے جیسے ہی حقے کا ایک کش لیا تو اسے شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال سا ہو گیا۔

ملوکاں کو اپنے بوڑھے کامی باپ پر ترس آنے لگا تھا، اس نے یکدم حقہ پرے کیا اور باپ کو سنبھالنے لگی پھر آدھ بھرا کٹورا اس کے لرزتے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ''پیو......! تُو غصہ نہ کر...... کیوں خود کو ہلکان کرتا ہے، بکنے دے ادا خالقو اور امڑ کو......''

مٹھل کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا، ملوکاں کا دل کٹ سا گیا، اس نے فوراً اپنی چادر کے کونے سے بوڑھے باپ کی نمناک آنکھوں کے گوشے صاف کیے۔

''میں سارا دن باہر محنت مزدوری کرتا ہوں، گھر آتا ہوں تو دونوں ماں، بیٹے مجھے کھانے کو دوڑتے ہیں۔'' مٹھل کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پر کرب ابھر آیا، اس کی آواز رقت سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ''پتہ نہیں میرا سارنگ پٹ کس حال میں ہو گا، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا، وہ میرا سچا پٹ تھا، فرمانبردار...... مجھے یقین ہے وہ اگر ہوتا تو مجھے بالکل کام نہیں کرنے دیتا، اللہ سائیں اس کے سر کی خیر کرے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بپو......! میرا دل کہتا ہے ادا سارنگ ایک دن ضرور تم سے آن ملے گا۔'' ملوکاں نے باپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔ ''بپو......! تُو چھوڑ دے کام پھر خود ہی ادا خالقو اور امڑ کو پتہ لگے گا کہ گھر دھڑیں (شوہر) کی کمائی کیا ہوتی ہے۔''

''دھیئے......! مجھے اپڑیں نہیں، تیری فکر ہے...... تجھے اپڑیں گھر کا کر دوں پھر مجھے کسی کا ڈر نہیں پھر آج ماں، بیٹے کی سنگدلی اور بے حسی نے مجھے پہلی بار احساس دلایا ہے کہ میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں...... اب پتہ نہیں میں کام کیسے کروں گا، جان توڑ محنت نے بھی مجھے کمزور نہیں کیا تھا مگر آج...... آج......!'' مارے رقت و بے بسی کے احساس غم تلے مٹھل اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

ملوکاں نے فوراً باپ کو سہارتے ہوئے کہا۔ ''بپو......! تُو کیوں پریشان پھرتا ہے، میں ہوں نا...... تیری بیٹی......! کل سے تیری جگہ میں خود چاچا سکھیو کے ساتھ کھیتوں پر جاؤں گی، آخر کو اور لڑکیاں بھی تو جاتی ہیں۔'' بیٹی کی بات سن کر مٹھل نے غم سے چور نظروں سے اسے دیکھا پھر دونوں باپ بیٹی گلے مل کر رونے لگے۔

☆======☆======☆

سارنگ کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ املی غائب تھی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، بغیر دروازے کی چوکھٹ پر جھولتے ہوئے بوسیدہ سے ٹاٹ کے روزنوں سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی، املی کی پُراسرار غیر موجودگی پر جانے کیوں اسے دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا تاہم اس نے غیر یقینی حالات کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے ہوشیاری اور محتاط روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور بہ آہستگی بستر سے اٹھ کر دبے پاؤں چوکھٹ کے قریب آیا اور پردے کے طور پر مستعمل ٹاٹ کو ذرا سا سرکا کر باہر جھانکا۔ یہ ''مہمان گوشہ'' قبیلے کے مکھیا مکھڑوں کوبلی کے بڑے سے رہائشی جھونپڑے کے بعید ترین حصے میں واقع تھا کیونکہ آگے ایک اور کوٹھری نما کمرہ تھا جو سنسان پڑا تھا حالانکہ سارنگ کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ اور املی اس جھونپڑی میں داخل ہوئے تھے تو یہاں سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر اب جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا، باہرانہی عورتوں، بچوں کو کسی دوسرے جھونپڑی میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اچھی طرح گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد سارنگ دبے پاؤں باہر نکل کر سامنے کی کوٹھری میں آیا تو اچانک اسے کسی کے دبے دبے انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹکا اور ان مدہم آوازوں کی سمت دیکھا، دھیمے دھیمے باتیں کرنے

کی آوازیں دائیں جانب کے گوشے سے آ رہی تھیں، اس کی چوکھٹ پر بھی بوسیدہ سی رلی کا ٹاٹ جھول رہا تھا، وہ بے آواز چلتا ہوا چوکھٹ کے قریب پہنچا اور سانس روکے سن گن لینے کی سعی کرنے لگا۔

''میں صحیح کہتی ہوں مکھیا جی......! یہ میرا دشمن ہے، نہ یہ میرا شوہر ہے اور نہ میں اس کی بیوی بلکہ میں تو اس کے قبیلے کی بھی نہیں ہوں، میرا اصل نام شرما دیوی نہیں بلکہ املی ہے اور یہ مردود ہاتو نہیں بلکہ سارنگ ہے، یہ مُسلا ہے اور میں راجستھانی ہندو ناری ہوں۔''

سارنگ، املی کی آواز اور اس کی سرگوشیانہ انداز کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گیا۔ آخرکار اس ناگن نے اسے ڈس لیا تھا، وہ اسے یہاں تک لا کر اب بری طرح پچھتا رہا تھا مگر اب کیا ہوتا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق سارنگ بے بس ہو گیا تھا۔

پھر دفعتاً اسے مکھیا مکھڑوں کوبلی کی سرسراتی آواز سنائی دی۔ ''اگر یہ تیرا دشمن تھا تو پھر تُو اس کے ساتھ ادھر کیوں آئی......؟''

اس کے سوال پر جواباً املی کی دبی دبی آواز ابھری۔ ''مکھیا جی......! میں نے ابھی تیرے کو بتایا تو تھا کہ یہ مردود ایک اسمگلر ہے، اس نے میرے باپو کا بڑی بیدردی سے قتل کیا تھا، میں نے اس سے انتقام لینا تھا مگر تنہا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی اس لئے میں نے سوچا کہ اسے بے وقوف بنا کر موقع ملتے ہی اس کے سینے میں انتقام کا خنجر گھونپ دوں گی، میں اسے بڑی چالاکی کے ساتھ ادھر لائی تھی۔''

سارنگ کا پورا وجود مرتعش تھا، اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں، اسے دغا باز املی پر اس قدر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس کا بس چلتا تو اندر جا کر مکار چنڈال کی گردن مروڑ دیتا مگر یہ وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا تھا کیونکہ وہ خود اس وقت قبیلے کے سردار کے جھونپڑے میں موجود تھا، اگر جوش سے کام لیتا تو یہ سب لوگ اپنے مکھیا کے ایک اشارے پر اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ لہٰذا اس نے عافیت اسی میں جانی کہ فی الفور اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے رفو چکر ہو جائے وگرنہ مکار اور دغا باز املی نے جس طرح مکھیا کے سامنے اسے ایک اسمگلر ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی، یہ بات اسے ایک بڑی مصیبت میں پھنسا دینے کے لیے کافی تھی کیونکہ یہ لوگ اس کو ایک اسمگلر کی حیثیت سے جھوٹے الزام میں بارڈر فورسز کے اہلکاروں کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ خیال آتے ہی وہ پھر نہ رکا اور جلدی سے وہ بیرونی حصے کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے وہ جھونپڑے سے باہر تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بری طرح اعصاب زدگی کا شکار تھا، پریشانی میں اسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کدھر کا رخ کرے، اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو اسے آس پاس بنی چھوٹی بڑی جھونپڑیوں کے اردگرد قبیلے کے لوگ آتے جاتے دکھائی دیئے، کسی نے اس پر توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سارنگ کے دل میں یہی خیال آیا کہ وہ اب ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ان کے ڈیرے سے کہیں دور چلا جائے پھر اس نے ایسا ہی کیا، وہ خاموشی سے تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو ہولیا، اردگرا سے مال، مویشی بھی جگالی کرتے نظر آئے، اچانک اسے عقب میں ایک گونجدار للکارتی ہوئی تحکمانہ آواز سنائی دی۔

''اڑے او چھوکرا......! کدھر جاتا پڑا ہے رک جا......''

سارنگ نے چلتے چلتے مڑ کر عقب میں دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، مکھڑوں کولبی اپنے جھونپڑے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے تقریباً دوڑتا ہوا آرہا تھا، اس کے عقب میں وہ چنڈال املی بھی تھی، یہ دیکھ کر سارنگ نے باقاعدہ سرپٹ دوڑ لگادی، قبیلے کے جوان مردوں کو فوراً صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوا تو وہ دائیں بائیں سے اپنے دونوں ہاتھ گویا بھاگتی ہوئی مرغی پکڑنے کے لیے انداز میں پھیلائے سارنگ کی طرف گھیرا ڈالنے کی غرض سے دوڑے مگر سارنگ ان کا گھیرا مکمل ہونے سے قبل ہی ان کی پہنچ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا، مکھیا اور قبیلے کے لوگوں کے چیخنے چلانے سے جیسے چاروں طرف بھگدڑ سی مچ گئی تھی پھر جو بھی ان کی طرف متوجہ ہوتا، چشم زدن میں صورت حال کا ادراک کرتے ہی سارنگ کو پکڑنے کے لیے دوڑ لگا دیتا، جلد ہی سارنگ کو یہ احساس ہوگیا کہ وہ کسی چوہے دان میں پھنس گیا ہے کیونکہ وہ جیسے ہی سامنے سے بازو پھیلائے اپنی طرف بڑھتے کسی شخص کو دیکھتا تو سارنگ اپنا راستہ بدل کر دائیں جانب کی جھگیوں، جھونپڑیوں کی قطار میں چھلانگ لگا دیتا تب اچانک سارنگ کی نظر جگالی کرتے ہوئے ایک اونٹ پر پڑی، اگرچہ اس کے کوہان پر کوئی ''ہودہ'' یا ''کجاوہ'' نہیں رکھا گیا تھا مگر سارنگ نے اس کی مطلق پروا کے بغیر اسے جلدی سے ہشکارے دیتے ہوئے کھونٹے سے آزاد کیا اور دوسرے ہی لمحے جب اونٹ کھڑا ہونے لگا تو سارنگ بہ سرعت اچھل کر اس کے کوہان سے چمٹ کر اس پر سوار ہوگیا، اثنائے راہ مکھڑوں کولبی کے آدمی بھی قریب پہنچ گئے بلکہ ایک نے تو اچھل کر سارنگ کو کوہان سے نیچے گرانے کی بھی کوشش کی مگر سارنگ نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے اس

کے منہ پر لات رسید کردی پھر مخصوص انداز میں اس نے اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیاں اونٹ کے پیٹ پر رسید کرنے کے ساتھ ہی حلق سے زور سے آواز نکالی تو دوسرے ہی لمحے اونٹ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ پھر کسی میں بھی اس کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس کے گرد گھیرا ڈالنے والے مشتعل لوگوں کا گھیرا کائی کی طرح چھٹتا چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد سارنگ ڈیرے سے دور نکل گیا، کجاوہ یا مہاریں نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اونٹ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً شتر بے مہار ہو چکا تھا، سارنگ کو اب اونٹ پر خود کو جمائے رکھنا دوبھر ہو رہا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے پورے وجود کی طاقت سے اس کے کوہان سے چمٹا ہوا تھا۔

اونٹ کو تو ویسے ہی صحرا کا جہاز کہا جاتا ہے اور وہ صحرائی جہاز بغیر رکے بے سمت دوڑا جا رہا تھا بلکہ اڑا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی، سارنگ کی جان میں جان آئی پھر اگلے چند لمحوں میں ہی اونٹ رک کر صحرائی جھاڑیاں چرنے لگا، یہ ''اونٹ کٹارا'' تھی، اونٹ کا من پسند کھاجا، سارنگ بری طرح ہانپ رہا تھا جیسے اونٹ کے ساتھ خود بھی دوڑتا رہا ہو، سارنگ نے اونٹ کے کوہان سے نیچے ریت پہ چھلانگ لگا دی، اونٹ جھاڑیاں چرنے میں مگن تھا۔

سارنگ نے کھڑے ہو کر دائیں بائیں دیکھا، حد نگاہ لق و دق صحرا تھا، سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا، پورے تپتے سلگتے صحرا میں ''العطش العطش'' کی گونج محسوس ہو رہی تھی، سارنگ نے اچھی طرح اطمینان کرلیا تھا کہ وہ بستی سے کافی دور بلکہ بہت آگے نکل آیا تھا، اچانک پھر سارنگ کو اپنے سامنے کچھ فاصلے پر خاردار باڑ سی نظر آئی جو کہیں کہیں سے ٹوٹ کر ریت میں دھنسی ہوئی تھی، سارنگ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، وہ سرحد کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا تاہم اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں بارڈر سیکورٹی فورسز والوں کی کوئی چوکی نہیں تھی، ہوسکتا ہے یہ سرحد کا کوئی بعید ترین حصہ ہو۔ اس نے سوچا اور ساتھ ہی اس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ایک طرح یہ اچھا ہی ہوا، اب ایک بار وہ سرحد پار کرلے تو کسی طرح کورا کے مقام تک پہنچ ہی جائے گا، جدھر جیوش بابا کی کٹیا تھی۔

اسے اب پیاس ستانے لگی تھی، یہاں پانی کا ایک قطرہ بھی ملنا محال تھا پھر اچانک اس کی نظر پاس ہی ایک بڑے اور پھولے ہوئے ترشول نما کیکٹس پر پڑی، وہ فوراً اس کی طرف بڑھا اور اپنے نیفے سے چھوٹا سا شکاری چاقو نکال کر اس نے ایک کیکٹس کو اس کی نچلی جڑ کے قریب سے کاٹ کر علیحدہ کیا، اس کوشش میں اس کے ہاتھ میں کانٹے بھی چبھ گئے، اس نے اس کی چنداں پروانہ کی اور چاقو کی مدد سے اس بڑے سے پھولے ہوئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیکٹس کے سارے کانٹے چھیل ڈالے، اس کے بعد چاقو کی نوک پھولے ہوئے کیکٹس کے اندر گھسیڑ کر سوراخ کیا تو اس کے اندر سے پانی کی دھار پھوٹ نکلی، سارنگ نے فوراً کیکٹس کے اس سوراخ سے منہ لگا دیا اور سارا پانی غٹا غٹ پی لیا، وہ اس کیکٹس کی مخصوص قسم سے بخوبی واقف تھا جس کے اندر میٹھا پانی قدرتی طور پر موجود رہتا ہے، پانی پی کر وہ خاصا سیر ہو گیا تو اس نے زادِ راہ کے طور پر دو تین مزید ایسے ''آبی کیکٹس'' کاٹ کر رکھ لئے، قریب ہی اس کا اونٹ جھاڑیاں چرنے میں مصروف تھا، سارنگ نے اس کو مخصوص انداز میں آواز دے کر ریت پر بٹھایا اور اس کے کوہان سے چپک کر بیٹھ گیا، اب وہ اسے درمیانی رفتار سے آگے بڑھانے لگا، اس نے املی پر تین حرف بھیج کر دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس چنڈال سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ اب سرحد پار کر چکا تھا۔

☆======☆======☆

سدھوراں اپنے شوہر پرویز کی اسرار بھری گفتگو سے الجھ کر رہ گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر پرویز اس سے کیا چاہتا تھا، سدھوراں نے بھی اس سے اس بابت کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی، سگھڑ بیویوں کی طرح وہ گھر داری میں مصروف ہو گئی، اس میں کوئی شک نہ تھا کہ پرویز اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا مگر باوجود اس کے سدھوراں اس کی طرف سے بدستور الجھن اور بے نام سی پریشان کن بے چینی کا شکار تھی، وہ صبح جاتا اور رات گئے ہوٹل سے لوٹتا تھا۔

ایک روز پرویز کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا، اس دن پرویز گھر ذرا جلدی ہی آ گیا تھا، بعد میں سدھوراں کو محسوس ہوا کہ وہ دراصل اپنے اسی دوست سے ملنے کے لیے ہی جلدی گھر لوٹا تھا، بعد میں پرویز نے سدھوراں سے دوست کے لیے دو تین روٹیاں زیادہ بنانے کو کہا۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا، پرویز نے اپنے دوست کو بیٹھک میں بٹھا رکھا تھا جس کا ایک دروازہ اندر صحن میں بھی کھلتا تھا، پرویز نے اپنے اس دوست کے بارے میں سدھوراں کو کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا، جب وہ دونوں کھانا کھا چکے تو پرویز نے سدھوراں کو چائے بنانے کا کہا۔

''دیکھ سدھوراں..... ! یہ میرا بہت پرانا اور بچپن کا دوست ہے، دلدار حسین نام ہے اس کا..... یہ ایک طرح سے میرا محسن بھی ہے، ہمارے درمیان بھائیوں جیسی بے تکلفی ہے۔'' وہ لمحہ بھر رکا تو سدھوراں خاموشی سے شوہر کا چہرہ تکنے لگی، وہ سوچ رہی تھی کہ بھلا یہ سب اس کا شوہر اسے کیوں بتا رہا ہے، میں نے تو ان کی دوستی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

''تُو ذرا بن سنور لے، سرخی پاؤڈر لگا لے۔ آخر کو ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے، وہ کیا سوچے گا کہ نئی نویلی دلہن کو نوکرانی بنا لیا، میں اندر بیٹھک میں جا رہا ہوں تُو چائے خود اندر لے کر آنا..... سمجھ گئی ناں اچھی طرح؟'' اس نے آخر میں گویا تنبیہ والے انداز میں سدھوراں سے کہا تو سدھوراں بیچاری پریشان سی اس کا منہ تکنے لگی پھر پھنسی پھنسی سی آواز میں شوہر سے بولی۔ ''م..... میں..... بھلا..... ایک غیر مرد کے سامنے کس طرح جا سکتی ہوں، مجھے تو شرم آئے گی تُو خود لے جانا چائے!''

''اری پاگل نہ بن..... ! شرم کیسی؟'' وہ بولا۔ ''میں نے کہا تو ہے وہ میرا بچپن کا دوست ہے خواہ مخواہ دل میلا کرے گا تُو اس کے سامنے نہیں جائے گی تو وہ اسے غیریت سمجھے گا، چل جلدی کر شاباش..... ! اور ہاں وہ بینگنی رنگ کا جو سوٹ تھا نا جو شادی کے بعد میں نے طارق روڈ سے خاص تیرے لئے خریدا تھا، وہ پہن لینا جلدی سے، اچھا اب میں تیرا انتظار کر رہا ہوں اندر.....''

سدھوراں، شوہر کے اس عجیب و غریب حکم پر ششدر سی ہو کر رہ گئی۔ شوہر کا حکم تھا جو وہ مجبور ہو گئی، اس کی ناراضی وہ نہیں مول لینا چاہتی تھی۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اندر اپنے کمرے میں آ گئی، الماری سے بینگنی رنگ کا جھلمل کرتا سوٹ نکالا اور اسے دیکھنے لگی، صاف ظاہر ہو رہا تھا اس کے چہرے سے کہ وہ اسے پہنتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کیونکہ ایک تو یہ سوٹ سدھوراں کے ٹائٹ تھا پھر اس کی آستینیں بھی ہاف تھی، دوسرے اس کا گلا بہت کھلا تھا، یہ سوٹ وہ صرف گھر میں اس وقت پہنتی تھی جب پرویز گھر میں ہوتا تھا اور اگر وہ اس کے ساتھ باہر گھومنے کے لیے نکلتی تو ہرگز یہ سوٹ نہیں پہنتی تھی مگر آج جب پرویز نے اسے یہ سوٹ پہن کر اپنے دوست کے سامنے آنے کو کہا تو سدھوراں میں اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ پرویز اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے، ہو گی اس کی کوئی دوستانہ مجبوری..... پہن لینے میں کیا حرج ہے شاید یہ قیمتی سوٹ ہے اسی لئے پرویز اپنے دوست پر رعب جھاڑنا چاہ رہا ہو کہ اس نے اپنی بیوی کو شہزادیوں کی طرح رکھا ہے، بعض مردوں کو اپنی خوبصورت بیوی کی نمائش کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سوچ کر سدھوراں کے لبوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی اور اس نے اپنا سر جھٹک کر جلدی جلدی سوٹ پہن لیا پھر ذرا دیر بعد میک اپ کر کے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیا تو وہ خود ہی شرما گئی۔ اس کی کھلتی ہوئی رنگت پر یہ سوٹ خاصا جچتا تھا، اس کا ہم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رنگ دوپٹہ بالکل باریک ململ کا تھا جو پردے سے زیادہ محض فیشن ہی کا مظہر تھا، بہرطور سدھوراں جی کڑا کر کے رسوئی میں آئی پھر چائے کے برتن ٹرے میں سمیٹ کر وہ جب بیٹھک کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، وجود میں بھی ہلکی ہلکی لرزش تھی، تب وہ ذرا ہمت کر کے آگے بڑھی اور دروازے کے بالکل سامنے پہنچ کر ہولے سے اس نے کھنکارا تو اندر دوست کے ساتھ باتوں میں مشغول پرویز نے بیوی کی آہٹ پا کر دروازے کے دونوں پٹ پوری طرح وا کر دیئے، سدھوراں جی کڑا کر کے ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی، سامنے ایک تپائی نما چھوٹی سی میز کے قریب کرسی پر اسے پرویز کا وہ دلدار حسین نامی دوست بیٹھا نظر آ گیا، اس کے ہاتھ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی، وہ پرویز کا ہم عمر ہی تھا، رنگت قدرے جھلسی ہوئی تھی، ناک موٹی سی تھی اور ہونٹ بھی موٹے موٹے اور سیاہی مائل تھے جو اس کی کثرت سگریٹ نوشی کی چغلی کھا رہے تھے۔

سدھوراں کو دلدار حسین کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے سدھوراں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ سدھوراں کے نسوانی وجدان نے اسے محسوس کروایا کہ وہ شخص بغور اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔

''سلام بھابی!'' دوسرے ہی لمحے سدھوراں کے کانوں سے بھدی سی آواز ٹکرائی تو سدھوراں نے جھکے جھکے سر کے ساتھ ہاتھوں میں پکڑی ٹرے گھبراہٹ میں جب سامنے تپائی پر رکھی تو اس کا باریک ململ کا مختصر فیشنی ساتوئی دار دوپٹہ اس کے جھکنے کی وجہ سے سر سے ڈھلک گیا چونکہ مارے لاج کے خود سدھوراں کا چہرہ بھی جھکا ہوا تھا اس لئے دوپٹہ سر سے نیچے گرتے ہی خود اس کی اپنی جھکی جھکی آنکھوں نے اپنے کشادہ گریبان کا نظارہ کیا تو وہ سرخ ہو گئی، ٹھیک اسی لمحے اسے اپنے چہرے کے قریب ہی پرویز کے دوست دلدار حسین کی جذبات سے بوجھل ''واہ'' کی آواز سنائی دی، سدھوراں نے مضطربانہ انداز میں دلدار حسین کی طرف دیکھا اور مارے لاج کے جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''ارے سدھوراں......! تم نے میرے بھائی کے سلام کا جواب نہیں دیا، یہ کیا کہے گا کہ اس کی بھابی کتنی مغرور ہے؟'' اچانک اسے اپنے شوہر پرویز کی آواز سنائی دی اور سدھوراں نے جلدی سے اپنا دوپٹہ سر پر رکھتے ہوئے ہلکے سے آداب کہا۔

''اوہ بھئی پرویز......! تم واقعی خوش نصیب انسان ہو، بھابی تو بالکل ہیرا ہے ہیرا...... سچ پوچھو تو مجھے تم سے حسد ہونے لگا ہے۔'' دلدار حسین نے بدستور عجیب نظروں سے سامنے کھڑی سدھوراں کے سراپے کو گھورتے ہوئے کہا تو سدھوراں کو اس کا لہجہ برا لگا تاہم وہ سر

جھکائے گھبرائی گھبرائی سی کھڑی رہی۔

''دیکھ لو اپنی بھابی کو......! پھر نہ کہنا مجھے کچھ۔'' پرویز نے فخر سے کہا۔ سگریٹ کے دھوئیں اور عامیانہ گفتگو سے بیٹھک کا محدود ماحول مکدر ہو رہا تھا پھر سدھوراں کا تو وہاں کھڑے رہنا دوبھر ہونے لگا مگر چونکہ ابھی شوہر کا حکم نہ تھا واپس لوٹنے کا اس لیے وہ وہیں سر جھکائے خاموشی سے کھڑی رہی، دلدار حسین اپنی جگہ سے اٹھا اور قمیض کی جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر سدھوراں کی طرف بڑھا۔

''بھابی......! یہ منہ دکھائی تو لے لیں......اتنا بھی کیا شرمانا......!''

سدھوراں نے گھبرا کر سر اٹھایا، دلدار حسین کی نظریں اسے اپنے وجود میں گھستی محسوس ہونے لگیں۔

''لے لے سدھوراں! یہ تو ایک رسم ہے۔'' پرویز نے کہا۔

سدھوراں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا کر دلدار حسین کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ کو آہستگی سے لیا تو اس کا ہاتھ اس سے چھو گیا، سدھوراں نے جلدی سے نوٹ لے کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اسے صاف محسوس ہوا تھا کہ دلدار حسین نے دانستہ اس کا ہاتھ چھونے کی کوشش کی تھی، پھر سدھوراں وہاں نہ رکی اور باہر آ کر اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے پھر معاً جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ وہ دوبارہ بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھی اور کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی۔

اچانک پھر اسے اندر سے دلدار حسین کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے شوہر پرویز کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''پرویز......! شئے تو تُو نے بڑی زبردست ڈھونڈی ہے پھر کب اسے دھندے سے لگا رہا ہے؟''

''ارے یار......! ذرا دھیرج......اسی جلدی بازی کی وجہ سے پہلی والی بھاگ گئی تھی، اب اسے ذرا آرام سے راہ پر لگاؤں گا۔'' جواباً پرویز کی آواز ابھری تو سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا پھر اسی لمحے دلدار کی آواز آئی۔

''یار پرویز......! دراصل بات یہ ہے کہ وہ ہے ناں ایس ایچ او خاور حیات وہ آج کل بڑا تنگ کر رہا ہے، اس کمبخت نے تو دھندہ ہی چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔''

''اس کی جیب کیوں نہیں گرم کرتا، پیسے کم ہیں تو میں دے دیتا ہوں۔'' پرویز بولا۔

''مٹھی تو میں اس کمبخت کی گرم کرتا ہی رہتا ہوں، اس کم بخت کا پیٹ بہت موٹا ہے تُو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی نہیں بھر سکے گا پیسوں سے اس کا پیٹ......! اسے کچھ اور چاہیے۔''

''اچھا......! یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔'' پرویز کی متفکر سی آواز ابھری تھی پھر وہ دوسرے ہی لمحے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں سدھوراں کو لائن پر لگانے کی کوشش کرتا ہوں، ذرا کچھ دن ٹھہر جا۔'' پھر لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ ''یار دلدار......! یہ تو بتا اعظم بستی والے اڈے کی کیا پوزیشن ہے، وہاں پر مال کی اب تک دوسری ڈلیوری نہیں ہوئی، یہی حالت ملیر پندرہ اور کورنگی کے اڈوں کی ہے۔''

''ارے یار بتایا ناں اس کم بخت خاور حیات نے سارا معاملہ ہی چوپٹ کر رکھا ہے جس راستے ہمارا مال آتا ہے، وہاں اس نے ناکہ بندی کر رکھی ہے، متعلقہ تھانوں تک بھی اس کمینے کی رسائی ہے، اپنے سارے وردی پوش بھائی بندوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے، یہ سارے کالی وردیوں والے ہمارے جیسوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے گئے ہیں۔'' دلدار حسین نے تفصیل بتائی۔

''تو بنگو اور چھیدے کے اڈوں کا کیا حال ہے، آخر کو وہ بھی ان کالی وردی والوں سے تنگ آئے ہوئے ہوں گے؟'' پرویز نے پوچھا۔

''ہاں......! ان کی ناک میں بھی دم کر دیا تھا پھر انہوں نے کسی نہ کسی طرح انہیں رام کر لیا ہے، مال کے ساتھ ڈبل مال بھی بھیجتے رہتے ہیں ان کے ویران کوارٹروں میں......'' دلدار حسین نے بتایا۔ ''بس یار......! اگر ہم نے خاور حیات کو رام کر لیا تو یقین کرنا ہمارے حریف بنگو اور چھیدا بھی ہمارے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔''

''اچھا یار......! ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تو فکر نہ کر، مجھے امید ہے کم از کم میری یہ دوسری بیوی میری بات نہیں ٹالے گی۔'' پرویز نے اسے تسلی دی۔

''اچھا یار......! تو پھر مجھے اجازت دے، کام ہو جائے تو مجھے اطلاع کر دینا، اب چلتا ہوں۔'' دلدار اٹھتے ہوئے بولا۔

سدھوراں فوراً وہاں سے ہٹ گئی اور لرزتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گئی۔

اس کا دل و دماغ جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا، اپنے شوہر اور اس کے دوست کی معنی خیز باتوں سے اسے حالات کا بخوبی ادراک ہو رہا تھا، اسے اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ اس کا شوہر پرویز عنقریب اس سے وہی پُراسرار بات کہنے والا تھا جو اس نے شب سہاگ اس کے ''کام'' آنے سے متعلق کہی تھی۔

سدھوراں اب شدید وسوسوں کا شکار ہونے لگی تھی۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ کو جہاں داد کے بدمعاش ساتھیوں نے لینڈ کروزر کی عقبی نشست پر بٹھا رکھا تھا، ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے جبکہ دوسرے نے اس کا منہ بند رکھا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھی، وہ ذرا بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کرتی تو وہ بدتہذیبی سے پیش آتے تھے، ناچار فوزیہ کو ان کی بیہودگی روکنے کے لیے چپ ہو کر بیٹھا رہنا پڑتا، ایک طرف ڈاکٹر فوزیہ کا غصے سے برا حال تھا تو دوسری طرف شدید قسم کی تشویشناک بے چینی اور پریشانی کا بھی شکار تھی جبکہ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھا جہاں داد، ڈاکٹر فوزیہ کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا، اس کی گھنی مونچھوں تلے بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

لینڈ کروزر فراٹے بھرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف خاصی رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی، ڈاکٹر فوزیہ نے سرِ دست خود کو حالات کے گرداب کے سپرد کر دیا تھا اور اپنے اعصاب زدہ دل و دماغ پر قابو پاتے ہوئے کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لینے لگی، وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ بدمعاش اسے کہاں لے جا رہے تھے، اسے ڈاکٹر جواد کی بھی فکر ستانے لگی تھی جسے ان بدمعاشوں نے اپنی رائفل کا ٹھوس کندا اس کے سر پر رسید کر کے اسے زخمی کر ڈالا تھا۔ لینڈ کروزر اب واپس ڈیفنس، اختر کالونی والی چورنگی سے قیوم آباد چورنگی کی طرف مڑ گئی تھی اور وہاں سے اس نے دائیں جانب قیوم آباد چورنگی (ڈیفنس ویو) سے کورنگی کراسنگ سے موڑ کاٹا پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

لمحہ بہ لمحہ ڈاکٹر فوزیہ کے دل و دماغ میں وسوسوں کی سرسراہٹیں بڑھنے لگی تھیں۔ اس کے متوحش دماغ کی غیر مرئی اسکرین پر بار بار خطرناک سوالیہ نشان بن رہے تھے، نجانے جہانداد اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا کیونکہ وہ اب پوری طرح سے جہاں داد کے رحم و کرم پر تھی اس پر مستزاد اس کے پانچوں ہٹے کٹے مسلح بدمعاش کارندے بھی اس کے ہمراہ تھے۔

لینڈ کروزر اب ابراہیم حیدری کی طرف جا رہی تھی پھر لگ بھگ نصف گھنٹے بعد وہ ابراہیم حیدری سے آگے مضافات میں دائیں جانب ایک کچے اور نشیبی راستے میں اتر گئی۔

شام کے سائے اب بتدریج گہرے ہونے لگے تھے اور اب اس بے آب و گیاہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ویرانے میں تو جیسے وقت سے پہلے ہی رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا، ڈاکٹر فوزیہ کی حالت مزید دگرگوں ہونے لگی، اس کے پاس اب خدا سے دعا مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

لینڈ کروزر اب ہچکولے کھاتی ہوئی ناہموار راستے پر درمیانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ ویرانے کے پیشِ نظر اب اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا گیا تھا، غیر مردوں کے بیچ بیٹھنے کی وجہ سے ڈاکٹر فوزیہ کو سخت ذہنی اذیت اور کوفت محسوس ہو رہی تھی، بہر طور بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، کے مصداق ڈاکٹر فوزیہ نے ہانپتی ہوئی متوحش آواز سے ڈرائیور کے برابر والی اگلی نشست پر براجمان جہاں داد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تت...... تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو جہاں داد......؟''

ڈاکٹر فوزیہ کی لرزتی، کانپتی اور قدرے التجا آمیز آواز پر جہاں داد اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''اپنے مہمان خانے...... ! جدھر ہم سب تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کریں گے۔''

ڈاکٹر فوزیہ اس کے سرسراتے لہجے پر لرز اٹھی۔ ''جہاں داد...... ! تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو، تم نہیں جانتے ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اپنے تئیں اسے دھمکانے کی کوشش کی تو جہاں داد اس بار گردن موڑ کر اس کے متوحش چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''جانتا ہوں، اچھی طرح تم کس تیس مار خان کی اولاد ہو...... تمہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ تم نے کس کو دھوکا دے کر دشمنی مول لینے کی کوشش کی ہے، اب خاموش بیٹھی رہو ورنہ ادھر ہی تمہارا برا حشر کر ڈالیں گے۔'' اس کے سفاک لہجے نے ڈاکٹر فوزیہ کو خوفزدہ سے انداز میں چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر فوزیہ کو دائیں بائیں کچے پکے مکانوں کے خاکے نظر آنے لگے یہ ایک دور افتادہ مضافاتی قصبہ تھا، جو اس وقت عجیب سی پُرسکوت ویرانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر کچے پکے گھروں کا یہ سلسلہ بھی جلد موقوف ہو گیا، اس کے بعد لینڈ کروزر ایک قدرے بڑے سے نیم پختہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

ڈرائیور نے اگنیشن سوئچ آف کر دیا تھا مگر گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن رہنے دی تھیں وہ سب اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو بھی بیدردی سے نیچے گھسیٹا گیا، اس کے چیخنے چلانے کی متوقع کوشش کے پیشِ نظر ایک بدمعاش نے دوبارہ اس کا

منہ بند کر دیا تھا۔

دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، دروازہ لوہے کا تھا پھر ایک بدمعاش نے نہایت پھرتی کے ساتھ تالا کھول کر دروازے کے دونوں آہنی پٹ اندر کی جانب دھکیل دیئے اور اندر داخل ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے اندھیرے میں شاید سوئچ بورڈ تلاش کر کے اندر کا بلب روشن کر دیا، اس کے بعد وہ سب ڈاکٹر فوزیہ کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے، یہ بلند چھت والا سیلن زدہ سا ہال کمرہ تھا جو کسی گودام کا منظر پیش کر رہا تھا، اندر ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی، سرکنڈوں کے چند مونڈھے رکھے ہوئے تھے، زنگ آلود سے زرعی آلات بھی بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر فوزیہ کو انہوں نے زور سے سامنے پڑی جھلنگا سی کھری چارپائی پر دھکیل دیا اور پھر سب مونڈھوں پر براجمان ہو گئے، ایک بدمعاش نے گودام کا آہنی دروازہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ متوحش نگاہوں سے مونڈھوں پر براجمان ان بدمعاشوں کے خونخوار چہروں کو تکے جا رہی تھی۔

جہانداد سمیت ان سب کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کی سانس سینے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

وہ موت سے بڑھ کر موت کے خوف کا شکار تھی۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ...... ! اب تو تمہارے کو سچ سچ بتانا ہی پڑے گا کہ اس چھوکری سدھوراں کا تُو نے کیا کیا اور اسے کدھر غائب کر دیا ہے۔'' بلند چھت والے ہال کمرے میں جہاں داد کی کھرکھراتی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ کیا جواب دیتی، اس کی تو اپنی حالت پتلی ہو رہی تھی، خوف نے اس کی قوتِ نطق کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا، اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''جواب دے میری بات کا کہاں ہے سدھوراں...... ؟ اب کیوں تیرے کو سانپ سونگھ گیا ہے بابا! پہلے تو بڑی بٹر بٹر انگریزی میں گالیاں دے رہی تھی مجھے بول...... ؟'' جہاں داد غصیلے لہجے میں ڈاکٹر فوزیہ کے متوحش چہرے کو غصے سے گھورتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی وہ مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا، اسے اٹھتا دیکھ کر اس کے کارندے بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''م...... میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ سدھوراں ہسپتال سے بھاگ گئی تھی۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اسے جارحانہ انداز میں کھڑے ہوتے دیکھ کر لرزتی آواز میں بتایا اور ساتھ ہی وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بات سن کر جہاں داد اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

ڈاکٹر فوزیہ کے حلق سے دلخراش چیخ نکل گئی، وہ تھپڑ کھا کر دوبارہ چار پائی پر جا گری، اتنے میں جہاں داد نے اپنی ایک ٹانگ چار پائی کی پائینتی پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے ڈاکٹر فوزیہ کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور اس کا ستا ہوا چہرہ اپنے قریب کھینچ کر غیظ آلود لہجے میں بولا۔ ''میں تیرا جھوٹ سننے کے لیے تجھے یہاں لے کر نہیں آیا...... سچ بتاتی ہے یا پھر میں دوسرا طریقہ استعمال کروں......؟''

''وحشی...... درندے چھوڑو میرے بال، تم نے میرے اوپر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیسے کی......؟ ذلیل انسان......!'' تھپڑ کھانے اور جہاں داد کے جارحانہ رویے نے ڈاکٹر فوزیہ کو بھی یکدم طیش دلا دیا تھا۔

''صدقے ونجاں...... تیری بہادری کے ڈاکٹرنی صاحبہ......!'' جہاں داد زہریلے لہجے میں مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی وحشی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک عود کر آئی تھی۔

''مجھے شرافت سے اس چھوکری سدھوراں کا پتہ بتا دے پھر ہم خود تیرے کو تیرے گھر چھوڑ آئیں گے...... بتاتی ہے یا نہیں؟'' اس نے گویا آخری بار فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے وہی پرانا جواب دہرایا۔

''ہوں......! تو اس طرح نہیں بتائے گی......؟'' جہاں داد نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر ڈاکٹر فوزیہ کے بال ایک بے رحمانہ جھٹکے سے چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد وہ بڑے آرام سے واپس اپنے مونڈھے پر جا بیٹھا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں اپنے کارندوں سے بولا۔ ''بابا ذرا ڈاکٹرنی صاحبہ کے ہوش تو ٹھکانے لگاؤ۔''

اس کے حکم دینے کی دیر تھی کہ اس کے پانچوں کارندے چار پائی پر پڑی فوزیہ کی طرف بڑھے، ان کی آنکھوں میں چمکتی شیطنیت کو دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ سرتا پا لرز اٹھی پھر نجانے اس میں اتنی ہمت کیسے آ گئی کہ وہ یکدم چار پائی سے اٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی، جہاں داد کے کارندے فوراً شکروں کی طرح اس پر جھپٹے، ڈاکٹر فوزیہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی، انہوں نے اسے دوبارہ اٹھا کر چار پائی پر لا پھینکا پھر جب ان پانچوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس سے دست درازی کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر فوزیہ نے چیخنے چلانے کو بے سود جانتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں جہاں داد کو آواز دی۔ ''خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو، میں تمہاری بات مانوں گی۔''

''ٹھہر جاؤ بابا! چھوڑ دو اسے، اب لائن پر آ گئی ہے ڈاکٹرنی صاحبہ......!'' اچانک جہاں داد نے گونجیلی آواز میں کہا تو وہ پانچوں وحشی فوزیہ کو چھوڑ کر واپس مونڈھوں پر آ بیٹھے۔

''ہاں...... ڈاکٹرنی صاحبہ......! اب بتاؤ کہاں ہے وہ چھوکری......؟'' جہاں داد نے پوچھا۔

ڈاکٹر فوزیہ چند لمحے متوحش سانسوں پر قابو پانے کے بعد اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''پپ...... پہلے تم مجھے میرے گھر چھوڑ دو پھر فون پر مجھ سے پوچھ لینا، میں بتا دوں گی۔''

''ہوں...... تو مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتی ہے، بتاتی ہے یا پھر اپنے کارندوں کو حکم دوں؟'' جہاں داد کرخت لہجے میں بولا۔

''بب...... بتاتی ہوں...... سس...... سس...... سدھوراں میرے پاس ہی رہتی تھی پھر میں نے اس کی شادی کر دی تھی۔'' بالآخر ڈاکٹر فوزیہ نے کپکپاتے لہجے میں اسے بتا دیا۔

اس کی بات سن کر جہاں داد کے چہرے پر یکا یک درشتی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا، اس کی اندرونی کیفیت سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کس سے اس کی شادی ہوئی ہے اور اس کا نام کیا ہے......؟''

ڈاکٹر فوزیہ کی خوف زدہ نگاہوں نے جہاں داد کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے طوفان کروٹیں لیتے ہوئے دیکھ لئے تھے، اس لئے اسے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ ہو پا رہی تھی، وہ بولی۔ ''اس کے شوہر کا نام پرویز ہے۔''

''کدھر رہتا ہے وہ......؟''

''قق...... قیوم آباد میں......''

''گھر کا پتہ......؟''

''میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی۔''

''دھندا کیا کرتا ہے وہ......؟''

''اس کا نرسری میں ہوٹل ہے اپنا۔''

''ہوں......'' سوال جواب کے بعد جہاں داد نے سنسناتی ہوئی آواز اپنے حلق سے خارج کی پھر اس کے بعد وہ اپنے مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اس کی چار پائی کے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بولا۔ ''کمینی تیری جرأت کیسے ہوئی ہماری ایک باندی کو دوسرے کے حوالے کرنے کی
تُو نے ہماری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے...... بول اب تیرا کیا حشر کروں، اب تجھے
سدھوراں کی خالی جگہ پُر کرنی پڑے گی۔'' ڈاکٹر فوزیہ اس کی دھمکی پر لرز اٹھی تاہم وہ اپنے
حواس مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو سدھوراں کی مرضی یہی تھی، وہ شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی تھی، تم اس پر
رحم کھاؤ اور خدا سے ڈرو۔''

''میری بات سن......! اپنی بکواس چھوڑ......'' جہاں دادا گلے ہی لمحے اس کی بات
اَن سنی کرتے ہوئے خوں فشاں لہجے میں بولا۔ ''ہم پرویز کا پتہ چلا کر رہیں گے، اگر تیری
بات جھوٹ نکلی تو یاد رکھنا پھر سدھوراں کی جگہ میں تیرے کو اپنے ساتھ گوٹھ لے جا کر حویلی
میں قید کر دوں گا سمجھی......؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کارندوں کو چلنے کا اشارہ کیا پھر جب
بدمعاش یہاں سے جانے لگے تو ڈاکٹر فوزیہ بری طرح پریشان ہو گئی اور جلدی سے چارپائی
سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے...... یہاں......؟'' مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی، وہ سب طوفانی بگولوں کی
طرح باہر نکلتے چلے گئے تھے اور باہر سے وہ آہنی دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا، دوسرے ہی
لمحے ڈاکٹر فوزیہ کو گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی، وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے
لگی اور ساتھ ہی چیخنے چلانے بھی لگی مگر بے سود...... جلد ہی اسے یہ اذیت ناک احساس ہوا
کہ یہ منحوس جگہ یقیناً آبادی سے کوسوں دور ہے۔ گاڑی کی آواز دور ہوتے ہوتے بالکل
معدوم ہو گئی تھی، اب پھر ہر سو گہرے سناٹے کا راج تھا۔

☆======☆======☆

ایک روز شام کو مٹھل ذرا جلدی گھر لوٹا تو خلاف معمول اس کی بیٹی ملوکاں کی بجائے
اس کی بیوی عجیباں نے اس کے آگے روٹی کی ڈلیا رکھی جبکہ ملوکاں رسوئی کے اندر موجود تھی۔
مٹھل منہ ہاتھ دھونے کے بعد اپنے کاندھے پر پڑے میلے سے انگوچھے سے ہاتھ منہ پونچھتا
ہوا کھری چارپائی پر آ بیٹھا اور خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔ عجیباں اس کے قریب ہی
بیٹھی پُرسوچ نگاہوں سے شوہر کو روٹی کھاتا ہوا دیکھ رہی تھی، اس کے چہرے پر گہری سوچ
کی لکیروں کا جال سا بنا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔
جب مٹھل کھانے سے فارغ ہوا تو عجیباں اسے جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے

گلاس میں پانی تھما کر اس کے آگے سے خالی برتن سمیٹ کر رسوئی کی طرف چلی گئی پھر ذرا
دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں چائے کے دو پیالے تھے، ایک اس نے مٹھل کو دیا اور دوسرا
خود سنبھالے اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

پھر چند گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ''ملوکاں کے پیو......! تیرے سے ایک بات کہنی
ہے پر تُو میری کب سنتا ہے۔'' اس نے دانستہ پھوہڑپن سے کہا۔

بے چارہ مٹھل بیوی کا تریا چلتر نہ سمجھتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہلکی
مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اڑی چریی......! میں نے تو ایک عمر صرف تیری سنتے ہوئے ہی
گزار دی، اب بھلا بڑھاپے میں تیری بات نہ سن کر کیا میں نے اپڑاں حقہ پاڑیں بند کروانا
ہے، بول کیا بات کرنی ہے میرے سے...... میں سن رہا ہوں۔''

عجیباں پہلے تو خاموشی سے چند ثانیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''دیکھ ملوکاں
کے پیو......! انسان کو اپنے حالات پہچان کر زندگی گزارنی چاہیے، ہمارے پاس رکھا ہی کیا
ہے جس پر اتنی اکڑ دکھائیں، ایک وقت کی مشکل سے کھاتے ہیں تو دوسرے وقت کے
لالے پڑے رہتے ہیں پھر ان حالات میں ایک جوان بیٹی بھی چھت کے نیچے موجود ہو تو اس
کی بھی فکر الگ پریشان کرتی ہے بلکہ میں تو کہوں روٹی سے زیادہ گھر میں جوان بیٹی کی فکر ہی
زیادہ رہتی ہے۔'' عجیباں اتنا کہہ کر ذرا تھمی۔

مٹھل قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تو
اپڑیں رب سائیں کا ہر وقت شکر ادا کرتا ہوں، بھلا میں کیوں اکڑتا پھروں گا اور رہی بات
جوان بیٹی کی، اسے بیاہنے کی فکر تو ظاہر ہے مجھے بھی ہے۔''

شوہر کی بات سن کر عجیباں ذرا حوصلہ پا کر بولی۔ ''اسی لئے تو کہتی ہوں ملوکاں......
کے پیو...... بیٹیاں تو کیکر کے درخت کی طرح جوان ہونے لگتی ہیں اور جو بیٹیوں والے
ہوتے ہیں ناں وہ بیٹی کے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہی تھوڑا بہت جہیز جوڑتے رہتے ہیں،
ہمارے پاس کیا ہے اپڑیں ملوکاں کو دینے کے لیے؟ ہمارے پاس تو تھوڑے سے لوگوں کو
مانی ٹکر کھلانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں...... ہمیں ہی پوری نہیں پڑتی، بچت کیا ہو، بچت
کریں بھی تو اب وقت کہاں رہا۔''

بیوی کی بات سن کر بے چارہ مٹھل بت بن گیا، حالات ہی کچھ ایسے رہے تھے۔
جو تھوڑا بہت جمع جتھا تھا، وہ نقل مکانی میں خرچ ہو گیا تھا، آج مٹھل کو احساس ہونے لگا تھا
کہ وہ ایک جوان بیٹی کا باپ بھی تھا، بیوی کی باتوں نے اسے آج واقعی ہلا کر رکھ دیا تھا تاہم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ذرا امید بھرے لہجے میں بولا۔ ''ڑی عجیباں...... ! کہتی تو تُو برابر ہے، اب اس کا حل بھی تُو ہی بتا مجھے......''

شوہر کو چاروں شانے چت گرتے پا کر عجیباں کا مقصد پورا ہو گیا اور وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ ''میری اکڑ والی بات یاد رکھی ہوئی ہے ناں تُو نے......؟''

''ہاں...... ہاں...... ! بھلا کون اکڑ رہا ہے......؟'' مٹھل نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''تُو اکڑ دکھا رہا ہے ملوکاں کے پیو......!'' عجیباں نے جیسے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہی اسے یاد دلایا تو مٹھل بے چارہ گومگو کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگا۔

''اپڑیں ملوکاں کو بیاہنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم جس کسی کو بھی اس کا سنگ دیں، وہ اس کا ہمیں کم از کم اتنا عیوضہ (روپیہ) تو دے کہ ہم آسانی کے ساتھ اس فرض کو پورا کر سکیں اور عیوضہ بھی ہمیں پہلے ملنا چاہیے تا کہ ہم بھی کچھ بیٹی کو دے دلا کر اسے آگے پرائے گھر کا کر سکیں۔''

''ایسا کون ہو گا بھلا جو ہماری یہ شرطیں مان لے......؟'' بیٹی کے معاملے میں بے چارے مٹھل کی عقل واقعی ماری گئی تھی۔

عجیباں چند ثانیے توقف کے بعد بولی۔ ''آچر خان......!''

''کک...... کیا...... یہ...... یہ تُو نے کس کتے کا نام لے لیا، مجھے تو اس کمینے کی صورت سے ہی نفرت ہے۔'' مٹھل نے یکدم چراغ پا ہو کر کہا۔

عجیباں فوراً منہ بسورتے ہوئے تند لہجے میں بولی۔ ''دیکھا...... دیکھا......! تیری یہی اکڑ اپڑیں ملوکاں کے لیے تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔''

''اللہ سائیں نہ کرے تُو کیوں ایسے منحوس الفاظ زبان سے نکالتی ہے۔'' مٹھل نے فوراً اسے ڈانٹا۔

''یہ منحوس الفاظ نہیں ہیں ملوکاں کے پیو......! میں حقیقت بیان کر رہی ہوں، پورے گوٹھ میں آچر خان کے سوا کوئی ایسا چنگا مڑس نہیں ہے جو ملوکاں کا پورے دو لاکھ عیوضہ دینے پر تیار ہو اور وہ بھی وقت سے پہلے...... بس ہماری زبان دینے کی دیر ہے۔''

''ہرگز نہیں......! اس بڈھے سے اپڑیں ملوکاں کا بیاہ ہرگز نہیں کروں گا اور تُو بھی کان کھول کر سن لے خالقو کی ماں......! میں خوب جانتا ہوں تیرے کو یہ پٹی کس نے پڑھائی ہے، میں اب تم ماں بیٹے (خالقو) کی سازش سمجھ گیا ہوں۔'' مٹھل ایک دم چراغ پا ہو کر

چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ عجیباں نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ مٹھل نے ہاتھ بلند کر کے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ''بس اب آچر خان کا اس گھر میں بالکل کوئی نام نہ لے۔'' یہ کہہ کر وہ بھناتا ہوا جب اپنی کوٹھری میں داخل ہونے لگا تو رسوئی کی طرف منہ کر کے ملوکاں کو حقہ تازہ کر کے لانے کے لیے کہا۔

ملوکاں کافی دیر سے رسوئی کے اندر بظاہر کام میں مصروف یہ سب باتیں سن رہی تھی، اسے اپنے بڑے بھائی خالقو کے ساتھ اب اپنی ماں بھی بری لگنے لگی تھی، وہ سمجھ گئی کہ دونوں ماں، بیٹے کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ چکی ہے اور وہ دونوں باپ کے خلاف محاذ بنائے ہوئے ہیں، ان حالات نے ملوکاں کو بھی ضدی اور سرکش بنا دیا تھا، ملوکاں نے ماں سے جھگڑا کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ اس کی ماں نے بڑی چالاکی سے اسے بعد میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی تا کہ اسے آچر خان سے شادی کے لیے راضی کر لے پھر مٹھل تو کچھ نہیں کر پائے گا مگر ملوکاں بھی آخر عجیباں کی بیٹی تھی، وہ سردست ماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اس سے جھگڑنا...... کیونکہ ملوکاں، باپ اور بھائی کے گھر سے جانے کے بعد سانول سے ملنے کے لیے پانی بھرنے کے بہانے کافی دیر تک باہر رہتی تھی اور باپ، بھائی کے لوٹنے سے پہلے ہی گھر آ جاتی تھی، ماں اسے کچھ نہیں کہتی تھی مگر پھر ملوکاں نے دل مسوس کر سوچا کہ سانول کے پاس اب وہ بھلا کیونکر جا سکتی تھی، پتہ نہیں کیوں وہ اسے اپنے در سے دھتکارتا ہے شاید اس کی منگیتر سدھوراں کی بے وفائی نے اسے اس قدر عورت ذات سے بدول کر دیا ہے کہ اسے شاید اب ہر عورت سے نفرت ہو گئی تھی حتیٰ کہ اپنی بے وفا منگیتر سدھوراں سے بھی......! اس کی اسی روش نے ملوکاں کو بھی خودسر بنا دیا تھا، اس نے بھی دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اس پتھر کو پگھلا کر رہے گی، اب اس کے پاس آچر خان سے چھٹکارا پانے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وہ کسی طرح سانول سے شادی کر لے، اب وہ دوسرے خطوط پر سانول کو راضی کرنے کا سوچ رہی تھی۔

انسان خطا کا پتلا ہے اور رہے گا، یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں، تلخ حقیقتیں......! محبت کا معیار زندگی ایسے حالات میں تیزی سے بدلتا ہے، ملوکاں کے ساتھ بھی یہی ہوا، اگرچہ وہ سانول سے محبت کرتی تھی مگر سانول، سدھوراں کی بے وفائی کے بعد سے بالکل قنوطی اور اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا تھا، اس طرح وہ ملوکاں سے مسلسل بے اعتنائی برت رہا تھا، اب جبکہ گھر میں آچر خان کا معاملہ زور پکڑنے لگا تھا تو ملوکاں کو تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ کہیں وہ ماں اور بھائی کی لالچی طبیعت کی بھینٹ نہ چڑھ جائے، وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بے چارہ پہلے ہی بوڑھا اور کمزور تھا، وہ بھلا کب تک اس کی ڈھال بن سکتا تھا چنانچہ ملوکاں نے اب سانول کو دوسرے طریقے سے رام کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس نے سانول کے ماما اللہ رکھیو سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا۔

وہ رات ملوکاں نے بے چینی میں کروٹیں بدل کر گزاری، صبح ہوئی، خالقو تو حسبِ معمول نکل گیا اور اب ملوکاں اپنے باپ مٹھل کے کھیتوں پر جانے کا انتظار کرنے لگی لیکن مٹھل اس روز کھیتوں پر نہ جا سکا، اسے بڑا تیز بخار تھا، ویسے بھی وہ آج ساری رات ہی کھانستا رہا تھا، عجیباں نے شوہر کا حال نہ پوچھا البتہ ملوکاں، باپ کو دیکھنے کوٹھری میں داخل ہوئی۔ مٹھل بے چارہ ایک کونے میں پڑا بُری طرح کھانسے جا رہا تھا، ملوکاں جلدی سے پانی کا گلاس لے کر باپ کے پاس آئی اور اسے سہارا دے کر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا، اسے اپنے باپ کا بوڑھا وجود آگ میں تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ''پیو......! تیرے کو تو بہت تاپ چڑھا ہوا ہے، چل اٹھ میں تیرے کو حکیم جی کے پاس لے کر چلتی ہوں۔'' اس نے پریشان ہو کر کہا۔

''تُو کہاں جائے گی میرے ساتھ میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔'' مٹھل کھانسی کے درمیانی وقفوں میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ''دھیئے......! تُو ذرا میرا حقہ لا دے، میرا بدن ٹوٹ رہا ہے۔''

''نہیں پیو......! میں اب تجھے حقہ نہیں پینے دوں گی، چل میرے ساتھ پہلے حکیم جی سے دوائی لے کر آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے باپ کو سہارا دے کر اٹھایا تو مٹھل کھڑے ہو کر اپنی لاک (تہبند) سے بندھی گانٹھ کو ٹٹولنے لگا۔

''اڑے میں نے کچھ روپے باندھ رکھے تھے، دیکھ ذرا دھیئے! ادھر کہیں گرے ہوں گے۔'' وہ پریشان ہو کر بیٹی سے بولا۔

ملوکاں اِدھر اُدھر روپے تلاش کرنے لگی مگر اسے روپے کہیں نظر نہ آئے۔ ''پیو......! روپے تو کہیں نظر نہیں آ رہے، ٹھہر میں ماں سے پوچھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باپ کو سہارا دیئے تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر آئی۔

عجیباں صحن میں موجود تھی، وہ ماں سے بولی۔ ''اماں......! پیو کے پیسے پتہ نہیں کہاں گر گئے ہیں، تیرے پاس ہوں گے تھوڑے سے دے تو ہم جا کر حکیم سے دوائی لے آئیں، پیو کو بڑا تیز تاپ چڑھا ہے۔''

''میرے پاس کدھر سے آئے پیسے......؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''عجیباں......! میں نے رات کو تجھے سو روپے کا نوٹ دیا تو تھا اسی میں سے ہی دے تھوڑے......'' مٹھل اپنی کھانسی ضبط کرتے ہوئے ہانپتی آواز میں بولا۔

عجیباں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''گھر کا سودا نہیں لانا تھا آٹا، دال سب کچھ ہی تو ختم تھا، میں نے سو روپے خالقو کو دے دیا، وہ سودا لے کر آئے گا۔''

''مگر اماں......! اب پیو کی دوائی کیسے آئے گی، حکیم جی مفت میں تو نہیں دیں گے ناں......؟'' ملوکاں نے دکھی دل کے ساتھ ماں سے کہا۔

''میں کیا جانوں، تیرے پیو نے اپڑیں پٹ خالقو سے بنا کر رکھی ہوتی تو وہ اسے خود لے جاتا ناں حکیم کے پاس، اسی لئے تو سمجھاتی ہوں اسے، بڈھے ہو کر جوان اولاد پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔''

''خبردار عجیباں......! آگے ایک لفظ بھی تُو نے نکالا تو......!'' بیوی کی بات سن کر مٹھل یکدم چراغ پا ہو کر چلایا تو اسے بڑی شدت کے ساتھ کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ اپنا سینہ تھامے کھانس کھانس کر بے حال سا ہو گیا۔

ملوکاں، اماں کے سنگدلانہ رویے پر سلگ اٹھی اور اس سے تیز لہجے میں بولی۔ ''اماں......! کچھ تو خیال کر پیو کی حالت دیکھ جو منہ میں آ رہا ہے، بولتی چلی جا رہی ہے۔''

''ہاں...... ہاں......! بڑی آئی اپڑیں پیو کی وکلیت کرنے والی...... یہ تجھے اپڑیں ضد کے آگے بوڑھا کر ڈالے گا جب تیرے کو پتہ چلے گا کہ تیرا ابجن کون تھا۔'' عجیباں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''اماں......! تُو کیا چاہتی ہے میں ایک بڈھے اوباش سے بیاہ دی جاؤں تا کہ تم دونوں ماں، بیٹے کی مٹھی گرم ہو جائے......؟'' ملوکاں کو بھی ماں کی خودغرضی پر غصہ آ گیا، وہ باپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''ہاؤ...... ہاؤ......! تجھے پھر کوئی شہزادہ آئے گا بیاہنے...... ناں......؟''

''میں کہتا ہوں بکواس بند کر اپڑیں، جوان دھی سے اس طرح بولتے ہیں شرم کر......'' مٹھل سینہ تھام کر غصیلے لہجے میں بولا اور پھر کھانسنے لگا۔ عجیباں منہ بسورتی ہوئی اندر کوٹھری میں چلی گئی۔

''دھیئے......! اب رہنے دے نہیں جاتے حکیم کے پاس، پیسے تو ہیں نہیں، وہ دوا کیسے دے گا......؟'' مٹھل نے کھانسی کے درمیان اٹک اٹک کر ملوکاں سے کہا تو ملوکاں کا دل کٹ کر رہ گیا لیکن وہ بھی تہیہ کر بیٹھی تھی بیمار باپ کو حکیم جی کے پاس لے جانے کا لہٰذا بولی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں بیو......! تُو چل تو سہی، ہوسکتا ہے حکیم جی کو ہماری غریبی پر ترس آجائے...
ٹھہر ذرا میں ابھی آئی۔" ملوکاں گھبرا سی گئی تھی اسی لئے اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا...
اب منگل سے بھی بولا نہیں جا رہا تھا، اس پر اب دمے کا سا دورہ پڑنے لگا تھا، اگلے ہی...
اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں، وہ وہ زمین پر ڈھے گیا۔

ملوکاں پریشان ہوگئی، اس نے ہسٹریائی انداز میں ماں کو پکارا۔ "اماں...... بیو کو سنبھ...
......جلدی آ......!" مگر کوٹھڑی میں خاموشی چھائی رہی البتہ اندر سے حقہ گڑگڑانے کی...
آرہی تھی، ملوکاں کا دل ڈوبا جا رہا تھا، باپ کی حالت پر جواب شکستہ سے فرش پر پڑا بری طر...
ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دور کا سفر کر کے آیا ہو۔ ملوکاں روتی چلاتی ہوئی جھگی سے باہر دوڑی...
قریب ہی بنی چاچا سکھیو کی جھگی میں داخل ہوگئی، وہاں چاچا سکھیو کام پر جانے کی تیاری کر...
تھا اور اس کی بیٹی میراں اسے روٹی سے بندھا دسترخوان نما کپڑا تھما رہی تھی۔

"چاچا......! بیو کی حالت...... بہت...... بہت خراب ہو رہی ہے۔" ملوکاں نے دروازے سے چیخ کر روتے ہوئے کہا۔ چاچا سکھیو اس کی طرف دوڑا، میراں اور اس کی ماں بھی پریشان ہو کر بھاگیں، یہ لوگ سب منگل کی جھگی میں داخل ہوئے، دیکھا منگل زمین پر بے سدھ پڑا ہے، ملوکاں نے ہراساں نگاہوں کے ساتھ اپنے باپ کو دیکھا، جو کچھ دیر پہلے دمے کے زیر اثر بری طرح ہانپ رہا تھا مگر اب وہ پُرسکون ہوگیا تھا، ملوکاں کا دل دھک سے رہ گیا۔

"بیو...... بابا......!" دوسرے ہی لمحے ملوکاں نے دلخراش چیخ کے ساتھ باپ کو پکارا، وہ اس کے بے جان جسم پر گر کر رونے لگی، منگل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ مر چکا تھا۔

☆======☆======☆

اچانک نامعلوم سمت سے گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری...... سارنگ بری طرح ٹھٹکا...... اسے اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گولیوں کی صاف جھپک محسوس ہوئی تھی، پھر اگلے ہی لمحے اس کا اونٹ بری طرح چلایا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا، گولیوں کی خوفناک گھن گرج نے اسے یکدم بدحواس کر ڈالا تھا جسے سارنگ نے اپنے حق میں بہتر ہی سمجھا تھا مگر وہ اونٹ کی اس اچانک رفتار سے بوکھلا بھی گیا تھا، وہ اس کے اونچے مخروطی کوہان سے چمٹا ہوا تھا، اس میں اتنا بھی حوصلہ نہیں تھا کہ وہ فائرنگ کرنے والوں کو گردن موڑ کر دیکھ لے، اچانک اس کے عقب میں پھر فائرنگ ہونے لگی اور ساتھ ہی گھر گھراہٹ...

کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں، اب اس کا بھی ماتھا ٹھنکا، اسے اس بات کا پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ انڈین بارڈر سیکورٹی فورس والوں کی نظروں میں آ گیا ہے جو اب تیز رفتار جیپوں میں اس کا تعاقب کر رہے تھے، عقب سے اب مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔

"چورسا ہی" کی اس مخدوش صورت حال پر سارنگ گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا، عقب سے اندھا دھند برسائی جانے والی گولیاں اس کے لگ سکتی تھیں مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ابھی تک ایسی مہلک اور بھولی بھٹکی ہوئی گولی سے بچا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے زیادہ دیر ایسا نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا وہ اب خود بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اس کا اونٹ رکے بغیر دوڑتا رہے۔

مگر اچانک ایک گولی اس کے صحرائی جہاز کے لگ گئی پھر نجانے اس کے اونٹ کو کتنی گولیوں نے زخم پہنچائے کہ دوسرے ہی لمحے وہ دل دہلا دینے والے انداز میں زور سے چیخا اور ڈھتا چلا گیا، یہ تو شکر ہوا کہ سارنگ اس کے گرتے ہوئے پہاڑ جیسے وجود تلے آنے سے بچ گیا، اونٹ کے اچانک لڑھک کر گرتے ہی سارنگ بھی لڑھکنیاں کھاتا ہوا ریت میں خاصی دور تک چلا گیا تھا، اس کا دماغ بری طرح جھنجھنا کر رہ گیا تھا مگر اسے چند خراشوں کے سوا کوئی خاص چوٹ نہ آئی تھی مگر یہ کیا کم تھا کہ وہ اب اپنے نامعلوم حملہ آوروں کی گرفت میں جانے والا تھا، ریت اس کے منہ، آنکھوں اور نتھنوں میں گھس گئی تھی، وہ ابھی اپنا ریت سے اٹا ہوا چہرہ جھٹک رہا تھا کہ اچانک کئی آہنی نالوں کی اس نے اپنے وجود میں چبھن محسوس کی اور بے اختیار اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ سب چھ سات کی تعداد میں تھے، ان کے جسموں کی مخصوص وردی انہیں سرحدوں کا نگہبان ثابت کر رہی تھی، یہ لوگ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز کے اہلکار تھے، ان کے چہروں پر حد درجے سفاکی اور درشتی چھائی ہوئی تھی، قریب ہی ان کی دو مٹیالے رنگ کی بغیر ہُڈ والی جیپیں بھی کھڑی تھیں۔ سارنگ کا دماغ ہنوز چکرا رہا تھا۔ "کھڑے ہو جاؤ، خبردار کوئی غلط حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔" ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں سفاکی سے کہا۔ سارنگ اپنا سر جھٹکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اس کا دل اب بری طرح دھک دھک کر رہا تھا، وہ ہراساں سی نظروں سے ان سب کے قہر آلود چہروں کو تکے جا رہا تھا، ان کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی اور درشتی کھنڈی ہوئی تھی۔

"مدن......! اس کی تلاشی لو......" معاً ان میں سے ایک نے جو وردی پر لگے مخصوص اور اضافی پھولوں کی وجہ سے ان کچھ فیلڈ آفیسر لگتا تھا، اپنے ایک ساتھی سے تحکمانہ لہجے میں کہا تو اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی مگر سارنگ کے پاس سے ایک چھوٹے سے شکاری چاقو کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوا اور کچھ ہاتھ نہیں لگا تب اس ملٹری آفیسر نے ذرا آگے بڑھ کر سارنگ کے چہرے پر زور سے تھپڑ رسید کر دیا، اس کا ہاتھ بھاری ثابت ہوا، تھپڑ کھا کر سارنگ چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا، وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور ریت پر لڑ گیا، فوجی آفیسر کے چہرے پر کرختگی کم نہیں ہوئی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی جی تھری کی مہیب نال ریت پر گر کے بل گرے سارنگ کے سینے سے لگا دی اور لبلبی پر انگلی رکھ کر سفاکانہ غراہٹ سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کون ہو تم اور اس طرح مجرمانہ انداز میں تم نے سرحد پار کرنے کی جرأت کیسے کی......؟''

سارنگ بے چارہ بری طرح بدحواس ہو رہا تھا، اسے صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا تاہم وہ سیٹے لیٹے اس سے لرزتی آواز میں بولا۔ ''مم...... میں...... ایک تھری واسی (تھر کا رہنے والا) ہوں، میرا اونٹ بے قابو ہو گیا تھا اور......!''

''بکواس بند کرو اپنی......'' وہ آفیسر زور سے گرجا پھر اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے قریب کھڑی جیپوں کی طرف بڑھ گیا، اس کے ساتھیوں نے اپنے افسر کا مخصوص اشارہ سمجھتے ہی سارنگ کو دبوچ کر اٹھایا اور جیپ میں لاد کر اپنی چوکی کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوکی زیادہ دور نہ تھی، یہ ایک گارے مٹی کی نیم شکستہ سی مستطیل نما عمارت تھی، جس کے چاروں کونوں پر چھ بائی چھ کی گول کوٹھریاں نما مورچے بنے ہوئے تھے جن کے روشندانوں کے اندر سے اسٹین گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں، ایک جانب بڑا سا انڈین ملٹری کا ٹرک بھی کھڑا تھا، سارنگ کو نیچے اتارا گیا، سارنگ نے دیکھا عمارت کی چھت پر بھی ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے گئے تھے، وہاں بھی چند اہلکار موجود تھے، ایک دو نے اپنے ہاتھوں میں طاقتور دوربینیں بھی پکڑ رکھی تھیں، چھت کے عین وسط میں انٹینا بھی نصب تھا اور ایک چھوٹا سا لاسلکی رابطے کے لیے ٹاور بھی نظر آ رہا تھا۔

سارنگ کو رائفل کے کندے مار کر عمارت کے اندر لایا گیا، وہ ایک بڑے کمرے سے گزر کر ایک پتلی سی سیلن زدہ راہداری میں آ گیا، یہاں سے اسے ایک دوسرے نسبتاً تنگ و تاریک کمرے میں دھکیل دیا گیا، یہ لوہے کا سلاخ دار دروازے والا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک آئرن اسٹول رکھا ہوا تھا اور چھت سے ایک کنٹوپ سا جھول رہا تھا، کمرے میں ان دونوں اشیاء کے سوا اور کچھ نہ تھا، روشندان تک نہ تھا، سارنگ کو دھکیل کر اسٹول پر بٹھا دیا گیا، سارنگ بری طرح پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار تھا، وہ لوگ سب اندر داخل ہو کر اس کی طرف کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ آفیسر بھی دونوں ٹانگیں پھیلائے اس کے سامنے کھڑا اسے غضب آلود نظروں سے گھور رہا تھا، کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی ہم

اچانک سارنگ کو ایسا لگا جیسے عین اس کے سر پر روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا ہو، اسے اپنی آنکھوں میں شدید چبھن کا احساس ہونے لگا، بے اختیار اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپنا چاہا مگر آناً فاناً اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر کس کر باندھ دیا گیا بلکہ اس کی دونوں ٹانگیں بھی اسٹول کے ساتھ مضبوطی سے کس دی گئیں، اب وہ اور اسٹول دونوں لازم و ملزوم ہو گئے تھے، سارنگ کو اب روشنیوں کے امڈتے ہوئے سیلاب کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ اچانک امڈتا ہوا سیلاب اس کے عین سر کے اوپر جھولتے کنٹوپ کی کارستانی تھی جس کا مرضی کے مطابق زاویہ بدلا جا سکتا تھا، اچانک سارنگ کے کانوں میں فوجی افسر کی درشت آواز گونجی۔ ''اب میں جو پوچھوں، اس کا بغیر رکے جواب دیتے جانا۔'' یہ کہہ وہ اپنے ایک ساتھی اہلکار کو مخاطب کر کے بولا۔ ''اشوک......! صندوق ادھر کرو اور اس میں سے ایک کانٹوں والا ہنٹر نکال کے دو۔''

''یس سر......!'' اشوک کی مستعد آواز ابھری۔

''کون ہو تم......؟''

''میں تھری واسی (تھر کا رہنے والا) ہوں۔'' سارنگ نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''یعنی پاکستانی ہو......؟''

''ہاں......!''

''تمہارے اور کتنے ساتھیوں نے سرحد پار کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''میں...... میں اکیلا تھا۔''

''تم اسمگلر ہو یا جاسوس......؟''

''نن...... نہیں...... میں تو محض راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوں، میں ایک عام انسان ہوں۔''

سارنگ نے ابھی اتنا ہی جواب دیا تھا کہ اچانک اس پر جیسے کانٹے دار ہنٹروں کی بارش شروع ہو گئی، کمرہ سارنگ کی اذیت ناک چیخوں سے گونج اٹھا، خار دار ہنٹر کی پے در پے ضربوں نے اس کے وجود کو چھلنی کر کے رکھ دیا تھا، اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے، وہ اسٹول سمیت سیلن زدہ فرش پر گر پڑا تھا، درد اور کرب کی روح کش لہریں اسے اپنی رگیں کاٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، اس میں تو اب چیخنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی، اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، اگلے ہی لمحے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

''مدن، اشوک......! اسے ہوش میں لاؤ۔'' انڈین آفیسر کی تحکمانہ آواز گونجی، اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ہاتھ روک لیا تھا اور بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا، سارنگ اسٹول سمیت بندھا ہوا فرش پر بے سدھ پڑا ہوا تھا، اسے سیدھا کر کے پشت سے سہارا دے کر بٹھا دیا گیا پھر ایک پانی سے بھری بالٹی اس کے چہرے پر اچھال دی گئی، اسٹول کو اب کسی مخصوص طریقے سے فرش پر نصب کر دیا گیا تھا تاکہ سارنگ کا وجود اسٹول پر صرف جھول کر رہ جائے مگر وہ گرے نہیں، دو تین بالٹیاں پانی کی سر پر انڈیلنے کے بعد سارنگ کو ہوش آ گیا، وہ اب بری طرح ہانپ رہا تھا، اس میں تو اب بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

''اب جو میں بولوں، تم نے وہی دہرانا ہے ورنہ تمہارے ہاتھوں، پیروں کے سارے ناخن کھینچ دیئے جائیں گے۔'' انڈین افسر کی سفاک آواز گونجی اور ایک بار پھر سارنگ بری طرح دہشت زدہ نظر آنے لگا۔

''تم پاکستانی انٹیلیجنس کے ایک جاسوس ہو اور غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے ہو۔''

''ہرگز نہیں...... یہ جھوٹ ہے......'' سارنگ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

''ہوں......!'' ایک سرسراتی ہوئی آواز گونجی۔ ''مرلی......! جمبوری لے کر آؤ۔''

تھوڑی دیر بعد سارنگ کو یوں لگا جیسے اس کے پیر کے ایک انگوٹھے کو کسی آہنی جمبوری سے پکڑ لیا ہو پھر اچانک ہی ایک جھٹکے سے کسی نے اس کا ناخن اس آہنی جمبوری سے کھینچ لیا، اذیت کی ایک قیامت خیز لہر اس کے وجود کو چیرتی ہوئی روح تک اتر گئی اور وہ ایک دلخراش چیخ مار کر اسٹول پر بیٹھا بری طرح تڑپنے لگا، اسٹول زمین کے ساتھ نصب کر دیا گیا تھا اور وہ اسٹول سے بندھا ہوا تھا، ایسے میں اس سے پوری طرح سے تڑپا بھی نہیں جا رہا تھا، ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ہی تکلیف کے احساس کو ذرا کم کیا جا سکے مگر ظالم اسے تڑپنے بھی نہیں دینا چاہتے تھے، اب تکلیف اور زیادہ محسوس ہونے لگی، سارنگ کا پورا وجود جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا، ناخن کھنچے انگوٹھے سے بھل بھل خون جاری تھا اور سارنگ کو جیسے نزع کے جھٹکے لگ رہے تھے، وہ انڈین آفیسر اور وہاں موجود دیگر اہلکاروں کو قہر و غضب کے عالم میں دھمکیاں اور گالیاں دے رہا تھا، اس کے اندر کی روح کش اذیت نے یکایک آتش فشاں کا روپ دھار لیا تھا مگر وہ بے بس تھا، جنون، جوشِ غیظ اور اذیت ناک تکلیف سے اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا اور پھر اس کا سر اسٹول پر بندھے بندھے ایک طرف ڈھلک گیا، وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

اسی دن سے سدھوراں اپنے شوہر کی طرف سے کھٹک گئی تھی مگر اس نے سردست اپنے شوہر سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا مگر وہ خود اس کے کچھ ''کہنے'' کی منتظر تھی پھر یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا، دونوں میاں، بیوی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں لیٹے تھے، پرویز نے سگریٹ سلگائی اور دو تین گہرے گہرے کش لینے کے بعد سدھوراں سے بولا۔ ''سدھوراں......! تمہیں یاد ہو گا میں نے تم سے ایک دن کہا تھا کہ ہمیں بعض تلخ حقیقتوں کا ایک سمجھوتے کے تحت سامنے کرنا پڑتا ہے ورنہ زندگی گزارنا مشکل ترین کام بن جاتا ہے، جس طرح میں تمہارے کام آیا اور تم سے شادی کر کے تمہارے ہونے والے ناجائز بچے کی جائز صورت بنا ہوں، اب تمہارا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ تم بھی میرے کام آؤ۔''

سدھوراں کے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل میں جیسے ایک گھونسا لگا، پرویز کا بار بار یہ جتانا کہ اس نے اس سے شادی کر کے اس پر احسان کیا اور اس کے ہونے والے بچے کو باپ کا نام دیا، سدھوراں کے لیے ہمیشہ ذہنی اذیت کا سبب بنتا تھا مگر وہ جواباً کسی قسم کی تلخ گوئی نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ بدستور خاموش رہی۔

''تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو ناں سدھوراں......؟'' معاً پرویز سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے کثیف مرغولے فضا میں بکھیرتا ہوا بولا، اس کی نظریں سدھوراں کے گم صم سے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''جی...... جی......! ہاں......'' سدھوراں کے حلق کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلا۔

''سدھوراں......! یوں تو میں ایک ہوٹل کا مالک ہوں مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے ہوٹل سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی، تم میری بیوی ہو اور اب میری ہم راز بھی اور اب جو بات میں تمہیں بتانے والا ہوں، مجھے یقین ہے تم اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی بہتری کی خاطر وہ بات کسی سے نہیں کرو گی۔'' وہ اتنا کہہ کر تھما پھر بولا۔ ''میرا اصل دھندا منشیات فروشی کا ہے اور میرے شہر میں منشیات اور جوئے کے کئی اڈے بھی ہیں۔'' اس نے جیسے انکشاف کیا اور سدھوراں اندر سے دہل سی گئی، وہ چونک کر پرویز کا چہرہ تکنے لگی، یہ سوچ کر اس کا دل گھٹ کر رہ گیا تھا کہ وہ ایک منشیات فروش کی بیوی تھی۔

''سدھوراں......! اس بھرے پُرے شہر میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہے، یہ کوئی ایک چھوٹا سا گوٹھ نہیں ہے کہ جہاں برائے نام اخراجات ہوں، یہ شہر ہے، یہاں تو پانی بھی پیسوں سے ملتا ہے، یہاں دو نمبر کے دھندے کے بغیر گزارہ مشکل ہے اور پھر جب تمہارا بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے اچھے سے اسکول میں داخل کرا دوں گا، اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بناؤں گا۔''

''سائیں......! تو کیا اس شہر کے سبھی لوگ دو نمبر کا دھندا کرتے ہیں؟'' سدھوراں نے بظاہر سادہ لوحی سے پوچھا۔

''تقریباً......! جو لوگ نہیں کرتے، وہ کسی فٹ پاتھ یا گٹر کے کنارے قابلِ رحم زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔'' پرویز نے تلخ لہجے میں کہا مگر سدھوراں اس کی بات سے بالکل متفق نہ تھی کیونکہ اس نے اپنی محسنہ ڈاکٹر فوزیہ کو بھی دیکھا تھا، وہ محنت اور دیانتداری سے اپنے فرائض کی بجا آوری کرتی تھی اور اللہ کا دیا اس کے پاس سب کچھ تھا۔

''کیا سوچ رہی ہے سدھوراں......؟'' اچانک پرویز نے اس کے گم صم چہرے کو بغور تکتے ہوئے پوچھا۔

''کک......کچھ نہیں سائیں......!'' وہ قدرے گڑبڑا کر بولی، پھر ذرا ہمت کر کے اس نے پوچھا۔''تو سائیں یہاں سب لوگ اگر غلط دھندا کرتے ہیں تو پولیس انہیں پکڑتی کیوں نہیں......؟''

''پکڑتی ہے پولیس مگر یہ لوگ اس کی مٹھی گرم کرتے رہتے ہیں۔'' پرویز نے یکدم کہا۔''مجھے بھی ایک پولیس والا آج کل بہت تنگ کر رہا ہے۔'' پرویز اب دھیرے دھیرے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔''وہ بڑا خرانٹ آفیسر ہے، اس کمبخت نے آج کل میرا لاکھوں کا دھندا چوپٹ کر کے رکھا ہے، میں نے سوچا تھا کہ اس بار مال کی بڑی کھیپ آئے گی تو اسے فروخت کر کے کسی اچھی سی جگہ پر بہت بڑا بنگلہ لوں گا، اس طرح ہم ٹھاٹ باٹھ سے رہیں گے تاکہ جب ہمارا بچہ دنیا میں آئے تو ایک ہنستی کھیلتی آرام دہ زندگی گزارے۔''

پرویز نے اس بار دانستہ سدھوراں کے ہونے والے بچے کے لیے ناجائز کی بجائے ہمارا بچہ کی اصطلاح استعمال کی تھی جس پر سدھوراں کو خاطر خواہ دلی تسکین کا احساس ہوا تھا مگر وہ ہنوز پرویز کی طرف سے بے چینی کا شکار تھی، اب اس نے جھجک آمیز خاموشی کو بالائے طاق رکھ کر پوچھا۔

''سائیں......! آپ کھل کر بات کرو ناں......آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہو......؟''

اس کی بات سن کر پرویز نے سگریٹ کا ایک آخری اور گہرا کش لے کر اسے فرش پر پھینکا اور اپنے پاؤں سے مسلتے ہوئے عجیب سی نظروں سے سدھوراں کی طرف دیکھا پھر ایک اسرار بھری آواز میں بولا۔''سدھوراں......! تھانے کا جو پولیس افسر ہے، اگر وہ کسی طرح راضی ہو جائے تو پھر وہ میرے آگے روڑے نہیں اٹکائے گا دراصل وہ ایک عیاش فطرت

آدمی ہے، تُو اگر اس کا دل موہ لے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔''

سدھوراں بت بنی شوہر کا منہ تکنے لگی، اس کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا شوہر اس قدر بے غیرت نکلے گا کہ اپنی ہی بیوی کا سودا کرے گا، وہ ایک دم پلنگ نما چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے پر قابو پاتے ہوئے قدرے ترش روئی سے بولی۔''سائیں......! یہ آپ کیا کہہ رہے ہو......اپنی عزت کو آپ دوسرے کی جھولی میں ڈالنا چاہتے ہو......آپ کو شرم آنی چاہئے۔''

''ایسے دھندھوں میں یہ سب چلتا ہے سدھوراں......!''

''مگر میں نہیں چل سکتی اور تجھے رب سائیں کا واسطہ مجھ سے پھر کبھی دوبارہ ایسی گندی بات نہ کرنا، شہر میں ایسی عورتیں بہت ہیں، کوئی بھی خرید کر اس مردود کی جھولی میں ڈال دے لیکن......!''

''بکواس بند کر اپنی اور بیٹھ جا میرے سامنے......'' دفعتاً پرویز نے اسے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا پھر کھڑے ہوتے ہوئے اس کے ہراساں چہرے پر اپنی برماتی ہوئی نظریں گاڑ کر بولا۔''تُو کیسی بیوی ہے اپنے شوہر کی خاطر اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی؟''

''یہ اتنا سا کام ہے سائیں......؟'' سدھوراں روہانسے انداز میں بولی۔''یہ اتنا سا کام تو میری روح کی موت ہے، اس سے تو اچھا ہے تم مجھے اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔''

''تیرا نہیں میں تیرے ہونے والے ناجائز بچے کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر ڈالوں گا۔'' پرویز یکدم ابلی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کر بولا۔''اس وقت تیری غیرت اور شرافت کہاں تھی جب تُو نے اپنے بوڑھے ماں، باپ اور اپنے منگیتر کی خاطر ایک وڈیرے زادے کی باندی بننا قبول کر لیا تھا، میں نے تو پھر بھی تیرے ساتھ شادی کر کے تجھے اور تیرے ہونے والے ناجائز بچے پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''سائیں......! وہ......وہ......میری ایک مجبوری تھی......'' وہ شدید ذہنی کرب کی وجہ سے رو پڑی مگر پتھر دل پرویز کو اس کی حالت پر رحم نہ آیا اور وہ آخری بار فیصلہ کن لہجے میں اس سے بولا۔

''دیکھو سدھوراں......! تیرے اور تیرے ہونے والے بچے کے لیے یہی بہتر ہے کہ تُو میری بات مان لے ورنہ تُو اپنے بُرے بھلے کی خود ذمہ دار ہو گی اور ہاں اپنی اس ڈاکٹرنی کی ہوا دماغ میں مت رکھنا، وہ بار بار ایسی بدچلن لڑکی کو پناہ نہیں دے گی۔'' طعن و

تشنیع کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے الم نصیب سدھوراں کا کلیجہ چھلنی کرتا ہوا پرویز کمرے سے نکل گیا اور سدھوراں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے رونے لگی۔

پرویز نے اسے کل تک سوچنے کی مہلت دی تھی، مگر پھر وہ کل کبھی نہ آسکی۔

یہ اس سے اگلے دن صبح کا ذکر ہے۔

پرویز حسب معمول علی الصباح ناشتہ کر کے گھر سے نکل گیا اور سدھوراں بے دلی کے ساتھ روزمرہ کے گھریلو کام کاج میں مصروف ہوگئی، وہ ساری رات نہیں سو سکی تھی، پرویز کی زہریلی گفتگو اور اس کے ہونے والے بچے کے بارے میں اس کی بار بار ناجائز کی تکرار نے سدھوراں کو شوہر سے متنفر کر دیا تھا۔

اس کا وجود چھلنی ہو کر رہ گیا تھا، کام میں بھی اس کا دل نہ لگا، وہ اپنے کمرے میں آ کر اپنی حرماں نصیبی پر چپکے چپکے آنسو بہانے لگی، ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ وہ یہاں سے چلی جائے، ہمیشہ کے لیے واپس اپنی محسنہ ڈاکٹر فوزیہ کے پاس مگر پھر وہ کڑھتے دل کے ساتھ سوچتی کہ اسے بار بار اپنی محسنہ پر بوجھ نہیں بننا چاہیے، اگرچہ وہ اس کے پاس چلی بھی جاتی تو آگے چل کر اس کی محسنہ کو اور اس کے گھر والوں کی عزت بھی داؤ پر لگ سکتی تھی تو پھر وہ کیا کرے......؟ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے، جب وہ انتہائی مایوسی کی حدود میں داخل ہونے لگتی تھی تو اچانک ایک ننھا سا وجود اس کی چشم تر میں ہمکتا ہوا رقصاں ہونے لگتا اور اس خواہش کا بھی گلا گھونٹ دیتی۔

دفعتاً باہر دروازے پر دستک کی آواز ابھری، اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور صحن میں آ گئی، دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ باہر کون ہو سکتا ہے؟

''کون ہے......؟'' اس نے بالآخر دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

''دروازہ کھولو، ڈاکٹر صاحبہ نے بی بی سدھوراں کے لیے کچھ چیزیں بھیجی ہیں اور ساتھ ہی ان کا پیغام بھی لایا ہوں۔''

باہر سے ایک اجنبی مردانہ آواز ابھری مگر چونکہ اس کی محسنہ ڈاکٹر فوزیہ کا نام لیا گیا تھا، اس لیے سدھوراں نے بلا جھجک آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا پھر سامنے نظر پڑتے ہی اس کی روح فنا ہوگئی۔

سامنے جہاں دادا اپنے چند حواریوں کے ساتھ کھڑا اسے زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا۔

جہاں دادا کو دیکھ کر سدھوراں کی سانس سینے میں اٹک گئی تھی پھر دوسرے لمحے اپنی بقا کا جذبہ خوف کے جذبے پر حاوی ہونے لگا۔ سدھوراں پھرتی کے ساتھ واپس صحن کی طرف پلٹی، صحن کے ایک کونے سے سیڑھیاں اوپر چھت کی طرف جاتی تھیں، سدھوراں چیختی چلاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور جلدی جلدی زینے طے کرنے لگی، اس کے عقب میں جہاں دادا اور اس کے ساتھی اندر گھس آئے اور وہ بھی سدھوراں کے پیچھے سیڑھیوں کی طرف لپکے، ایسے نازک اور خطرناک لمحات میں سدھوراں کی حاضر دماغی اس کے لیے سود مند ثابت ہوئی کیونکہ وہ اگلے ہی لمحے چھت پر پہنچ چکی تھی۔ چھت بالکل سپاٹ تھی، اوپر کوئی کمرہ نہ تھا صرف تین فٹ کی چہار دیواری تھی، وہ چھت پر آتے ہی حلق کے بل چیخنے چلانے اور مدد کے لیے شور مچانے لگی۔ یہ گنجان محلہ تھا، گھروں کی دیواریں اور چھتیں تقریباً متصل تھیں، ادھر جہاں دادا اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ بات تشویش کا باعث تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس علاقے میں پٹھان اور ہزارے کے لوگ آباد تھے، اس طرح ایک تنہا عورت کے گھر میں گھسنے پر ان لوگوں کو تھانے لے جانے سے پہلے خود تو اضع کر ڈالتے بس پھر کیا تھا، انہوں نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس ہولیا جائے اور یوں جب تک لوگ اکٹھے ہوئے، جہاں دادا اپنے کارندوں کے ساتھ اپنی جیپ میں فرار ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

ایک ایک پل ڈاکٹر فوزیہ کے سینے پر بھاری سل کی طرح بیت رہا تھا، اسے اب خود سے زیادہ اپنے مما، پاپا کی فکر ستانے لگی تھی، وہ اس کی اچانک گمشدگی پر کس قدر ہلکان ہو رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر فوزیہ نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے، رات کے بارہ بج چکے تھے، وہ شام پانچ بجے گھر سے نکلی تھی ڈاکٹر جواد کے ساتھ...... اب سات گھنٹے گزر چکے تھے، جہاں دادا اور اس کے کارندوں نے اس کا موبائل بھی چھین لیا تھا ورنہ اپنے مما، پاپا سے رابطہ کر سکتی تھی، اسے ڈاکٹر جواد کا بھی خیال تھا، جانے وہ کہاں ہوگا۔

ڈاکٹر فوزیہ نے یہ شکر کیا تھا کہ جہاں دادا اور اس کے کارندوں نے اس کے ہاتھ، پاؤں نہیں باندھے تھے۔

گودام کے اندر ایک بیمار سا بلب روشن تھا، ڈاکٹر فوزیہ جھٹکا چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، باہر سناٹا طاری تھا، وہ دروازے کے قریب آئی اور اسے کھینچ کر دیکھا، وہ باہر سے بند تھا شاید تالا بھی لگا ہوگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر فوزیہ واپس مڑی اور بغور گودام کی شکستہ دیواروں کا جائزہ لینے لگی، جگہ جگہ سے دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا اور ان سے سیلن زدہ اینٹیں جھانک رہی تھیں، خاصی بلندی پر اسے روشندان کے نام پر ایک روزن سا نظر آیا، وہاں سے چاند کی مدہم روشنی اندر آ رہی تھی، اس نے ایک گہری سانس لے کر آس پاس بکھرے الا بلا سامان پر ڈالی پھر آگے بڑھ کر زنگ آلود اور پرانے زرعی آلات کا جائزہ لینے لگی، وہ کچھ سوچ کر واپس دروازے کی طرف پلٹی اور کوئی جھری تلاش کرنے لگی، جلدی ہی اسے ایک ایسی باریک اور متوازی جھری دکھائی دے گئی جو دروازے کے قبضوں کے قریب بنی ہوئی تھی، فوزیہ نے فوراً اپنی ایک آنکھ وہاں لگا دی، سامنے اسے ایک چھوٹی ڈیوڑھی نما جگہ سی نظر آئی جو سنسان تھی، اس کے بعد کوئی دروازہ نہ تھا، باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، ڈاکٹر فوزیہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے حلق کے بل چیخ کر شور مچانا شروع کر دیا۔

''کوئی ہے..... مجھے یہاں سے نکالو..... مجھے یہاں قید کیا ہوا ہے..... کوئی ہے..... خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' فوزیہ چیختے چیختے بے دم سی ہو گئی، مارے خفت اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر باہر وہی گہری خاموشی چھائی رہی، فوزیہ کو اب یہ اذیت ناک احساس ہونے لگا تھا کہ یہ جگہ آبادی سے دور کسی ویران مقام پر تھی اور یقیناً یہ گودام نما عمارت جہاں داد کی ملکیت ہو گی۔ ڈاکٹر فوزیہ کا حلق دکھنے لگا تو وہ گودام کے اس حصے کی طرف بڑھی جدھر زنگ آلود زرعی آلات بکھرے ہوئے تھے، وہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے ایک آہنی راڈ دکھائی دے گئی، وہ اس نے اٹھائی اور پھر دوبارہ دروازے کی طرف لپکی، قریب پہنچ کر وہ آہنی سلاخ سے زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی، وہ بری طرح سلاخ سے فولادی زنگ آلود دروازہ پیٹے جا رہی تھی حتیٰ کہ بے دم سی ہو گئی، وہ چند لمحے رک کر زور زور سے ہانپنے لگی اور باہر سے کسی کی سن گن لینے کی کوشش کرنے لگی لیکن بے سود..... باہر وہی منحوس خاموشی کا راج تھا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ باہر دور دور تک کس قدر خوفناک ویرانہ بکھرا ہوا تھا، وہ مایوس سی ہو کر دوبارہ چارپائی پر بے دم ہو کر گر پڑی، مایوسی، بے بسی نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا، وہ کافی دیر تک اسی طرح مضطرب سی چارپائی پر بیٹھی رہی۔

وقت گزر رہا تھا، بھیدوں بھری رات بیت رہی تھی اور فوزیہ کے اندر اندیشوں اور وسوسوں کے پریشان ناگ پھن اٹھائے اس کی چشم کے سامنے رقصاں ہونے لگے، ڈاکٹر فوزیہ نے مضطربانہ انداز میں دوبارہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، رات کا سوا بج رہا تھا، اس

کی اندیشناک پریشانی اب فزوں تر ہونے لگی معاً اسے سدھوراں کا خیال آیا اور وہ گھٹ کر رہ گئی، اسے سدھوراں کی بھی پریشانی لاحق ہونے لگی تھی، اس مردود جہاں داد نے اسے مجبور کر کے سدھوراں کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا تھا، اب نجانے وہ سدھوراں یا اس کے شوہر پرویز کے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اس کا تصور کر کے ہی فوزیہ لرزہ براندام ہوئی جا رہی تھی۔

اسے اب تھوڑا بہت پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ کاش وہ جہاں داد کو سدھوراں کے بارے میں کچھ نہ بتاتی اور اپنی بات پر ڈٹی رہتی مگر وہ کیا کرتی، وہ خود جہاں داد اور اس کے گماشتوں کے آگے بے بس اور مجبور ہو گئی تھی، اگر وہ ان کی بات نہ مانتی تو ان سب کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جاتی، اپنی عزت بچانے کی خاطر اس نے مجبوراً ایسا کیا تھا۔

فوزیہ کا خیال کا تھا جہاں داد سچ بتانے کے بدلے میں اسے چھوڑ دے گا اور بعد میں فوزیہ گھر پہنچ کر سدھوراں اور اس کے شوہر پرویز کو جہاں داد اور اس کے کارندوں کے خطرناک عزائم کے بارے میں خبردار کر دے گی لیکن جہاں داد اس کی سوچ سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوا تھا، اس نے پھر بھی فوزیہ کو آزاد نہ کیا تھا بلکہ بدستور اسے یرغمال بناتے ہوئے پہلے اس کے سچ کی تصدیق کرنے کے لیے سدھوراں کو اغوا کرنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا، غرض ڈاکٹر فوزیہ کو ایک ساتھ کئی پریشانیوں نے آ گھیرا تھا۔

اچانک ایک آواز پر ڈاکٹر فوزیہ بری طرح ٹھٹکی، وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف دوڑی اور قریب سے ان آواز پر کان دھرنے لگی تب اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی بارات تھی کیونکہ یہ آوازیں شہنائیوں اور ڈھول، ڈھماکوں اور نفیریوں کے گونجنے کی تھیں ڈاکٹر فوزیہ کو اس سمے بارات کے گزرنے پر تعجب تو ہوا مگر پھر یہ سوچ کر کہ یہ تقریبات ہی ایسی ہوتی ہیں، بعض چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تو رات گئے تک دھوم دھڑکا مچا رہتا ہے بہرطور پر ڈاکٹر فوزیہ یہ خوش ہو گئی تھی، اسے اب اس منحوس قید خانے سے رہائی کی امید ہو چکی تھی پھر جیسے ہی وہ شور مچاتی ہوئی بارات ذرا قریب آئی، ڈاکٹر فوزیہ نے مدد کے لیے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لوہے کی سلاخ سے آہنی دروازہ بھی بری طرح پیٹنے لگی مگر جلد ہی اس پر یہ بھیانک اور غم انگیز حقیقت منکشف ہوئی کہ اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی مثل تھی کیونکہ بارات جیسے ہی قریب آئی تو اس کے ڈھول، باجوں کا شور اس قدر تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کے چیخنے کی آواز طوطی کی آواز ثابت ہوئی تھی۔

پھر ذرا دیر بعد بارات گزر گئی، ایک بار پھر وہی منحوس سناٹا آسیبی چمگادڑوں کی مانند

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غیر مرئی دیواروں سے چمٹ گیا تھا، ڈاکٹر فوزیہ نے بے بسی اور مایوسی کے شدید احساس تلے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلاخ پرے پھینک دی اور وہیں دروازے کے ساتھ کمر اور پشت ٹکائے نیچے کھردرے فرش پر بیٹھی، اب وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

☆======☆======☆

بے چارے بوڑھے مٹھل ہاری کی بساط ہی کیا تھی، اس کی موت پر کسی نے چار آنسو بھی نہ بہائے تھے اور تدفین بھی اس کی اس طرح کی تھی جیسے کسی جانور کو گڑھے میں پھینک آئے ہوں۔ ماں، بیٹے خوش تھے ہی اندر سے مگر ملوکاں اب خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی اور یہ ملوکاں ہی تھی جو اپنے باپ کی موت پر خوب روئی تھی۔

عجیباں اور خالقو دونوں کا راستہ اب صاف ہو گیا تھا، ان کا خیال تھا کہ ملوکاں میں اب آچر خان سے شادی سے انکار کرنے کی ہمت نہ ہو گی مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ ملوکاں، باپ کے مرنے کے بعد خودسر ہو جائے گی، اس کا ان دونوں ماں، بیٹے کو تب اندازہ ہوا جب مٹھل کی موت کو سات روز گزرنے کے بعد خالقو نے ماں سے ملوکاں کی آچر خان سے شادی پر رضامندی لینے کو کہا۔

وہ شام کا وقت تھا، خالقو خلافِ معمول جلد گھر آ گیا تھا اور باہر صحن میں کھری چارپائی پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا، عجیباں اندر کوٹھری میں بیٹی ملوکاں کے پاس بیٹھی باتوں میں مصروف تھی۔

''دھیئے......! اب تو تیرا پیو بھی نہیں رہا، گھر کا چولہا کیسے جلے گا، ہمیں اپنی روٹی کے ہی لالے پڑے ہیں اوپر سے تیرا بوجھ بھی سر پر ہے تُو اپڑیں ضد چھوڑ دے اور اپنے گھر کی ہو جا۔''

ماں کی بات سن کر ملوکاں نے تیز نظروں سے اس کو گھورا پھر تلخی سے بولی۔ ''کیوں امڑ......! ادا خالقو مر گیا ہے، کیا وہ کما نہیں سکتا، بوڑھے باپ کی کمائی پر تو ہاتھ صاف کر رہا تھا، اب کیا میری کمائی کھائے گا، میں کھیتوں میں مزدوری کر سکتی ہوں پر تم دونوں ماں بیٹے کان کھول کر میری بات سن لو، میں مرتی مر جاؤں گی مگر اس منحوس بڈھے سے شادی نہیں کروں گی۔''

آخری الفاظ ملوکاں نے جان بوجھ کر باہر صحن میں موجود خالقو کو سنانے کے لیے کہے تھے، یہی سبب تھا کہ خالقو غصے سے بھناتا ہوا چارپائی سے اٹھا، بیڑی کا ٹوٹا پاؤں تلے مسلا اور اندر کوٹھری میں آ گیا۔

''کیا بکواس کرتی ہے تو شادی نہیں کرے گی تو کیا کسی کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا ارادہ ہے تیرا بول......؟'' وہ قہر آلود نظروں سے ملوکاں کی طرف گھور کر بولا۔

ملوکاں، بھائی کے لہجے اور چڑھے ہوئے تیوروں سے مرعوب ہوئے بغیر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ''میں اتنی بے غیرت نہیں ہوں جو گھر سے بھاگوں اور تُو کون سا غیرت مندوں والا کام کر رہا ہے کہ چند ٹکوں کے عوض تُو مجھے ایک بوڑھے عیاش کے پلے سے باندھنا چاہتا ہے۔'' ملوکاں کے کھرے جواب پر خالقو اس پر چڑھ دوڑا۔ جب تک عجیباں بیچ میں آتی، خالقو، ملوکاں کے قریب پہنچ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کر چکا تھا۔

''ذلیل کمینی......! اپڑیں وڈے بھا کے سامنے زبان چلاتی ہے۔''

تھپڑ کھا کر ملوکاں بھی زخمی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے بولی۔ ''تت...... تجھے شرم نہیں آتی جوان بہن پر ہاتھ اٹھاتا ہے، چری موالی وڈا بھا......! (بڑا بھائی) بنتا ہے تو پہلے جا کر روٹی تو کما، بوڑھے باپ کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا، اب میرے عیوضے کی روٹی کھائے گا۔''

ملوکاں کا چہرہ دکھ اور غصے کے مارے سرخ ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

خالقو غصے میں لال پیلا ہو گیا اور ملوکاں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے، تکلیف کی شدت سے ملوکاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عجیباں یکدم بیٹے کے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولی۔ ''اڑے چھورا......! حیا کر، یہ کیا کرتا ہے، چھوڑ ادی کے بال...... چھوڑ......!''

ماں کے درمیان میں آنے پر خالقو نے ایک جھٹکے سے ملوکاں کے بال چھوڑ دیئے۔

ملوکاں ہانپنے لگی پھر وہ اسی لہجے میں دونوں ماں، بیٹے کو گویا خبردار کرتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں کان کھول کر سن لو، اب وہ وقت نہیں رہا، تم لوگ مجھے مجبور اور کمزور سمجھ کر اپنے لالچ کی بھینٹ چڑھا دو، اگر دوبارہ مجھ پر اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کی تو میں سیدھی تھانے چلی جاؤں گی۔''

اس کی دھمکی نے جیسے جلتی پر تیل کا کام کیا، خالقو کا پھر دماغ الٹنے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اسے زدوکوب کرنے کی کوشش کرتا، عجیباں فوراً دونوں کے بیچ میں آ گئی اور بیٹے سے بولی۔ ''تُو جا پٹ......! باہر جا، میں اپڑیں دھی کو سمجھا لوں گی...... جا تُو......!'' ماں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے سمجھانے بجھانے پر وہ غصے سے ملوکاں کے خوں رنگ چہرے کو گھورتا ہوا پاؤں پٹخ کر کوٹھری سے باہر چلا گیا، عجیباں پیار سے ملوکاں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ملوکاں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تُو بھی چلی جا امڑ..... اور مجھے سمجھانے کی بجائے باہر جا کر اپڑیں لاڈلے پت کو سمجھا..... جا!'' مائی عجیباں بیزار منہ بنا کر باہر صحن میں آ گئی۔

''کیا ہوا امڑ.....؟ وہ مانتی ہے یا پھر.....!'' باہر چارپائی پر غصے میں بھرے بیٹھے خالقو نے ماں سے پوچھا۔

''اڑے ذرا تُو ماٹھ کر یوں جوان بہن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔'' ماں نے اسے سمجھایا تو وہ ماں کو بھی غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔

''امڑ.....! تُو بھی اس کی طرف داری کر رہی ہے.....؟''

''اڑے چریا چھوکرا.....! میں اس کی طرف داری نہیں کر رہی، ذرا صبر سے کام لے۔'' عجیباں نے کہا پھر اس کے قریب آ کر ہولے سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھ تُو فکر نہ کر، میں اس کی ماں ہوں، آہستہ آہستہ اسے سمجھا لوں گی، وہ میری بیٹی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، اگر ہم نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ ہماری عزت کا جنازہ لے کر تھانے پہنچ جائے گی پھر پورے گوٹھ کے لوگ تھو..... تھو کریں گے ہم پر.....!''

مائی عجیباں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے ملوکاں کو شدید غصے کے عالم میں کوٹھری سے نکلتے دیکھا پھر اسے دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر خالقو نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''رک جا ملوکاں.....! کدھر جا رہی ہے؟''

بھائی کی بات سن کر ملوکاں کے قدم رک گئے اور وہ بھائی کے چہرے پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میں چاچا سکھیو کے ہاں جا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خالقو کے جواب کا انتظار کیے بغیر روتی سسکتی ہوئی اپنی جھگی سے باہر نکل آئی۔

بازو میں ہی چاچا سکھیو کی جھگی تھی، وہ اپنی اجرک سے آنسو پونچھتی ہوئی چاچا سکھیو کی جھگی میں داخل ہو گئی، سامنے ہی صحن میں بچھی کھری چارپائی پر چاچا سکھیو روٹی کھا رہا تھا، میراں اور اس کی ماں بھی وہیں صحن میں ہی موجود تھیں، وہ ملوکاں کو اس حالت میں دیکھ کر چونک سے گئے، چاچا سکھیو کو دیکھ کر ملوکاں کے سارے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ روتی ہوئی اس کی طرف لپکی، چاچا سکھیو بھی اپنی بھتیجی کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو اور روٹی سے ہاتھ کھینچ کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا، ملوکاں چاچا سائیں پکارتی ہوئی اس سے

لپٹ گئی اور اس کے باپ جیسے شفیق سینے پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، چاچا سکھیو بے چارہ پریشان ہو گیا، دوسرے لمحے وہ ملوکاں کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ ''میڈی دھی.....! کیا ہوا.....؟ خیر تو ہے، کسی نے تجھ پر گندی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے تو بتا، قسم مرشد کی کلہاڑی سے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا، جلدی بتا.....!'' اس کی آواز جوش میں کپکپا رہی تھی مگر ملوکاں مسلسل روئے چلی جا رہی تھی، اتنے میں دروازے پر مائی عجیباں گھبرائی ہوئی نمودار ہوئی۔

''بھا جائی.....! کیا بات ہے، دھی ملوکاں کو کیا ہوا ہے؟'' اپنے مرحوم بھائی مٹھل کی بیوی کو دیکھ کر سکھیو نے اس سے پوچھا۔

عجیباں یکدم پریشان ہو کر بولی۔ ''کک..... کچھ نہیں ہوا، یہ تو ایسے ہی روتی ہوئی ادھر آ گئی۔ چری چھوکری.....!'' یہ کہہ کر وہ اپنی بیٹی ملوکاں کو پیار سے چھوتے ہوئے بولی۔ ''چل نی دھیئے.....! کیوں ہر وقت اپڑیں چاچا سائیں کو پریشان کرتی ہے۔''

''نہیں.....! میں اب اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔'' ملوکاں نے نفرت سے ماں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے چاچا سکھیو سے بولی۔ ''چاچا.....! تُو مجھے یہاں رکھ لے، پیو کے مرنے کے بعد میں بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔''

''اڑے میڈی دھی.....! کون کہتا ہے تُو یتیم ہے، میں زندہ ہوں ابھی، تیرے پیو کے برابر ہوں، تُو میڈا اپڑاں خون ہے۔'' چاچا سکھیو نے محبت بھرے جوش سے کہا۔ پھر عجیباں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بھا جائی.....! تُو جا واپس، اسے ادھر ذرا اپڑاں بوجھ ہلکا کرنے دے، میں اسے بعد میں لے آؤں گا۔''

دیور کی بات پر عجیباں شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگی مگر پھر ناچار خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ ادھر میراں نے ملوکاں کو تھام لیا تھا، اس کی ماں بھی ملوکاں کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی، چاچا سکھیو کو کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ گھر سے باہر کا نہیں بلکہ اندر کا ہی ہے جس کی تفصیل ملوکاں ہی صحیح طرح بتا سکتی ہے، اس لیے اس نے اپنی بھابی سے کچھ استفسار کیے بغیر اسے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلتا کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملوکاں اپنی سسکیاں ضبط کیے سکھیو چاچا کو اصل بات سے آگاہ کر رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو گھور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا، وہ گھبرا سا گیا مگر پھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے ہی لمحے اسے اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے میں درد کی شدید لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس کے ہوش میں آنے سے پاؤں کی اذیت ناک تکلیف بھی جاگ اٹھی تھی، وہ ہنوز رسن بستہ تھا اس آئرن سٹول پر اور اسی جگہ پر جہاں تھوڑی دیر پہلے اس پر تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔

سارنگ کبھی تکلیف کے مارے کراہنے لگتا تو کبھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہراساں انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتا۔

ناخن نچے انگوٹھے کی تکلیف اب بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی تاہم اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا زخم ننگا نہیں تھا، اس کی پٹی کر دی گئی تھی، وہ ہونٹ بھینچے اپنے وجود میں اٹھنے والی کرب انگیز لہروں پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھا۔

ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسے آہٹ سنائی دی، اس کے بعد سامنے اندھیرے میں اسے روشنی کی باریک متوازی لکیری بنتی نظر آئی جو دوسرے ہی لمحے چوڑی ہوتے ہوئے ایک روشن چوکھٹ میں بدل گئی، کسی نے اس قید خانے کا دروازہ کھولا تھا۔

سارنگ پریشان سا ہو گیا، وہ سمجھ گیا کہ اس پر پھر تشدد کیا جانے والا ہے، اسے سامنے روشن چوکھٹ پر ایک وردی پوش نظر آیا، اس کے ہاتھ میں کھانے کے نام پر ایک ٹرے نما برتن تھا، اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے ایک ہاتھ سے سوئچ ٹٹول کر کمرے میں روشنی کر دی تھی، وہ وردی پوش اہلکار سارنگ کے قریب آیا، فرش پر ٹرے رکھ دی، سارنگ نے قدرے طمانیت محسوس کی، وہ اس کے لیے کھانا لایا تھا، اس وردی پوش اہلکار کے کاندھوں پر گن جھول رہی تھی، وہ فرش پر ٹرے رکھنے کے بعد سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے سارنگ کے پژمردہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارے ہاتھ، پاؤں کھول رہا ہوں مگر خبردار کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ بری طرح پچھتاؤ گے۔'' یہ کہہ کر وہ سارنگ کے قریب آیا اور اس کے ہاتھوں، پیروں کو کھولنے لگا، سارنگ بے چارہ بے رحمانہ تشدد کے بعد ویسے ہی ادھ موا ہو رہا تھا، اس میں تو مزاحمت کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی بہر طور وردی پوش اہلکار اپنے تئیں محتاط انداز میں سارنگ کو کھولنے کے بعد کمرے سے فوراً باہر نکل گیا اور عقب میں دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔

اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی سارنگ نے سب سے پہلے اپنے زخمی انگوٹھے کو دیکھا، وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی، انگوٹھے میں زخم کی وجہ سے اسے اپنی دائیں ران کی نیچے والی جگہ پر گلٹی سی بنی محسوس ہو رہی تھی، سارنگ کو بھوک تو نہ تھی البتہ پیاس کی شدت سے اس کا

حلق سوکھ رہا تھا، اس نے کھانے ٹرے کی طرف دیکھا جہاں پانی کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔

سارنگ بہ وقت تمام اسٹول سے اٹھنے لگا تو اچانک اسے اپنے زخمی انگوٹھے کی تکلیف میں اضافہ محسوس ہوا، وہ بے اختیار کراہ کر رہ گیا، اس زخم نے اسے معذور سا کر ڈالا تھا مگر سارنگ معذور بننا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس نے دوبارہ ہمت کی اور زخم سے ابھرتی ہوئی ٹیسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا ٹرے کے قریب آیا اور پھر فرش پر بیٹھ گیا، اس نے گلاس کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ بڑھایا، پانی تھا ہی کتنا...... وہ غٹا غٹ، ایک ہی سانس میں سارا پی گیا، مقدور بھر پیاس بجھانے کے بعد وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا، وہ اب اس قید خانے سے فرار کے بارے میں سوچنے لگا مگر سر دست اپنے مفر کی ایک ذرا سی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا، اس نے سوچا کہ وہی وردی پوش اہلکار یقیناً ذرا دیر بعد یہاں برتن لے جانے آئے گا، اگر کسی طرح اس تنہا اہلکار پر قابو پا لیا جائے تو کچھ نہ کچھ فرار کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔

تب سارنگ نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے انگوٹھے کے زخم کی چنداں پروا کیے بغیر اس مسلح وردی پوش اہلکار کی گن کو اس سے چھیننے کی کوشش کرے گا پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

وہ اب شدت سے اس کے دوبارہ لوٹنے کا انتظار کرنے لگا، متوحش اور غیر یقینی حالات دگرگوں کا ایک ایک لمحہ موت کی دستک دیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اسے اپنی کنپٹیاں جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

کافی دیر گزر گئی مگر کوئی اندر نہ آیا حالانکہ سارنگ کا خیال تھا کہ جو وردی پوش اسے کھانا دے کر گیا ہے، وہ واپس بھی لوٹے گا مگر ہنوز ایسا نہ ہوا، وہ کسی کے آنے کا منتظر ہی رہا۔

سارنگ کو اس بات پر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ آخر یہ انڈین آفیسر اسے پاکستانی جاسوس بنانے پر کیوں تلا ہوا ہے جبکہ اس کے پاس سے ایسی کوئی شے یا کوئی خطرناک ہتھیار بھی برآمد نہیں ہوا ہے بالآخر کافی دیر گزرنے کے بعد وردی پوش فوجیوں کا وہی گروہ دوبارہ نمودار ہوا، ان میں وہ سفاک انڈین آفیسر بھی تھا، سارنگ کا دل پھر کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا، وہ یہی سمجھا کہ اب ایک بار پھر اسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا مگر دوسرے ہی لمحے وہ ٹھٹکا، اسے یہاں سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے اور رائفلوں کے کندے مار کر عمارت سے باہر لایا گیا تو سارنگ کو وقت کا اندازہ ہوا، یہ رات کا کوئی درمیانی پہر تھا، آسمان پر چاند کی طلسماتی خنک روشنی ریت پر نچھاور ہو رہی تھی، صحرا میں پھیلی ہوئی چاندنی کا منظر بڑا پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارنگ کو دھکیل کر قریب موجود ایک جیپ میں سوار کرایا گیا اور جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی، جیپ میں چار فوجی براجمان تھے، دو اگلی سیٹ پر اور دو اس کے لئے عقبی سیٹ پر بیٹھے تھے، سارنگ کو اب ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا، اتنا تو اس نے بھی اندازہ لگالیا تھا کہ اسے یہاں سے ضرور کسی ایسی جگہ منتقل کیا جارہا تھا جو یقیناً کسی بڑے قید خانے سے کم نہ ہو گی۔ یہ سوچ کر وہ گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ کسی بڑے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تو پھر اس کے مفر کی راہیں ناممکن ہو جائیں گی لہٰذا جو کچھ کرنا تھا، اسی وقت کرنا تھا ورنہ وہ ساری زندگی دیارِ غیر کی جیل میں پڑا سڑتا رہے گا۔

یہ خیال آتے ہی وہ اب ان سے جان چھڑانے کے عوامل پر غور کرنے لگا جو سردست اسے مشکل ترین محسوس ہو رہے تھے کیونکہ وہ اس وقت بھی چار مسلح بھارتی فوجیوں کے نرغے میں تھا، اس پر مستزاد اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت کی سمت باندھ دیئے گئے تھے تاہم اس نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ان لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ان کے لیے ایک بے ضرر قیدی ہے، جس کی حیثیت محض غلطی سے سرحد پار نکل آنے والے ایک بدو کی سی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ ڈھٹائی پر اڑے ہوئے تھے اور زبردستی اسے ایک پاکستانی جاسوس بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز کے ان چاروں بندوں میں وہ سفاک آفیسر نہ تھا، سارنگ کو اس کی غیر موجودگی بھی قدرے حوصلہ دیئے ہوئے تھی، اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو گی کہ سارنگ اس سے خوف زدہ تھا جبکہ ان چاروں میں سے تین افراد وہی تھے جنہیں تشدد کے دوران سارنگ نے انڈین آفیسر کو انہیں مرلی، اشوک اور مدن کہہ کر پکارا تھا جبکہ چوتھا ڈرائیور تھا، اگرچہ وہ بھی مخصوص وردی میں تھا۔

جیپ تاریک صحرا میں درمیانی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

''مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے......؟'' بالآخر سارنگ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''کالے پانی......!'' اس کے ساتھ بیٹھے مرلی نے استہزائیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

''کالے پانی......؟ یہ کون سی جگہ ہے؟'' سارنگ الجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں سے صرف آتما ہی نجات پاسکتی ہے۔'' اس بار اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے اشوک نے زہریلے لہجے میں کہا، باقی سب لوگ اس کی بات پر قہقہے لگانے لگے۔ سارنگ بے چارہ پریشان سا ہوگیا، اتنا تو وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ اس کی بے بسی سے حظ اٹھا رہے ہیں لہٰذا وہ خاموش ہو رہا۔

جیپ درمیانی رفتار سے ریت پر دوڑی چلی جارہی تھی، اچانک جیپ کو جھٹکے سے لگنا شروع ہوگئے اور اس کی رفتار بتدریج دھیمی پڑنے لگی۔

''کیا ہوتیواڑی......! جیپ کیوں رک گئی ہے؟'' اچانک اس کے برابر بیٹھے اشوک نے پریشانی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں کیا ہوا......کاربوریٹر کی خرابی لگتی ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''کہیں تیل تو نہیں ختم ہوگیا......؟'' سارنگ کے برابر بیٹھے مدن نے کہا مگر جب تک تیواڑی کوئی جواب دیئے بغیر جیپ کو روک چکا تھا، جیپ کے رکتے ہی سب پہلے تیواڑی اور اشوک نیچے اترے پھر شاید ذرا کسلمندی اتارنے کی غرض سے سارنگ کے برابر بیٹھے ہوئے مرلی اور مدن بھی کود کر جیپ سے نیچے اتر آئے، تیواڑی اب جیپ کا بونٹ اٹھا کر اس پر جھکا ہوا تھا۔

ذرا دیر کو یہ لوگ سارنگ کی طرف سے غافل ہوگئے کہ جس کی وجہ یقیناً یہی رہی ہوگی کہ ایک تو وہ نہتا تھا، دوسرا اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بظاہر خاموش بیٹھے سارنگ کے دماغ میں ہلچل سی ہونے لگی۔

اس نے کن انکھیوں سے آس پاس کا مقدور بھر جائزہ لینے کی کوشش کی، جیپ بغیر ہڈ کی تھی بہرطور کن انکھیوں سے جائزہ لینے کے دوران سارنگ ذرا چونکا، اسے اپنی داہنی طرف کسی ویران متروکہ عمارت کے کھنڈر نظر آئے، اچانک ایک سنسنی خیز خیال کے تحت سارنگ کا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا، وہ سوچنے لگا کسی طرح اگر وہ ان کھنڈرات کے متروک ویرانے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوجائے تو کچھ خلاصی ہوسکتی ہے مگر یہ اسے ناممکن ہی نظر آرہا تھا تاہم اس نے ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' کے مصداق اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور نیچے موجود ان چاروں مسلح وردی پوش اہلکاروں کا غور سے جائزہ لینے لگا۔

جیپ میں لگتا تھا کہ کوئی بڑی خرابی ہوگئی تھی کیونکہ تیواڑی بونٹ اٹھائے جیپ کے انجن پر جھکا ہوا تھا جبکہ باقی تینوں رائفل گود میں رکھے پاس ہی ریت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے، سارنگ کے قدموں میں ایک کینوس بیگ بھی رکھا ہوا تھا جس کے اندر شاید انہی لوگوں کی ضرورت کا کچھ سامان موجود تھا، سارنگ نے سب سے پہلے اپنی پشت میں بندھے دونوں ہاتھوں کی رسیوں کو ہلانا جلانا شروع کردیا تھا، یہی کوشش وہ پچھلی کافی دیر سے کر رہا تھا، اب ذرا موقع ملتے ہی وہ اپنی دونوں بندھی ہوئی کلائیوں کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زور زور سے آپس میں رگڑنے لگا، اسے اپنی کلائیوں میں بندھی رسی ڈھیلی پڑتی محسوس ہونے لگی تھی، سارنگ نے اپنی یہ خفیہ کوشش مزید تیز کردی بالآخر ذرا دیر بعد اسے اپنی ایک کلائی کے گرد رسی کا حلقہ ڈھیلا پڑتا محسوس ہوا، سارنگ نے فوراً ایک ہاتھ خفیف سا جھٹکا دے کر کلائی کے ڈھیلے پڑتے رسی کے حلقے سے باہر نکال لیا، اب اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر ہی رکھے خاموشی سے بیٹھا رہا، وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم اس کا دل اب کامیابی کے متوقع احساس تلے زور زور سے دھڑ دھڑا رہا تھا، وہ اب موقع کی تاک میں تھا۔

اس نے جیپ کے قریب ریت پر بیٹھے شخصوں میں مگن ان تینوں اہلکاروں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا، ان کا فاصلہ جیپ سے چھ سات قدم پر تھا۔

''تیواڑی......! کتنی دیر اور لگے؟'' اچانک اشوک نے سگریٹ کا آخری ٹوٹا ایک طرف اچھالتے ہوئے پوچھا۔

''بس تھوڑی ہی دیر ہے سر......! اب پلگ صاف کر رہا ہوں، کاربوریٹر تو ٹھیک کر لیا ہے۔'' تیواڑی نے گردن موڑ کر کہا۔ تب پھر اشوک نے اپنے قریب بیٹھے مدن سے کہا۔

''جا یار جیپ میں بیگ رکھا ہے، تاڑی کی بوتل رکھی ہے ذرا اٹھالا۔''

مدن اٹھا اور جیپ کی طرف بڑھا، سارنگ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، وہ جس موقع کا بے چینی سے منتظر تھا، وہ قریب آرہا تھا، مدن جیپ کے قریب آیا، ایک نظر سارنگ پر ڈالی، اسے نہیں معلوم تھا کہ سارنگ کے دونوں ہاتھ آزاد ہو چکے ہیں لہٰذا اس نے اپنی رائفل جیپ کی سیٹ پر رکھی اور جھک کر سارنگ کے قدموں کے قریب رکھے بیگ کو اٹھانے کے لیے جھکا۔

سارنگ اس موقع کا منتظر تھا، اس نے جھپٹ کر اپنے قریب پڑی رائفل اٹھالی، مدن، سارنگ کو دیکھ کر یوں چونکا جیسے اس نے اچانک مردے کو زندہ ہوتے دیکھ لیا ہو، سارنگ نے اس کی اس حیرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ ''خبردار......! کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ......!'' اس کی تہدید آمیز غراہٹ پر مدن کا چہرہ ستا گیا، اشوک اور مرلی تک سارنگ کی غراہٹ پہنچ گئی تھی۔

وہ پھرتی کے ساتھ اٹھنے لگے تو سارنگ نے اوپر تلے دو فائر ان کے قدموں کے بالکل قریب داغ دیئے، وہ لڑکھڑا سے گئے، جیپ کے بونٹ پر جھکے ہوئے تیواڑی نے فوراً بونٹ گرا دیا۔

''خبردار......! کوئی بھی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ ادھر سب کی لاشیں تڑپتی ہوئی نظر آئیں گی۔'' سارنگ درشت لہجے میں بولا۔ اس نے رائفل کو بڑے ماہرانہ انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ مرلی اور اشوک کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ سارنگ کو ان کی نیم خودکار رائفل چلانی آتی تھی مگر اشوک کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑنے لگا تھا، اس کے چہرے پر ابھرنے والی اچانک کرختگی جارحانہ ارادے کو ظاہر کرتی تھی۔

سارنگ نے مرلی اور اشوک کو رائفلیں پھینک کر ایک قطار میں منہ موڑ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا تو اشوک نے بیک جنبش اپنی رائفل سارنگ پر سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر سارنگ بھی ایک کائیاں تھا، وہ پہلے ہی اس کے چہرے کے جارحانہ تاثرات کا اندازہ لگا چکا تھا اور اس کی طرف سے زیادہ محتاط تھا، ادھر جیسے ہی اشوک نے اپنی رائفل سارنگ پر سیدھی کرنی چاہی، سارنگ نے فوراً رائفل کی لبلبی دبادی، گولی نے اشوک کے سینے کا پنجر توڑ ڈالا، وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور ریت پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا، اب مرلی اور مدن کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے، سب سے زیادہ حالت غیر ڈرائیور تیواڑی کی ہو رہی تھی، اشوک کا عبرتناک انجام دیکھ کر مرلی اور مدن نے فوراً اپنی رائفلیں پرے پھینک دیں جسے سارنگ نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا پھر سارنگ کو تیواڑی بزدل سا محسوس ہوا تھا لہٰذا اس نے اسے حکم دیا کہ مدن اور مرلی کے دونوں ہاتھوں کو پشت کی سمت رسی سے باندھ دے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق تیواڑی نے ایسا ہی کیا، اپنے ہی ساتھیوں کو رسن بستہ کرنے کے بعد وہ جیسے سارنگ کے سامنے بوتل کے جن کی طرح سر جھکا کر مزید حکم بجالانے کے لیے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

''تیواڑی......! جیپ میں اب کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟'' سارنگ نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا تو تیواڑی اپنے حواسوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے تھوک نگل کر بولا۔ جج......جی بس پلگ فٹ کرنا ہے۔''

''تو کرو پھر جلدی اور خبردار اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو......!'' سارنگ نے زہرخند لہجے میں کہا۔

اسے اشوک کی موت کا کوئی دکھ نہ تھا، یہی تو وہ شخص تھا جس نے اس کے انگوٹھے کا ناخن کھینچا تھا، اگرچہ اس تشدد میں مرلی اور مدن بھی اس کے ساتھی تھے مگر سارنگ بلاوجہ خون خرابہ کرنے کا عادی نہ تھا اور اشوک کو محض دفاع کی وجہ سے قتل کیا تھا بہرطور ذرا ہی دیر بعد تیواڑی نے جیپ کا بونٹ گرا دیا۔

"جیپ تیار ہے۔" تیواڑی نے کہا۔

سارنگ کو موٹر گاڑی چلانے کا بخوبی تجربہ تھا، وہ وڈیرے کی زمینوں پر ٹریکٹر ڈرائیور بھی رہ چکا تھا، اکثر شکار وغیرہ بھی کھیلا کرتا تھا، آج سارے شوق اس کے کام آ رہے تھے لہٰذا جب تیواڑی نے اپنا کام مکمل کرنے کا اعلان کیا تو سارنگ نے اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیئے اور جیپ میں آ بیٹھا پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے دشت کی لامتناہی وسعتوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

سدھوراں کی چیخ و پکار بار آور ثابت ہوئی تھی، جہاں داد اور اس کے کارندے اس کی چیخ و پکار سے گھبرا کر وہاں سے فرار ہو چکے تھے البتہ محلے والے اب سدھوراں کے گھر کے سامنے مجمعے کی شکل میں جمع ہو گئے تھے، سدھوراں نے اوپر سے اتر کر انہیں روتے ہوئے بتایا کہ چند نامعلوم افراد اسے اغوا کرنے کی نیت سے زبردستی گھر میں گھس آئے تھے۔ محلے کے جری لوگ اسے تسلی تشفی دے کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

اس دن خلاف معمول پرویز جلدی گھر لوٹ آیا، وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا سا نظر آ رہا تھا، سدھوراں نے اس کے ژولیدہ چہرے کی طرف دیکھ کر یہی اندازہ لگایا کہ شاید اسے باہر کسی نے آج صبح والے ناخوشگوار واقعے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا، اگرچہ درست تھا کہ جب پرویز اپنے محلے میں داخل ہوا تھا تو اسے گلی میں کچھ لوگوں نے فوراً ہی اطلاع دے دی تھی کہ کچھ غنڈے اس کی بیوی کو اغوا کرنے کے لئے آئے تھے مگر سدھوراں کے چیخنے چلانے کی وجہ سے وہ لوگ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے لیکن پرویز کی پریشانی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔

"سدھوراں......! یہ کون لوگ تھے، جو تمہیں اغوا کرنے کی نیت سے آئے تھے......؟" پرویز نے عجیب نظروں سے اس کے ہراساں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

سدھوراں شش و پنج کا شکار تھی، درحقیقت وہ اسے جہاں داد کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی یوں تو شادی سے قبل ڈاکٹر فوزیہ نے موسیٰ کے ذریعے پرویز کو پہلے ہی یہ بتا دیا تھا کہ وہ ماضی میں کن تلخ حالات سے دوچار رہی ہے لیکن پرویز کو بہر حال جہاں داد کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

سدھوراں نے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے انکار کیا۔ "مم...... میں تو انہیں نہیں

جانتی...... جانے کک...... کون لوگ تھے وہ......!"

پرویز نے برماتی ہوئی آنکھوں سے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ "جھوٹ مت بولو سدھوراں......! تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہو۔" پھر قدرے توقف کے بعد وہ اسے ذرا متحمل لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو سدھوراں......! یہی لوگ جو تمہیں اغوا کرنے کی نیت سے آئے تھے! آج میرے پاس ہوٹل بھی آئے تھے۔" پرویز نے اتنا بتایا تو سدھوراں دھک سے رہ گئی۔

"پھر انہوں نے مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میری بیوی یعنی تم ان کے چھوٹے سائیں کی باندی ہو، اب تمہارے لیے یہی بہتر ہو گا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد کر دو بصورت دیگر اس کے خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔" پرویز نے اپنی بیوی سدھوراں کو اپنی اصل پریشانی سے آگاہ کر ڈالا جسے سن کر سدھوراں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

"دیکھو سدھوراں......! اگر تم اس بدمعاش کے بارے میں بتا دو تو میں صحیح طور پر اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکوں گا۔" پرویز نے آخر میں سدھوراں سے کہا۔

سدھوراں درحقیقت خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جہاں داد جیسے موذی سے اس کی جان چھوٹ جائے جو یہاں تک آ پہنچا تھا لہٰذا یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو قدرے پُرسکون کرنے کی کوشش کی پھر بولی۔ "ہاں! اب ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ آپ کو اس بدمعاش کے بارے میں آگاہ کر دوں، جس مردود نے میری عزت برباد کی تھی۔" یہ کہتے ہوئے پھر سدھوراں نے پرویز کو جہاں داد کے بارے میں بتا دیا اور اسے یہ بھی بتایا کہ وہ تھر کے ایک بڑے اور بااثر زمیندار میر منصب خان کا بیٹا ہے، جس کی اس شہر میں بھی اپنی رہائشگاہ ہے۔

سدھوراں کی بات سن کر پرویز کا چہرہ چند ثانیے کے لیے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔

"بس...... سائیں......! میرا خیال ہے تم کسی طرح جہاں داد کی شہر والی رہائشگاہ کا پتہ لگا کر پہلے اس کے باپ سے ملنے کی کوشش کرو، آج کل تھر میں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے وہ ادھر ہی ہو گا۔" سدھوراں نے تجویز دیتے ہوئے کہا پھر مزید بولی۔ "درحقیقت جہاں داد اپنے باپ میر منصب خان سے بہت ڈرتا ہے۔"

"ہوں......! میرا خیال ہے مجھے سب سے پہلے یہی کام کرنا پڑے گا۔" پرویز پُرتفکر لہجے میں بولا۔ "اگر پھر بھی جہاں داد اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں پھر پولیس میں اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلاف پرچہ کٹوادوں گا...... ویسے میں نے اچھا کیا کہ جب جہاں داد کے آدمی مجھے دھمکی دینے میرے ہوٹل آئے تھے تو میں نے اپنے ایک آدمی کو ان کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا، وہ ان کے ٹھکانے کا پتہ لگا کر مجھے بتائے گا۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔'' سدھوراں جلدی سے بولی۔ ''ایسا کرنا، جب تمہیں اچھی طرح میر منصب خان کے گھر کے بارے میں پتہ لگ جائے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا، میں خود بھی وڈے سائیں سے ہاتھ جوڑ کر گزارش کروں گی کی وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھائے، سائیں وڈا بذات خود ایک شریف آدمی ہے۔''

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ جہاں داد کے باپ میر منصب خان کی تھر میں نجی جیل بھی ہے پھر وہ بھلا تمہارے جیسی ایک غریب ہاری کی بیٹی کی فریاد کو کیا اہمیت دے گا؟''

''نہیں سائیں...... ! تھر میں جو نجی جیل ہے، وہ جہاں داد اور اس کے منشی کی ملی بھگت سے ہے، جو ویسے بھی ہم گریب ہاریوں کے بارے میں وڈے سائیں کے کان بھرتا رہتا ہے۔''

سدھوراں کی بات پرویز اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگا پھر کسی پریشان کن خیال کے تحت وہ سدھوراں سے بولا۔ ''مگر سدھوراں...... ! کیا تمہارا میرے ساتھ چلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا؟''

''سائیں...... ایک بڑے خطرے سے نمٹنے کے لیے ہمیں تھوڑا بہت خطرہ مول لینا ہی پڑے گا اور پھر تم بھی تو میرے ساتھ جاؤ گے پھر ڈر کس بات کا......؟'' سدھوراں نے یہ کہتے ہوئے فخریہ انداز میں پرویز کی طرف دیکھا۔ تب پرویز کا سینہ فخر سے تن گیا اور اس نے تھوڑی ردوقدح کے بعد سدھوراں کی بات مان لی۔

سدھوراں کو اگرچہ اپنے شوہر کی کل والی بات انتہائی ناگوار ضرور گزری تھی لیکن اس نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پرویز کو ایک نہ ایک دن شریفانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دے گی۔

اگلے دن علی الصباح پرویز، سدھوراں کو محتاط رہنے کی ہدایت کر کے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا اور اس سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کا آدمی جسے وہ جہاں داد کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا، کامیاب لوٹا تو پھر وہ جلد ہی ہوٹل سے گھر لوٹ آئے گا اور بعد میں وہ دونوں میر منصب خان کی رہائشگاہ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

پرویز کے جانے کے بعد سدھوراں جلدی جلدی گھریلو کام نمٹانے لگی، لگ بھگ کوئی

ڈھائی گھنٹے بعد پرویز لوٹ آیا، اس کے چہرے سے جوش مترشح تھا، اس نے سدھوراں کو بتایا کہ جہاں داد یعنی اس کے باپ میر منصب خان کی رہائشگاہ کا پتہ لگ گیا ہے، جو ڈیفنس کے علاقے میں ہے۔ بس پھر کیا تھا سدھوراں نے اپنی چادر سنبھالی اور پرویز کے ساتھ ہولی، پرویز نے گھر کو تالا لگایا اور پھر دونوں بس اسٹاپ پر آ گئے، سدھوراں کا دل جانے کیوں اندیشناک وسوسوں تلے بری طرح دھڑک رہا تھا، اسے بار بار یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دانستہ خونخوار بھیڑیوں کی کچھار میں جا کر غلطی کر رہی ہے مگر پھر پرویز کی موجودگی محسوس کر کے اسے قدرے حوصلہ ہوا۔

دونوں میاں، بیوی بس کے انتظار میں کھڑے تھے، سدھوراں گردوپیش پر بھی محتاط نظریں رکھے ہوئے تھی پھر ذرا دیر بعد ان کے مطلوبہ نمبر کی بس آ گئی، وہ دونوں جلدی سے اس میں سوار ہو گئے، پرویز نے سدھوراں کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے کوٹھی کا پتہ لگانے کے بعد اپنے آدمی کو روانہ کر دیا تھا۔ ڈیفنس کا علاقہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

دونوں میاں، بیوی چورنگی پار کرنے کے بعد ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہو گئے، پرویز چونکہ پہلے اپنی مطلوبہ کوٹھی کا پتہ معلوم کر کے آیا تھا، اس لئے ان دونوں کو اس کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑا مگر میر منصب خان کی کوٹھی تک کا راستہ انہیں پیدل ہی طے کرنا تھا، دونوں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے، اندر کا علاقہ خاصا ویران تھا، دورویہ عالیشان بنگلوں اور کوٹھیوں کی قطاریں تھیں، اچانک انہیں اپنے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی پھر دوسرے ہی لمحے ایک سفید رنگ کی لینڈ کروزر ان کے بالکل پہلو میں ایک جھٹکے سے رکی، وہ دونوں ٹھٹک کر رکے، ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ لینڈ کروزر سے چار پانچ مسلح آدمی اترے اور ان پر اپنی رائفلیں تان کر غصیلے لہجے میں بولے۔ ''خبردار...... ! کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ادھر ہی تم دونوں کو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔''

سدھوراں کی سہمی ہوئی نگاہ لینڈ کروزر کی اگلی نشست پر بیٹھے جہاں داد پر پڑی تو اسے غش آ گیا، پرویز بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گیا تب آناً فاناً ان مسلح افراد نے سدھوراں کو سنبھالتے ہوئے حیران و پریشان کھڑے پرویز کو بھی لینڈ کروزر میں سوار کروا دیا اور وہاں سے ہوا ہو گئے۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں، جہاں داد کے مسلح کارندوں نے سدھوراں اور پرویز کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا...... سدھوراں تو بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ لینڈ کروزر کے روانہ ہوتے ہی پرویز کے سر پر کند آہنی شے سے وار کر کے اسے بھی تھوڑی دیر بعد دنیاو مافیہا سے بے نیاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے پرویز کی آنکھ کھلی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ وہ سیلن زدہ سے ننگے فرش پر چت لیٹا ہوا تھا اور قریب ہی اس کی بیوی سدھوراں بے سدھ پڑی تھی۔ کمرے میں وہ سب موجود تھے اور پرویز کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ سب سے آگے جہاں داد کھڑا تھا۔ اس کی قہر آلود نظریں پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں...... ایک کارندے کے ہاتھ میں پانی کا جگ نظر آ رہا تھا۔ غالباً اس نے ہی پرویز کے چہرے پر پانی پھینک کر اسے ہوش میں آنے پر مجبور کیا تھا اور اب وہی پرویز کے قریب بے ہوش پڑی سدھوراں کے چہرے پر پانی پھینک رہا تھا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد سدھوراں بھی کسمسا کر ہوش میں آ چکی تھی اور متوحش نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پرویز کو اپنے سر پچھلے حصے میں دکھن کا احساس ہوا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا...... اسے ایک دم چکر اس آ گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ تھوڑا لڑکھڑانے کے بعد تن کر کھڑا ہو گیا۔

''تم لوگ کون ہو...... ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے......؟'' پرویز جہاں داد سے قدرے درشت لہجے میں بولا تو جہاں داد نے چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے بھاری ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ تھپڑ کی شدت سے پرویز چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا سا گیا۔ ایسے میں سدھوراں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کو سنبھالا۔

''تُو نے اس چھوکری کے ساتھ...... شادی کرنے کی جرأت کیسے کی......؟'' جہاں داد نے پرویز کی طرف گھورتے ہوئے تیخ پا لہجے میں کہا۔ ''تُو جانتا نہیں کہ...... یہ چھوکری ہماری کیا لگتی ہے......؟''

''یہ میری بیوی ہے...... اور...... اور...... میں تم کو نہیں جانتا......'' پرویز نے اپنا گال سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''چنگا...... اب جان لے...... یہ میری رکھیل ہے اور...... تُو نے اب اس کو طلاق دینی ہے۔'' جہاں داد نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر اپنے ایک کارندے کو مخصوص

اشارہ کیا۔ کارندے نے جلدی سے ایک اسٹیمپ پیپر نما کاغذ جہاں داد کو تھما دیا جسے وہ پرویز کی پریشان کن نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو...... یہ طلاق نامہ ہے...... تم نے اسی وقت اپنی بیوی کو طلاق دینا ہے......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک قلم نکالا اور پرویز کی طرف بڑھایا۔

پرویز اس صورت حال سے پریشان ہو کر اس سے بولا۔ ''مگر...... کیوں...... میں اسے کیوں طلاق دوں...... یہ میری بیوی ہے...... ہم نے رضا خوشی سے شادی کی ہے......''

''ہوں...... رضا خوشی......'' جہاں داد اس کی بات پر استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''اب تیرے کو اسی رضا خوشی کے ساتھ اپنی بیوی کو طلاق دینی ہے...... ورنہ...... اس کا دوسرا طریقہ ہمارے پاس موجود ہے...... جو آسان بھی ہے...... تجھے قتل کر کے...... تیری لاش گم کر دیں گے۔'' جہاں داد نے بڑی سفاکی سے کہا۔

پرویز کے ساتھ کھڑی سدھوراں نے یک دم متوحش ہو کر جہاں داد سے کہا۔ ''نہیں...... تت تم ایسا نہیں کر سکتے......''

سدھوراں کے سراسیمہ لہجے پر جہاں داد مکروہ ہنسی کے ساتھ تہدیدی انداز میں بولا۔ ''اگر تجھے اپنے شوہر کی جان عزیز ہے تو پھر اس سے کہو...... یہ تجھے ابھی طلاق دے...... ورنہ......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا...... پرویز اپنی بیوی سدھوراں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جہاں داد سے بولا۔

''ہرگز نہیں...... میں اپنی بیوی کو بالکل طلاق نہیں دوں گا......''

یہی وہ لمحہ تھا جب سدھوراں کے اندر کی عورت یک دم بیدار ہو گئی...... اپنے شوہر پرویز کے یقین بھرے لہجے نے اسے سرشار کر دیا اور...... اب وہ بالکل بے خوف نظر آنے لگی۔ جہاں داد نے سنسناتی ہوئی نظروں سے پرویز کو گھورا پھر اپنے کارندوں سے بولا۔ ''ملکو...... مولا بخش...... ! ذرا اس شوہر نامدار کو فوراً اس دنیا سے رخصت کر ڈالو...... اسے اپنی زال (بیوی) سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے......''

اس کا حکم سن کر جب دو کارندے جارحانہ انداز میں پرویز کی طرف بڑھے تو سدھوراں ایک دم پرویز کے آگے آ گئی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جہاں داد کی طرف گھورتے ہوئے بولی۔ ''خبردار...... جہاں داد......! اگر تُو نے میرے شوہر کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو...... میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہ ظاہر ایک سیدھی سادی دیہاتن لڑکی نظر آنے والی سدھوراں کو یکا یک ایک بڑی دوشیزہ کے روپ میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے جہاں داد چونک کر اس کا شعلہ فشاں چہرہ تکنے لگا...... مگر پھر دوسرے لمحے جہاں داد کے چہرے پر زہرناک خونخواری عود کر آئی...... پرویز بذات خود جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا اور ایسے حالات سے اس کا کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس نے فوری طور پر پیش آمد صورت حال کا انداہ لگاتے ہوئے...... ایک فیصلہ کیا اور چوکس ہو کر گھات میں لگے ہوئے شکرے کی طرح...... اس نے بہ غور بدمعاشوں کی طرف دیکھا...... جہاں داد کے علاوہ ان کی تعداد چار اور ان سب کے ہاتھ میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں۔

غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے جہاں داد نے ملکو اور مولا بخش سے گرجدار آواز میں کہا۔ ''ارے تم دونوں کیا منہ تک رہے ہو...... آگے بڑھو اور اس ہیرو کو ادھیڑ کر رکھ ڈالو......''

ملکو اور مولا بخش جیسے ہی پرویز کی طرف بڑھے...... پرویز بہ ظاہر پریشان نظر آنے کی اداکاری کرنے لگا مگر...... اندر سے وہ اپنے نیفے میں اڑسے مچھلی نما چاقو کو نکال کر اسے استعمال میں لانے پر غور کرنے لگا...... مگر اسے اپنا چاقو نکالنے کا موقع نہ مل سکا البتہ اسے ایک دوسرا سنہری موقع ہاتھ آگیا...... لہٰذا جیسے ہی سب سے پہلے ملکو نے اپنی کارگزاری دکھاتے ہوئے...... پرویز پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی...... تو پرویز نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی...... ملکو کے لیے...... پرویز کی یہ جارحانہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی...... گھٹنے کی ضرب شدید کھا کر اس کے حلق سے ''اوغ'' کی آواز نکلی اور وہ...... آگے کو جھک آیا پھر اس سے پہلے کہ...... جہاں داد اور اس کے باقی کارندوں کو اس غیر متوقع اور اچانک بدلنے والی صورت حال کا ادراک ہوتا پرویز نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ...... درد سے بے حال ہوتے ملکو کی خودکار رائفل پر قبضہ جما لیا پھر اگلے ہی لمحے اس نے...... ملکو کو...... مولا بخش پر دھکا دیا اور...... جہاں داد کی گردن سے رائفل کی نال چپکاتے ہوئے غرایا۔ ''اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں ورنہ...... تیری گردن میں سوراخ کر دوں گا......''

پرویز کی سفاک غراہٹ سے مرعوب ہوئے بغیر جہاں داد اپنی جگہ جمے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ''تم خود کو بہت بڑے جنجال میں ڈال رہے ہو...... جانتے نہیں...... میں کون ہوں......''

''میں تجھے تو اچھی طرح جانتا ہوں...... مگر شاید تو مجھے اچھی طرح نہیں جانتا''

پرویز کی بھی شاید رگ فتنہ پھڑک اٹھی تھی...... وہ غرا کر بولا۔ ''میں آخری بار کہہ رہا ہوں...... اپنے کتوں سے کہو کہ وہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو جہاں داد کے حلق سے پہلے تو ایک بے بس غراہٹ سی خارج ہوئی، اس نے شاید پرویز کے خونخوار لہجے کی سفاکی کا اندازہ لگا لیا تھا لہٰذا دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے کارندوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ اپنے ''چھوٹے سائیں'' کا حکم پاتے ہی انہوں نے اپنے ہتھیار فرش پر رکھ دیئے۔ اس کے بعد پرویز نے ان سب کو ایک قطار میں دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ بلا چوں و چرا...... ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے...... پرویز نے جہاں داد کی جامہ تلاشی لیتے ہوئے اس کا ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا...... پھر جہاں داد کو بھی اپنے کارندوں کی طرف دھکیل کر ان کے ساتھ کھڑا کر دیا اور سدھوراں کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکل گیا...... کمرے سے نکلتے ہی اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ رائفلوں سے نکالے ہوئے میگزین اس نے ایک طرف پھینکے۔

یہ ایک نئی رہائشی اسکیم کا علاقہ تھا...... جہاں فلیٹوں کے ڈھانچے ایستادہ تھے اور...... بنگلوں کی قطاریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جس بنگلے میں یہ لوگ موجود تھے اس کے باہر جہاں داد کی لینڈ کروزر کھڑی تھی...... مگر پرویز سدھوراں کو لئے تقریباً دوڑتا ہوا شاہراہ پر آگیا...... یہاں انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ یہ دونوں جھٹ سے اس میں سوار ہو گئے۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ...... اس سیلن زدہ سے قید خانے کے بند دروازے سے لگی بیٹھی کافی دیر تک روتی رہی تھی تب اچانک اسے باہر ایک آواز سنائی دی...... اس نے جھٹ سے...... دروازے کی جھری سے باہر جھانکا...... کیا دیکھتی ہے...... ایک چھکڑا پاس سے بھوسہ لادے گزر رہا تھا...... اس کی ٹوٹی ہوئی ہمت قوی ہونے لگی...... اس نے آہنی راڈ اٹھا کر زور زور سے آہنی دروازے پر ضربیں لگانی شروع کر دیں...... پاس سے گزرتے ہوئے چھکڑے پر ایک عمر رسیدہ شخص اور اس کا ایک نو دس سالہ بچہ سوار تھا۔ اس کے کانوں تک شور کی آوازیں پہنچیں تو اس نے فوراً اپنے گدھے کی باگیں کھینچ لیں اور حیرانی سے اس بوسیدہ سی گودام نما عمارت کو تکنے لگے۔

ڈاکٹر فوزیہ نے اب اندر سے باقاعدہ شور بھی مچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شخص چونکا پھر اپنے گدھے کی رسی کو چھکڑے کے ایک ''لکڑ'' سے باندھ کر نیچے اتر آیا۔ گودام سے اس کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فاصلہ..... دس بارہ قدموں جتنا تھا..... وہ..... حیران اور ٹھٹکی ہوئی نظروں سے گودام کے بند آہنی دروازے کو تکتا ہوا اس کی طرف بڑھا..... اندر سے فوزیہ نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ دروازے کے ذرا قریب پہنچ کر رکا تو فوزیہ نے گلوگیر لہجے میں التجا کی۔ ''بھائی..... مجھے..... یہاں سے نکالو..... مجھے..... کچھ غنڈوں نے یہاں قید کر رکھا ہے..... تت تمہاری بڑی مہربانی ہوگی.....''

گاڑی بان کا دماغ ٹھٹک گیا..... وہ ایک بھلا مانس شخص تھا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی..... لہٰذا وہ وقت ضائع کیے بغیر دروازے کے قریب منہ کر کے ڈاکٹر فوزیہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''بہن..... ! تُو فکر نہ کر..... میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں.....''

یہ کہہ کر اس نے باہر سے دروازے پر لگے قفل کا جائزہ لیا پھر..... اپنے چھکڑے کی طرف بڑھ گیا اور چھکڑے کے نیچے سے کہیں پھنسے ہوئے اوزروں سے وہ ایک آہنی ''تیسی'' اٹھا لایا..... اور گودام کے دروازے کے پاس آ کر اس نے آہنی ''تیسی'' کے دو تین وار کر کے تالا توڑ ڈالا..... کنڈا کھول کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ڈاکٹر فوزیہ ہراساں ہرنی کی مانند باہر نکلی..... گاڑی بان ایک خوبصورت، جوان اور ماڈرن لڑکی کو اس حال میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ سراسیمہ فوزیہ کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے شفقت سے بولا۔ ''بیٹی..... ! تیرا گھر کہاں ہے..... تُو پریشان نہ ہو..... میں تجھے.....''

''تمہاری بڑی مہربانی..... میں خود کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی.....'' فوزیہ اچانک اس کی بات کاٹ کر بولی۔ اس کی متوحش نگاہیں آس پاس گردش کر رہی تھیں۔ اسے ہنوز جہاں دادا اور اس کے غنڈوں کا خوف دامن گیر تھا۔

گاڑی والا اس کی پریشان کن عجلت کو بھانپ کر ملائمت آمیزی سے بولا۔ ''بیٹی..... سڑک یہاں سے تھوڑی دور ہے..... ٹیکسی تو شاید تجھے نہ ملے..... شہر جانے والی منی بس ضرور مل سکتی ہے..... آ میرے ساتھ..... میں سڑک کی طرف جا رہا ہوں.....'' یہ کہتے ہوئے اپنے چھکڑے کی طرف بڑھا..... فوزیہ بھی لرزتی ٹانگوں سے چلتی ہوئی چھکڑے کی طرف بڑھی..... گاڑی بان نے بھوسہ اِدھر اُدھر کھسکا کر فوزیہ کے بیٹھنے کی جگہ بنائی..... اور اسے سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ڈاکٹر فوزیہ اس گندے چھکڑے پر بیٹھنے کا تصور بھی نہ کرتی..... مگر اس وقت کیونکہ جان پہ بنی ہوئی تھی تو اسے وہ غنیمت لگا اور وہ اس کی سمت کر بیٹھ گئی..... بھوسہ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا، نو دس، سالہ بچہ اپنی معصومانہ

آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا..... چھکڑا روانہ ہوا۔

چھکڑے پر سکڑی سمٹی بیٹھی فوزیہ متوحش نگاہوں سے آس پاس کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔ اسے یہ علاقہ شہر کا مضافاتی حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ فضا میں نرم نرم ہوا کے جھونکے محو خرام تھے اور ان میں نمی سی محسوس ہو رہی تھی..... فوزیہ نے اندازہ لگایا یہ علاقہ ساحل سمندر کے قریب کا تھا۔ چھکڑا ہچکولے کھاتا ہوا دھیمی رفتار سے چلا جا رہا تھا مگر فوزیہ کا دل سینے میں اس سے دگنی چوگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا..... گاڑی بان آگے چوبی تختے پر بیٹھا گدھے کی رسی تھامے اسے ''ٹٹکارنے'' میں مصروف تھا۔

چھدری چھدری خودرو جھاڑیوں کا میدان ختم ہوا تو کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا..... پھر کچھ کچھ مکانوں کے آثار نمودار ہونے لگے..... لوگ اِدھر اُدھر پیدل، چھکڑوں میں اور سائیکلوں پر سوار دکھائی دینے لگے..... چند ایک کھٹارا سی موٹر سائیکلوں پر بھی سوار نظر آئے تھے۔ سڑک اب ذرا ہی دور تھی۔

ڈاکٹر فوزیہ گٹھڑی بنی بیٹھی پریشان کن خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنے ''مما پاپا'' کی فکر کھائے جا رہی تھی..... اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتے تھے اور اس کی چانک اور پُراسرار گمشدگی سے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے..... یہ رات ان پر کس قدر بھاری گزری ہوگی، یہ سوچ کر ڈاکٹر فوزیہ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے..... پھر اسے جواد کا بھی خیال آیا..... جانے وہ بے چارہ کس حال میں ہوگا اب تو وہ بھی اس کی وجہ سے بے حال ہو رہا ہوگا؟

ڈاکٹر فوزیہ انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک وہ ''ہارن'' کی آواز پر چونکی..... وہ چھکڑے کے پچھلے حصے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اس کی نگاہ ایک کھٹارا سی ٹیکسی پر پڑی، جو اس کے چھکڑے کے عقب میں دھیمی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ ٹیکسی کو دیکھ کر ڈاکٹر فوزیہ کھل اٹھی اور وہ اس عجلت آمیز خوشی کے مارے جلدی سے چلتے چھکڑے سے نیچے کود پڑی..... اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس ٹیکسی والے کا گھر شاید اسی علاقے میں تھا اور اب وہ دھندے پر روانہ ہو رہا تھا۔ فوزیہ نے اسے مضطربانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی..... فوزیہ پر اس سے اس قدر وحشت اور پریشانی سوار تھی کہ وہ بے چارے چھکڑے والے کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی اور جلدی سے ٹیکسی کا عقبی دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی والا درمیانی عمر کا تھا۔ وہ چونکا پھر گردن موڑ کر پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے بی بی.....؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''شاہراہ فیصل کی طرف چلو...... لیکن ذرا جلدی......'' ڈاکٹر فوزیہ نے چڑھتی اترتی سانسوں کے درمیان کہا۔

ٹیکسی والے نے ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا...... چھکڑے والے کو ابھی تک فوزیہ کے اترنے اور ٹیکسی میں بیٹھنے کا علم نہ تھا۔ وہ تو اسے اس وقت پتہ چلا...... جب عقب میں ٹیکسی کا ہارن سن کر اس نے اسے راستہ دیا اور فوزیہ نے قریب سے گزرتے ہوئے اپنا سر اور ایک ہاتھ باہر نکالتے ہوئے چھکڑے والے کو خدا حافظ کہا۔ چھکڑے والا...... چونک کر اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا پھر اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلا دیا۔

''بھائی...... ! یہ کون سا علاقہ ہے......؟'' فوزیہ نے یونہی ڈرائیور سے پوچھا۔

''بی بی...... ! یہ ابراہیم حیدری کا علاقہ ہے......'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ بہ ظاہر اس کی نظریں سامنے تکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں مگر وہ...... گاہے بگاہے عقبی آئینے سے بہ غور ڈاکٹر فوزیہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ایک پکا ہوا پھل اس کی جھولی میں آن گرا ہو...... اب وہ اسے کھانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب پختہ سڑک پر آیا تو بجائے بائیں مڑنے کے اس نے دائیں ہاتھ ٹیکسی موڑ لی۔ مضطرب بیٹھی فوزیہ کو سردست ڈرائیور کی بدنیتی کا اندازہ نہ ہو سکا...... مگر اسے یہ بہر حال اندازہ تھا کہ ابراہیم حیدری کے بعد پہلا بڑا اسٹاپ کورنگی کریک کا آتا تھا...... ادھر ٹیکسی ڈرائیور...... جب اسے خاصی دور نسبتاً ویران علاقے میں لے آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

ایک شیطان کے چنگل سے بچ کر نکلنے پر وہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ کسی دوسرے شیطان کے ہتھے بھی چڑھ سکتی ہے۔ گھبراہٹ میں اس بھول کا اسے تب ادراک ہوا جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا۔ ڈرائیور نے اچانک ٹیکسی جب دائیں جانب قد آدم خودرو جھاڑیوں میں موڑی تو فوزیہ نے چلا کر کہا۔ ''اے بھائی...... ! ادھر کہاں لے جا رہے ہو مجھے......''

''خاموش ہو کر بیٹھی رہ...... بھائی ہوں گے تیرے گھر پر...... اس وقت تو میری جھولی میں گرا ہوا پکا پھل ہے......'' ڈرائیور نے غصیلے لہجے میں کہا تو فوزیہ کی روح فنا ہو گئی اور کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔

جب جان اور عزت پر بن آئے تو ایک مجبور عورت اسے بچانے کی خاطر آگ میں بھی کود پڑتی ہے...... فوزیہ بھی انجام کی پروا کیے بغیر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑی...... ٹیکسی کی رفتار مدھم ضرور تھی مگر چلتی زمین پر پاؤں رکھنے سے قدم لڑکھڑا ہی جاتے ہیں...... فوزیہ بھی باہر گر کر خودرو جھاڑیوں میں خاصی دور تک لڑھکنیاں کھاتی چلی گئی......

اس کے حلق سے چیخیں ابل پڑیں...... پورا وجود خراشوں کی زد میں آ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً گاڑی روک لی اور...... اور پکے ہوئے پھل کی طرف لپکا۔

فوزیہ کا سر چکرا رہا تھا...... مگر وہ بہ مشکل تمام اٹھ کر ہراساں ہرنی کی مانند دوڑ پڑی...... اطراف میں چھائی ویرانی اسے طاغوتی قہقہے مارتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

فوزیہ کی ٹانگوں میں اب بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ تاہم زمین پر اندھا دھند دوڑنے سے وہ ایک بار پھر گر پڑی...... وہ بد خصلت ٹیکسی ڈرائیور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ فوزیہ کی سانسیں بری طرح پھول رہی تھیں۔ وہ خوفزدہ نظروں سے اس شیطان کے مکروہ چہرے کو تکنے لگی۔ اس شیطان نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب جان سے زیادہ عزت عزیز ہو گئی۔ ایسے میں فوزیہ کی خالص نسوانی خوئے چلتر بیدار ہوئی اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں شیطان صفت ڈرائیور سے کہا۔ ''دیکھو میں کوئی پاکباز عورت نہیں ہوں۔ کیا تمہارا گھر نہیں ہے وہاں مجھے لے چلو۔''

ڈرائیور کی دست درازی کو اچانک بریک لگ گیا۔ وہ شیطان فوراً بولا۔ ''پھر...... تو بھاگی کیوں تھی......؟''

''میں سمجھی تھی کہ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جو رقم کے لالچ میں عزت لوٹ کر قتل کر دیتے ہیں۔'' فوزیہ نے دوسرا پانسہ پھینکا۔ ڈرائیور کی آنکھیں ''رقم'' کا سن کر مزید پھیل گئیں۔

''کیسی رقم......؟'' اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس کی خوفناک ابلتی آنکھوں میں پیسے کی تمنا بھی چمکی۔

''وہ...... رقم ہم نے اس علاقے کے ایک شادی گھر سے لوٹی تھی...... جہاں سے تم مجھے لے کر آئے تھے......'' فوزیہ نے ایک نئی کہانی کا آغاز کیا۔ اس کے ذہن میں شب گزشتہ گودام نما قید خانے کے سامنے سے گزرتی بارات کا منظر عود کر آیا تھا۔

''ہاں...... اس علاقے میں پھکو پہلوان دودھ والے کی بیٹی کی شادی تو تھی مگر...... اب وہ رقم کہاں ہے؟'' انسان کے روپ میں شیطان ڈرائیور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ فوزیہ اپنی من گھڑت کہانی میں زور ڈالتے ہوئے بولی۔

''جب میں نے دیکھا کہ میرے چاروں ساتھیوں کی نیتوں میں فتور آ گیا ہے...... یعنی وہ...... میری عزت سے کھیلنے کے بعد میرا حصہ بھی چھین لینے کی غرض سے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے والے ہیں تو میں نے رقم کا تھیلا...... وہیں چھپا دیا تھا...... رقم...... دو لاکھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے قریب تھی...... زیورات اس کے علاوہ تھے۔''

ڈرائیور کو اپنے ہاتھوں کی تو نہیں بلکہ اپنے پیروں کی انگلیاں بھی انگوٹھیوں سمیت کڑھائی بھرے تیل میں تر بتر نظر آنے لگیں۔ ''چل اٹھ میرے ساتھ...... کہاں ہے وہ رقم جو تُو نے چھپا رکھی ہے......؟''

فوزیہ کپڑے جھاڑ کر اٹھی...... پھر اپنی کہانی کو مزید اثر انگیز بنانے کی غرض سے بولی۔

''دیکھو...... ! اس میں سے آدھا حصہ میرا ہوگا...... آدھا تمہارا...... اور پھر...... میں بھی تمہاری......''

''ہاں...... ہاں...... مجھے منظور ہے...... چل میرے ساتھ......'' ڈرائیور لالچ سے اندھا ہوگیا تھا...... زن اور زر نے اس کی مت مار دی تھی...... فوزیہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے قیامت خیز لمحات کو عین سر پر آنے سے روک تو لیا تھا مگر اب بھی وہ محفوظ نہ تھی...... ہاں کچھ مہلت ضرور مل گئی تھی۔ قیامت ذرا دیر کو سر سے ٹل گئی تھی۔ دونوں ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ زیر اور زبردست میں معاہدہ ہوگیا تھا...... اب دونوں بالادست تھے۔

اگلی نشست پر اب دونوں براجمان تھے۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

''کاش مجھے...... کار چلانا آتی تو میں...... ساری رقم بٹور کر ان کی گاڑی لے کر فرار ہو جاتی...... پھر بلا شرکت غیرے میں اس بڑی رقم کی مالک ہوتی......'' فوزیہ نے ٹیکسی میں براجمان ہوتے ہی ایک تیر پھینکا۔

''ہوں...... اب بھی شکر کرو...... تمہیں آدھا حصہ تو مل ہی جائے گا ناں......'' ڈرائیور مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ دل میں وہ لڑکی کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ بے چاری......! اب بھی آدھے حصے کی تمنا کئے ہوئے ہے...... چور کو مور پڑ گئے تھے مگر تقدیر خود ڈرائیور کی بے وقوفی پر مسکرا رہی تھی۔ اس نے جیسے ہی گیئر بدلا تو فوزیہ اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر چلائی۔

''اب کیا ہوا......؟'' ڈرائیور نے جھنجلا کر پوچھا۔

''وہ...... وہ...... میرا ہیروں کا ہار جو میرے گلے میں تھا...... شاید...... باہر جھاڑیوں میں...... کہیں گر گیا ہے...... ٹھہرو میں ڈھونڈ کر آتی ہوں......'' یہ کہہ کر فوزیہ نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا...... مگر ڈرائیور کی آنکھیں ہیروں کے تذکرے پر اندھی ہوگئی تھیں بلکہ عقل بھی۔

وہ درشت لہجے میں فوزیہ کو روکتے ہوئے بولا۔ ''خاموش بیٹھی رہو...... میں اتر کر

دیکھتا ہوں......''

وہ کچا کھلاڑی تھا جو صرف لوٹ کے مال کے اچانک ہاتھ لگ جانے پر عقل خبط کر بیٹھتا ہے۔ وہ فوزیہ کا تریا نہ جان سکا...... ٹیکسی کے گیئر کو دوبارہ نیوٹرل میں ڈالا...... اور اگنیشن سوئچ آف کرنے بھی زحمت گوارا نہ کی...... ایسے ہی باہر اتر گیا۔ پھر وہ جیسے ہی ''ہیروں کا ہار'' تلاش کرتا ہوا ٹیکسی سے ذرا دور ہوا فوزیہ کے وجود میں جیسے پارہ دوڑ گیا۔ وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ برابر کی ڈرائیونگ سیٹ پر سرک آئی...... گیئر ڈالا اور ہوا ہوگئی...... کچا کھلاڑی...... اپنا سا منہ تکتا رہ گیا وہ جسے پکا پھل سمجھا تھا خود پکا پھل ثابت ہو کر ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

☆======☆======☆

ملوکاں کی بات پر سکھیو چاچا کو اس کی ماں عجیباں اور بھائی خالقو پر بڑا غصہ آیا جو چند ٹکوں کے عوض اس کا ایک عمر رسیدہ شخص سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ چاچا سکھیو نے ملوکاں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ ساتھ کی جھگی میں موجود دونوں لالچی ماں بیٹے اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے۔

''اماں...... ! تُو جا کر...... چاچا سکھیو کو سمجھا دے وہ ملوکاں کو ہمارے حوالے کر دے اور ہمارے معاملے میں پڑنے کی کوشش نہ کرے...... ورنہ اچھا نہ ہوگا...... میں پھر بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کروں گا۔'' خالقو نے اپنے کان میں اٹکی بجھی ہوئی بیڑی اتار کر اپنے ہونٹوں پہ دباتے ہوئے ماں سے کہا۔

''سکھیو بھلا ہمارا کیا کر لے گا...... جب خود ہماری آ پڑیں ملوکاں ہی اس کے پاس جا بیٹھی ہے......'' مائی عجیباں نے زچ ہو کر کہا۔

خالقو...... بیڑی کو سلگاتے ہوئے پھر ایک گہرا کش لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے پھر...... تُو نہیں سمجھاتی تو میں خود چاچا سکھیو سے بات کروں گا......''

''اڑے چریا تُو کیا بات کرے گا...... ملوکاں ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہی نہیں......''

''میں گوٹھ کے چند معتبر لوگوں کو ساتھ لے کر آؤں گا...... پھر دیکھتا ہوں...... چاچا سکھیو...... کس طرح ہماری اجازت کے بغیر ملوکاں کو رکھتا ہے آ پڑیں پاس......''

''او...... بے وقوفا...... تُو سمجھتا کیوں نہیں...... چار آدمی لے کر آئے گا تو وہ بھی ہمارے ہی منہ پر جوتا ماریں گے...... کوئی اور تدبیر سوچیں گے، غصہ مت کر...... پہلے ہی تیری جلد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بازی اور غصے کی وجہ سے ملوکاں...... چاچا سکھیو کے پاس جا بیٹھی ہے......" مائی عجیباں نے بیٹے کو سرزنش کرتے ہوئے زمانہ چشیدہ لہجے میں کہا تو خالقو برا سا منہ بنا کر چپ ہو رہا۔

ملوکاں کو اگرچہ چاچا سکھیو کے پاس آ کر قدرے ذہنی سکھ ملا تھا...... مگر اسے اب یہ احساس بھی ستانے لگا تھا کہ وہ ان پر بوجھ بن کر رہ گئی ہے...... اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ میراں سے درخواست کر کے اس کی سلائی کڑھائی کا آدھا کام بانٹ لیا۔ میراں...... ملوکاں کی خودداری سے بہ خوبی واقف تھی، اس لئے اس نے پاس پڑوس کے لوگوں کا کام ملوکاں کو لے دیا تھا...... ساتھ ہی اس نے ملوکاں کو سندھی ٹوپیاں اور خوبصورت جھلملاتے پراندے اور سندھی بلوچی کڑھائی والے زنانہ کرتے اور بھرت والے گلے بھی بنانا سکھا دیئے تھے۔

ملوکاں لشتم پشتم زندگی گزار رہی تھی۔ وہ سانول کی طرف سے بدستور بے چینی کا شکار تھی...... میراں اس کی چچازاد ہی نہیں بلکہ رازداں سہیلی بھی تھی اور اس کے حال دل سے بھی واقف تھی...... مگر اکثر وہ بھی ملوکاں کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ "ملوکاں...... تیرا سانول سے اس طرح بار بار ملنا ٹھیک نہیں ہے...... پہلے ہی تیرا چری سی بھائی اور ماں تجھ پر خار کھائے بیٹھے ہیں......"

"ہم کہاں ملتے ہیں...... میراں......!" ملوکاں نے اپنی سرگیں آنکھوں میں بے تعبیر خواب سموتے ہوئے کہا۔ "سانول تو مجھے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتا ہے...... سمجھ میں نہیں آتا...... اسے مجھ سے کیوں نفرت ہے......"

"اڑی چری......! وہ تجھ سے ہی نہیں...... بلکہ...... سبھی عورتوں سے نفرت کرتا ہو گا...... اور ایسا یقیناً اس کی منگیتر سدھوراں کی بے وفائی کی وجہ سے ہوا ہے......؟" میراں نے اس کے گہری اداس آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی...... دیکھنا میں بھی اس پتھر کو ایک روز پگھلا کر رہوں گی......" ملوکاں نے قطعیت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس وقت حسب معمول نہر پر پانی بھرنے آئی تھیں...... ملوکاں، میراں کی منت سماجت کر کے اسے وہیں موجود رہنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ سانول کا گھر نہر کے پار ہی تھا۔ وہ ایک پلیا سے گزرتی ہوئی نہر کی دوسری طرف آئی۔ پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کھیتوں کے درمیان سے ہوتی...... اپنے محبوب کی گلی میں داخل ہو گئی......

دور مغرب میں...... جوار اور باجرے کے کھیتوں کی طرف...... جھکتے ہوئے سورج کی

کرنیں ابھی سنہری نہیں ہوئی تھیں اور میراں نے ملوکاں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ سورج کے جھکنے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے۔

بہر طور ذرا دیر بعد ملوکاں...... ماما اللہ رکھیو کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی...... آج اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کم از کم ماما اللہ رکھیو سے اپنی اصل مجبوری اور مشکل بتا کر رہے گی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی تھی اور دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے کھانسنے کی آواز ابھری...... یہ ماما اللہ رکھیو تھا۔

"کون ہے بابا...... آتا ہوں......؟" پھر دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے ملوکاں کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا اور پھر اسے راستہ دیتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ ملوکاں نے اسے سلام کیا اور سر کی چادر درست کئے اندر آ گئی۔

"دھیئے......! خیریت تو ہے...... تُو ادھر......"

"ہاں...... ماما...... خیریت ہی تو نہیں ہے!" ملوکاں نے متلاشی نگاہوں سے صحن میں اِدھر اُدھر دیکھا اور غمزدہ لہجے میں بولی۔ "ماما......! میرا پیو...... فوت ہو گیا ہے......"

اس کی بات سن کر ماما اللہ رکھیو زیر لب بڑبڑایا۔ "جو حکم اللہ کا" کہتے ہوئے اس کے سر پر از راہ شفقت اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "دھیئے......! اللہ سائیں تجھ پر رحم کرے، مجھے بھی مٹھل کی وفات کا دکھ ہوا پر یہ بتا...... بات کیا ہے تُو کچھ پریشان نظر آ رہی ہے۔"

اس کے شفقت اور اپنائیت بھرے لہجے پر ملوکاں رو پڑی پھر اس نے ہچکیوں کے درمیان اسے اپنی ماں اور بھائی خالقو کے عزائم سے آگاہ کیا جسے سن کر ماما اللہ رکھیو چند ثانیے پُرسوچ خاموشی میں مستغرق سا ہو گیا۔ پھر قدرے پُرتفکر لہجے میں بولا۔ "دھیئے...... اللہ بہتر کرے گا...... تُو پریشان نہ ہو...... ابھی تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تُو آ پڑیں چاچا سکھیو کے پاس ہی رہ...... ویسے میں کسی وقت تیرے گھر آؤں گا...... تیری ماں اور خالقو سے ملاقات کروں گا......"

اس کی بات سن کر ملوکاں نے ایک لمحے ذرا چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو ماما اللہ رکھیو کو اس کی آنکھوں میں امید کے خاموش چراغ جلتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس چراغ کی دھیمی دھیمی آنچ پر کیسے معصوم خوابوں کی متوقع تعبیر پک رہی تھی۔ وہ ملوکاں کے اس طرح آنے اور اپنی "پریشانی" کی اصل وجہ بتانے سے بھی بہ خوبی آگاہ تھا۔

"دیکھ دھیئے......! میں تیری پریشانی کی وجہ جانتا ہوں...... اور مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہے کہ تُو سانول سے کیا چاہتی ہے...... مجھے تم دونوں کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ تُو اس کی دلہن بن کر یہاں آجائے......اور میں آپڑیں سانول کے لیے تیرا ''سنگ'' مانگنے کی بھی ہمت رکھتا ہوں...... پر سانول......'' وہ اتنا کہہ کر دانستہ خاموش ہوگیا اور ملوں اچانک اپنا سر اٹھا کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ اسے اپنی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے پا کر ماما اللہ رکھیو اپنی ادھوری بات مکمل کرنے کی غرض سے مزید بولا۔ ''پتہ نہیں سانول کیا چاہتا ہے...... میں نے اس سے تیرے بارے میں تنہائی میں رائے بھی لینے کی کوشش کی ہے پر وہ...... مجھے ٹالتا ہی رہتا ہے۔ خیر اب میں اسے تیری مجبوری بتا کر سمجھانے کی کوشش کروں گا تُو بے فکر رہ۔ چل میں تجھے چھوڑ آؤں۔''

''ماما......! کیا سانول گھر پر نہیں ہے۔'' ملوکاں نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا تاہم اسے ماما اللہ رکھیو کی باتوں سے کافی تسلی ہوگئی تھی۔

''ہاں وہ باہر گیا ہے کام پر...... آتا ہی ہوگا۔ کیا اس سے ملے گی تُو......؟''

''ہاں......نن......نہیں......'' ماما کے اچانک استفسار پر وہ ذرا گڑبڑا سی گئی پھر دوسرے ہی لمحے اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولی۔ ''میں مل کر کیا کروں گی اس سے...... وہ تو مجھے دیکھتے ہی خار کھانے لگتا ہے۔ اچھا ماما......! میں اب چلتی ہوں...... پر دیکھ ماما تُو اپڑا وعدہ یاد رکھنا......اور ہاں......سانول کو بتا دینا، میری ماں اور لالچی بھائی خالقو نے زبردستی میری شادی اس بڈھے آچر خان سے کرنے کی کوشش کی تو......تو...... میں زہر کھا کر آپ گھات (خودکشی) کرلوں گی۔'' ملوکاں اتنا کہہ کر پھر نہیں رکی......اور اپنی اجرک کی چادر میں منہ چھپائے باہر نکل گئی۔

وہ جیسے ہی گلی میں آئی تو اچانک سامنے دو افراد پر نگاہ پڑتے ہی اس کا خون خشک ہونے لگا۔ سامنے اس کا بھائی خالقو اور بڈھا آچر خان کھڑے اس کی طرف خونیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

☆======☆======☆

سارنگ خاصی تیز رفتاری سے بیکراں پھیلے ہوئے صحرا کی وسعتوں میں جیپ دوڑائے چلا جا رہا تھا پھر قریباً جب گھنٹے بھر کی مسافت طے کر آیا تو اچانک اس کی جیپ کا انجن بند ہوگیا۔ سارنگ نے اسے روک کر دو تین بار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود...... جیپ کا ایندھن شاید ختم ہوگیا تھا۔ ''فیول'' بتانے والی سوئی ایک طرف کو مکمل طور پر جھک گئی تھی۔ سارنگ نے جھنجھلا کر اسٹیئرنگ پر مکا جمایا اور پھر اس نے جیپ کو ادھر ہی چھوڑ

دینے کا فیصلہ کیا مگر جیپ چھوڑنے سے پہلے وہ...... پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھیلا اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے تھیلے کی زپ کھول کر اس کی تلاشی لی تو اندر سے سگریٹ اور ماچسوں کے بنڈل کے علاوہ پانی سے بھری ہوئی بوتل برآمد ہوئی۔ سارنگ نے صرف پانی کی بوتل اٹھالی اور باقی تھیلے کو وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہوگیا۔

ریت رفتہ رفتہ بھربھری مٹی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی......آس پاس ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑے چہرے کو ہی نہیں بلکہ پورے وجود کو جھلسائے دے رہے تھے۔ تاہم جیپ کے ذریعے اتنا فاصلے ضرور طے ہوگیا تھا کہ اب تھوہر کی جھاڑیوں کی جگہ کھبڑ کی خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اچانک سارنگ کو سامنے ایک چھتنار درخت تلے جھونپڑی سی نظر آئی۔ سارنگ کے دماغ میں جھماکہ کا سا ہوا اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی مطلوبہ منزل ''گدرا'' یا ''باؤلی'' تک آ پہنچا ہے......اور یہ اس راجستھانی سنیاسی، جیوش بابا کی کٹیا ہے......اس کے اندر اب آگے بڑھنے کی ایک نئی ہمت عود کر آئی...... وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی آئندہ کی حکمت عملی پر بھی غور کرتا جا رہا تھا کہ جیوش بابا کے ذریعے اس دغاباز گاتریا کے بارے میں کس طرح استفسار کرے......کیوں کہ سارنگ کو یاد تھا کہ املی نے اسے جیوش بابا کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جیوش بابا در پردہ کس قسم کا ''بابا'' تھا۔ اس کا درحقیقت بردہ فروشوں کے ٹولے سے تعلق تھا اور وہ ایک پہنچے ہوئے ''بابا'' کا بھیس بدل کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا......اور مزید یہ کہ گاتریا اس کا مقرب خاص تھا۔ بہرطور سارنگ نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بندی کی اور بدستور آگے چلتا رہا...... یہاں تک وہ جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ جھونپڑی کے آس پاس سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سارنگ جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر ذرا اوپر کو رکا...... سامنے ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اچانک اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری ''کون ہے باہر......اندر آجاؤ......''

آواز سن کر سارنگ چونک گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک بوسیدہ سی چٹائی پر ایک سیاہ رو شخص آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس کی عمر اسی سال کے لگ بھگ نظر آتی تھی مگر وہ تھا خاصا موٹا تازہ اور تنومند......اس کی چوڑی چکلی پیشانی پر ترشول کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس نے خاص پجاریوں کے سے انداز میں گیروے رنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی......اس کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں بھی جھول رہی تھیں۔ قریب ہی ایک ترشول رکھا تھا۔ سارنگ نے فوراً جان لیا کہ یہی جیوش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بابا ہے، اس کا مطلوبہ شخص!

''کون ہے تُو بالکے......؟ لگتا ہے تُو مسافر ہے......؟'' اس نے بدستور آنکھیں موندے ہوئے پوچھا تو سارنگ کو اس کی قیافہ شناسی پر حیرت ہوئی مگر پھر اس نے بے دلی سے سوچا کہ یہ سب ایسے مکروہ لوگوں کی بازی گری ہوتی ہے، وہ مرعوب ہونے کے انداز میں ذرا آگے بڑھا اور فرش پر ہی بیٹھ گیا اور متاثر کن لہجے میں بولا۔

''سوامی جی......! جیسا آپ کے بارے میں سن رکھا تھا ویسا ہی پایا......آپ تو بند آنکھوں سے پورا سنسار پہچان لیتے ہیں۔ میں ایک مسافر ہوں اور آپ کی شہرت سن کر ایک دور پرے کی بستی سے آیا ہوں۔ کیا......کیا آپ ہی جیوش بابا ہیں۔''

سارنگ کی بات سن کر اس پجاری نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف گھورا......سارنگ کو یکا یک جانے کیوں اس کی اپنی جانب گھورتی ہوئی آنکھیں اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئیں۔

''تُو کسی اور ہی دھرتی کا منش لگے ہے......کیا لینے آیا ہے میرے دوار......؟'' اس نے پوچھا۔

سارنگ نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''سوامی جی......! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا......''

''اندازہ نہیں مورکھ......جان کاری کہو۔''

اچانک جیوش بابا نے برہم ہو کر اس کی بات کاٹی تو سارنگ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ایک دم وہ خوفزدہ سے لہجے میں بولا۔ ''چھما کر دو سوامی جی......غلطی ہو گئی......زبان پھسل گئی......وہ......وہ......میں......میگھو اڑو قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں......ادھر سرحد پار ہمارا قبیلہ ہے......میں خود......وہاں کے مکھیا کا بیٹا ہوں......دراصل ہمارے قبیلے میں ایک بڑی جان لیوا اور پُراسرار بیماری پھیل گئی ہے......کسی نے بتایا تھا کہ اگر ہم میں سے کوئی جیوش بابا کے پاس جا کر اس کی چالیس دنوں تک سیوا کرے تو ہمیں اس جان لیوا بیماری سے نجات مل جائے گی......'' سارنگ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بڑی مکاری سے بولا۔

''سوامی جی......! مجھے چالیس دنوں تک اپنے چرنوں میں جگہ دے دو میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر جیوش بابا نے اسے پہلی بار بغور دیکھا پھر جیسے یک دم کچھ سوچ کر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''چل چل جا یہاں سے......میری سیوا کے لئے یہاں کے لوگ ہی کافی

ہیں......میں انہیں بھی اپنے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیتا......''

سارنگ نے اس کی بات سن کر دل میں کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں رذیل انسان کہ تُو اپنے ساتھ کیوں کسی کو رہنے کی اجازت نہیں دیتا تاکہ کوئی تیرے کالے کرتوتوں کا پتہ نہ چلا لے......''

''نہیں سوامی جی......! مجھ غریب پر یہ ظلم نہ کرو......میں میلوں کا سفر اور جانے کتنے کشٹ بھوگتا ہوا تمہارے چرنوں تک پہنچا ہوں......میں اب چالیس روز پورے کئے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں......''

سارنگ کی بات سن کر جیوش بابا کے خاکستری چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے......اس نے قریب پڑی ایک چھڑی اٹھالی اور طیش میں آ کر......اس چھڑی سے سارنگ کو پیٹنے لگا۔

سارنگ نے اف تک نہ کی......بلکہ الٹا خوشی سے سرشار ہو کر بولا۔ ''واہ سوامی جی......واہ......تمہارے ہاتھوں کی تو مار کھا کر بھی ایسا لگتا ہے جیسے میرے من کے سارے پاپ ڈھل رہے ہوں......واہ......واہ......سوامی جی......اور مارو مجھے......اور مارو......مجھے......''

اچانک باہر آہٹ ابھری......جیوش بابا کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چھڑی ایک طرف پھینک دی۔ اس کی نظریں سارنگ کے چہرے سے ہٹ گئیں۔ باہر کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساتھ ہی کسی عورت کی ہسٹریائی چیخیں بھی سنائی دینے لگیں۔

سارنگ ٹھٹک گیا......مگر پھر فوراً ایک کونے میں سکڑ سمٹ کے بیٹھ رہا......اچانک جھونپڑی کا ٹاٹ ایک طرف کو ہٹا اور......اس نے دو عمر رسیدہ مرد عورت کو اندر آتے دیکھا......انہوں نے ایک جوان لڑکی کو بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا۔ لڑکی دبلی پتلی اور خاصی خوبصورت تھی۔ مگر اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ لوگ مقامی باشندے معلوم ہو رہے تھے۔

''مہاراج......رکمنی کو ہم لے آئے ہیں......اس کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے......اب آپ کچھ کرو......یہ گھر پر بہت ہنگامہ مچانے لگی ہے۔'' عمر رسیدہ شخص نے جیوش بابا سے مخاطب ہو کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

جیوش بابا نے بہ غور لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہوں......! لگتا ہے آسیب نے اسے پوری طرح جکڑ لیا ہے اور اب اس کے سر چڑھ کر بول رہا ہے، اسے پھول سنگھانے پڑیں گے، دھونی دینی پڑے گی۔''

''مہاراج...... اب تم جو بھی کرو...... پر میری بچی کو اس بھوت سے نجات دلا دو۔'' اس بار عمر رسیدہ عورت نے قدرے روہانسے لہجے میں کہا تو ایک طرف کونے میں دبکے ہوئے سارنگ کو یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ یہ دونوں بوڑھے میاں بیوی درحقیقت اپنی بیٹی رکمنی کا آسیب اتارنے کی غرض سے اسے یہاں لے کر آئے ہیں۔ ''ٹھیک ہے...... تم دونوں اسے یہاں چھوڑ جاؤ...... میں آج رات، میں اس کا جھپیت اتارنے کی کوشش کروں گا۔'' جیوش بابا نے رکمنی کو جلاد ایسی نظروں سے، گھورتے ہوئے کہا اور پھر اس لڑکی کے ماں باپ خاموشی سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

ان کے نکلتے ہی رکمنی نے بھی جھونپڑی سے بھاگنے کی کوشش کی تو جیوش بابا نے آگے بڑھ کر قصاب کی طرح اسے دبوچ لیا اور اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر واپس اندر کھینچ لیا۔ لڑکی کے حلق سے ہذیانی چیخیں خارج ہوگئیں۔

''چھوڑ دے مجھے...... میں کہتا ہوں چھوڑ دے مجھے ورنہ تجھے جلا کر راکھ کر دوں گا بڈھے۔'' رکمنی نے اچانک بدلے ہوئے خرخراتے لہجے میں جیوش بابا کو خوں فشاں نظروں سے گھور کر کہا تو ایک لمحے کو سارنگ بھی اس کے خالص مردانہ لب و لہجے پر ششدر سا رہ گیا۔

جیوش بابا اس کے خونخوار لہجے سے خائف ہوئے بغیر طیش میں بولا۔ ''خبردار......! اس ناری کا پیچھا چھوڑ دے مورکھ...... ورنہ میں تجھے جلا کر راکھ کر دوں گا۔''

جیوش بابا نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھنجھوڑا تو اس بار رکمنی کی چیخیں بلند ہوگئیں۔ اس کے بعد جیوش بابا نے سارنگ کو مخاطب کر کے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اٹھ رے...... ادھر رسی پڑی ہے...... اس لڑکی کے ہاتھوں کو اچھی طرح کس کر باندھ دے۔''

سارنگ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جلدی سے اٹھا اور ایک طرف پڑی رسی اٹھا کر رکمنی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیئے...... جیوش بابا نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔ رکمنی اب پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جیوش بابا کے بدہیئت ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

سارنگ اس شیطان کے ہونٹوں پر کھیلتی اس مسکراہٹ کو دیکھ رہا تھا جبکہ رکمنی ایک طرف کونے میں بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بے چاری اپنے آنسو بھی نہیں پونچھ پا رہی تھی، یہی سبب تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ سارنگ کو اس غریب لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا تاہم اس نے دل

میں مصمم تہیہ کر لیا تھا کہ اگر جیوش بابا نے اس پر گندی نظر ڈالنے کی کوشش کی تو وہ اسے اچھی طرح مزہ چکھا دے گا۔

''اوئے تُو کیا کر رہا ہے...... جا...... جا کر پانی کا مٹکا بھر لا۔'' وہ جیوش بابا کی کرخت آواز سن کر چونکا۔

''مم...... مجھے تو نہیں معلوم کدھر سے پانی بھرنا ہے سوامی......!'' وہ اپنے لہجے میں سادہ لوحی سموتے ہوئے بولا۔

''چل تُو مٹکا اٹھا، میں تجھے بتاتا ہوں۔'' جیوش بابا نے کونے میں دھرے بڑے سے مٹکے کی طرف اشارہ کیا تو سارنگ نے جھٹ آگے بڑھ کر وہ مٹکا اٹھا لیا اور پھر جیوش بابا کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گیا۔

''وہ سامنے دیکھ رہا ہے کھجور کا جھنڈ......؟'' جھونپڑی سے باہر آ کر جیوش بابا نے سامنے داہنی طرف اشارے سے سارنگ کو بتایا۔ ''وہاں ایک برساتی ٹوبہ ہے، وہیں سے بھر لا پانی جا......!'' یہ کہہ کر جیوش بابا جھونپڑی کے اندر واپس چلا گیا۔

سارنگ مٹکا سنبھالے آگے بڑھا تو اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں یہ مردود اسے بہانے سے باہر تو نہیں نکال رہا تاکہ اس کا کام آسان ہو سکے اور اس مجبور لڑکی رکمنی کی عزت کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرے۔ اس خیال کے آتے ہی سارنگ کے قدم رک گئے اور پھر وہ واپس جھونپڑی کی طرف پلٹا، مٹکا اس نے ریت پر رکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھونپڑی کی عقبی طرف آیا۔ یہ جھونپڑی بانسوں کے ڈھانچے سے بنی ہوئی تھی جسے سوکھی گھاس، پھونس اور کھجوروں کی گھنی شاخوں سے ڈھک دیا گیا تھا تاہم اس کے اندر کہیں کہیں رخنے بھی موجود تھے۔ وہ آہستگی کے ساتھ ایک روزن کو تلاش کر کے قدرے جھک کر جھونپڑی کے اندر جھانکنے لگا۔

اندر کیا دیکھتا ہے کہ وہ ابلیس شخص اس لڑکی رکمنی کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''دیکھ ری......! میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں تُو یہ سب چھل فریب کر رہی ہے، تیرے سر پر کوئی سایہ وایا نہیں ہے، کیا تُو کسی لڑکے سے پریم کرتی ہے، اگر ایسا ہے تو میں خود تیری مدد کروں گا ورنہ تُو جانتی ہے کہ بستی کے سارے لوگ اور خود تیرے اپنے ماتا، پتا (ماں، باپ) مجھ پر کس قدر اعتماد کرتے ہیں...... میں بھوت اتارنے کے بہانے تیرا مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔''

جیوش بابا کی دھمکی پر رکمنی بری طرح لرز گئی اور آنسوؤں بھرے چہرے سے اس کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف تکتے ہوئے بولی۔ ''ہاں...... ! میں یہ سب اس لئے کرتی ہوں کہ میرے ماتا، پتا جی کر میری شادی وکرماجیت سے کر دیں۔'' بالآخر رکمنی نے جیوش بابا کے اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر سے مرعوب ہو کر اصل حقیقت کہہ ڈالی۔ تب پھر سارنگ نے دیکھا کہ جیوش بابا نے رکمنی کے دونوں ہاتھوں کی رسی کھول دی پھر بڑی چالاکی سے بولا۔

''اگر تو چاہتی ہے کہ وکرماجیت سے تیری شادی ہو جائے تو میں تیرا یہ کام آسان کر سکتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر الم نصیب رکمنی امید بھری نگاہوں سے اس شیطان کو دیکھنے لگی پھر اسی لہجے میں بولی۔

''کک...... کیا...... تت...... تم صحیح کہہ رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔

''ہاں...... ! بھلا میرا حکم ٹالنے کی کسے جرأت ہوگی، میں تیرے ماتا، پتا سے کہہ دوں گا کہ اگر وہ وکرماجیت کو اپنا داماد بنا لیں تو ان کی بیٹی کے سر سے یہ آسیب ہمیشہ کے لیے اتر جائے گا۔'' جیوش بابا نے اسے بڑی مکاری سے سبز باغ دکھاتے ہوئے کہا تو رکمنی کا پژمردہ چہرہ یکدم کھل اٹھا۔

''پر تجھے اس کے لیے میرا بھی ایک کام کرنا پڑے گا۔'' اس کے چہرے پر خوشی کے سوتے پھوٹتے دیکھ کر جیوش بابا گویا فوراً اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔

رکمنی نے پوچھا۔ ''ہاں...... ہاں...... مہاراج...... ! میں تمہاری ہر بات مانوں گی، بس میری کسی طرح وکرماجیت سے سگائی ہو جائے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر...... پھر...... !'' جیوش بابا بولا۔ ''تجھے کچھ عرصے تک میری داسی بن کر رہنا ہوگا اور جیسا میں کہوں، ویسا کرنا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر رکمنی نے وحشت زدہ نگاہوں سے اس شیطان کی طرف دیکھا، اس کی نگاہوں نے اس آنکھوں میں ناچتی ہوئی ایک خاص قسم کی چمک دیکھ لی تھی۔

ادھر سارنگ بھی جیوش بابا کے مکروہ عزائم پر ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا تھا، اسے اب جیوش بابا جیسے رذیل انسان پر مزید طیش آنے لگا، وہ سادھو کے بھیس میں ایک سیاہ کار شخص تھا اور ایک معصوم اور مجبور لڑکی کی عزت سے کھیلنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

رکمنی گومگو میں مبتلا ہو گئی تھی اگرچہ اس کے وجدان نے بھانپ تو لیا تھا کہ یہ بھیڑیا اس سے کیا چاہتا ہے مگر پھر بھی وہ اپنی سادگی میں یہ سمجھ رہی تھی کہ جیوش بابا شاید بوڑھا ہونے کی وجہ سے کچھ روز اس سے اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے لہٰذا اس نے کچھ سوچ کر اپنا سر جھکا لیا۔ جیوش بابا کی آنکھوں میں شیطانی چمک فزوں ہونے لگی، ادھر سارنگ کسی ناخوشگوار واقعے

کے وقوع پذیر ہونے تک چند ثانیے وہیں کھڑا رہا پھر اس کے بعد اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد وہ جلدی سے مٹکا اٹھائے آگے بڑھ گیا، اسے یقین تھا کہ مکار جیوش بابا جلد بازی نہیں کرے گا۔

سارنگ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھجوروں کے جھنڈ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا، اسے بستی کے لوگوں پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ یہ لوگ اپنی کم عقلی اور جاہلیت کی وجہ سے ایک شیطان کو اپنا اوتار بنائے ہوئے تھے۔

وہ کھجوروں کے جھنڈ کے دامن میں بنے ہوئے برساتی ٹوبے کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ ایک قدرتی کھالا تھا جو مون سون کی برساتوں سے بھرا رہتا تھا اور کئی مہینوں تک بستی والوں کی ضروریات پوری کرتا رہتا تھا، یہاں صرف ایک یہ برساتی کھالا نہ تھا بلکہ چند اور بھی تھے جو ذرا اور دور بنے ہوئے تھے، سارنگ کو وہاں بستی کے اور لوگ جن میں مردوں، بچوں کے علاوہ جوان لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں، نظر آ رہے تھے۔

اچانک سارنگ ٹوبے کے نزدیک پہنچ کر بری طرح ٹھٹکا، اس نے ایک نوعمر لڑکے کو دیکھا، جس نے اپنے کاندھوں پر لمبے بانس کے ذریعے پانی کے دو بڑے بڑے ڈرم اٹھا رکھے تھے، پہلے تو سارنگ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، وہ مٹکا پھینک کر بے اختیار اس کے قریب آ گیا، اس نوعمر لڑکے کی بھی جب سارنگ پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کے معصوم چہرے پر پھیلی ہوئی سوگواری خوشی میں بدل گئی، اس نے ڈرموں کا بوجھ یکدم اتار پھینکا اور خوشی سے دیوانہ وار سارنگ سے لپٹ گیا۔ یہ فرید وتھا جسے صحرائے تھر سے دغاباز گاتریا، سارنگ کی بھابی اللہ وسائی اور اس کے نوزائیدہ بچے منٹھار سمیت اغوا کر کے غائب ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دونوں میاں، بیوی اپنی بروقت حاضر دماغی اور غیر معمولی جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے جہاں داد اور اس کے بدمعاش حواریوں کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ٹیکسی میں وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے، سدھوراں کبھی کبھی سر گھما کر عقب میں دیکھتی کہ کہیں، جہاں داد کی جیپ اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہی، کوئی بیس پچیس منٹ بعد ٹیکسی نے انہیں گھر کے سامنے اتار دیا، پرویز نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور جیب سے چابیاں نکال کر دروازے پر پڑے تالے کو کھولا اور پھر وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

دونوں نے پانی پیا پھر اپنے کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''میرے خیال میں ہمیں واپس نہیں لوٹنا چاہئے تھا'' سدھوراں نے پُر خیال انداز میں پرویز سے کہا۔

''تو پھر کیا کرتے...... کہاں جاتے......؟'' پرویز نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں کم از کم جہاں داد کے باپ میر منصب خان سے مل لینا چاہئے تھا'' سدھوراں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب اس سے ملنے کی ضرورت نہیں۔'' پرویز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''میں اب سیدھا پولیس اسٹیشن جاؤں گا اور جہاں داد اور اس کے حواریوں کے خلاف رپورٹ درج کراؤں گا پھر انہیں لے کر ویران بنگلے میں چھاپہ لگواؤں گا، مجھے یقین ہے کہ وہ بنگلہ جہاں داد کی ملکیت ہی ہو گا۔''

''کیا یہ بہتر نہ ہو گا سائیں کہ ہم پہلے ڈاکٹر فوزیہ سے ایک ملاقات کر کے ان سے مشورہ کر لیں......؟'' سدھوراں نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھ کر تجویز دی۔

وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔''نہیں......! ہمیں اب اپنے معاملات خود

حل کرنا چاہئیں...... ہمیں اس وقت ہی متعلقہ تھانے میں جہاں داد کے خلاف پرچہ کٹوا دینا چاہئے تھا جب وہ میری غیر موجودگی میں اپنے ساتھیوں سمیت تمہیں یہاں اغوا کرنے آیا تھی، چلو اٹھو...... ہمیں ابھی تھانے چلنا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا مگر سدھوراں کے چہرے پر گہرے تذبذب کے آثار نمودار ہو گئے پھر وہ کسی خیال کے تحت پرویز سے بولی۔

''سائیں......! میری بات مانو تو ابھی تھانے یہ بات نہ پہنچاؤ تو اچھا ہے۔''

پرویز اس کی بات سن کر چونک کر بولا۔''مگر سدھوراں......! آخر کیوں......؟ تم تھانے سے کیوں کترا رہی ہو؟''

اس کے استفسار پر سدھوراں ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔''سائیں......! اگر ہم پولیس کے پاس جائیں گے تو وہ ضرور ہم سے جہاں داد کی دشمنی کی وجہ پوچھے گی اور آپ جانتے ہو کہ ہم اگر اصل بات، بتائیں گے تو ہماری محلے میں بلاوجہ بدنامی ہو گی...... میرا ماضی اچھالا جائے گا اور اس طرح آپ کی عزت پر بھی حرف آئے گا۔''

اس کی بات سن کر پہلی بار پرویز کے چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے شکست خوردہ سے انداز میں بولا۔''تو پھر تم ہی بتاؤ کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے...... ویسے اس کمینے جہاں داد کو لگام ڈالنی ضروری ہے ورنہ وہ اس طرح ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

''اس کا ایک ہی حل ہے سائیں......!'' سدھوراں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا اور پرویز مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''ہمیں ایک بار میر منصب خان سے مل لینا چاہئے۔'' سدھوراں نے اپنی بات مکمل کی۔ پرویز قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مگر کس طرح......؟ جہاں داد ہر وقت بھوکے بھیڑیے کی طرح اپنے غول سمیت ناری گھاٹ میں بیٹھا رہتا ہے۔''

''سائیں......! ہمیں اتنی ہمت تو کرنا ہی پڑے گی۔'' سدھوراں نے ہولے سے کہا۔

پرویز ایک گہری سانس لے کر بولا۔''ٹھیک ہے پھر ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔''

''سائیں......! یہی وقت مناسب ہے میر صاحب سے ملنے کا......'' اچانک سدھوراں نے کچھ سوچتے ہوئے قدرے جوشیلے لہجے میں کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرویز نے ایک لمحے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر تائیدی لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک پھر چلو یہ قضیہ آج ہی نمٹا دیتے ہیں لیکن اگر جہاں داد پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں پھر اپنے آدمیوں کے ذریعے اس سے نمٹوں گا تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ اس نے کس سے ٹکر لی ہے۔'' پرویز نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی...... سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا۔

پرویز اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔ ''ڈر نہیں اس کمینے جہاں داد کی اتنی جرأت نہیں کہ وہ اب دوبارہ ادھر آنے کی کوشش کرے...... میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں سائیں...... اس طرح دروازہ مت کھولنا نجانے باہر......!''

''کچھ نہیں ہوتا، تُو آرام سے بیٹھ......'' پرویز نے اسے تسلی دی پھر قریب دھری میز کی دراز سے سیاہ رنگ کا چمکتا ہوا ٹی ٹی پستول نکال لیا اور کمرے سے باہر نکل گیا، سدھوراں بھی قدرے ہراساں انداز میں چلتی ہوئی کمرے کے عقب میں ہو لی، اس کا دل انجانے اندیشوں کی آماجگاہ بنا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''کون ہے......؟'' پرویز نے دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے با آواز بلند پوچھا۔

''میں ہوں دلدار حسین......'' باہر سے ایک شناسا سا آواز ابھری تو پرویز نے مسکراتے ہوئے اپنا سر جھٹک کر پستول اپنی قمیض کے اندر اڑس لیا۔ سدھوراں نے بھی دلدار کی آواز سن لی تھی اور اس نے برا سا منہ بنا لیا تھا، وہ اس کمینے شخص سے شدید نفرت کرنے لگی تھی جو اپنے دوست کی بیوی کو بری راہ پر لگانے کی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا۔

''سدھوراں ......! تُو اندر جا......'' پرویز نے پیچھے مڑ کر سدھوراں سے کہا تو سدھوراں منہ بسور کر اندر کمرے میں آ گئی تاہم اسے اپنے شوہر کی یہ بات پسند آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب پرویز نے اسے پردہ کروایا تھا ورنہ اس سے پہلے پرویز اسے بن سنور کر دلدار حسین کے سامنے فخر سے پیش کیا کرتا تھا۔ سدھوراں محسوس کرنے لگی تھی کہ پرویز کے اندر شاید اب انقلابی تبدیلی آنے لگی۔ وہ اندر آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی، وہ دلدار حسین کے آنے کا مقصد اچھی طرح جانتی تھی، وہ شاید اپنے مکروہ مقصد کی تکمیل کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ دراصل دلدار حسین نے پرویز کو چند روز قبل اس مکروہ فعل پر راضی کر لیا تھا کہ پرویز اپنی بیوی سدھوراں کو انسپکٹر یاور حیات کے حوالے کر دے تو پھر وہ کبھی بھی ان کے دو نمبر کے دھندوں کے آگے روڑے نہیں اٹکائے گا۔

اب سدھوراں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اسے کیا جواب دیتا ہے پھر یہ سوچ کر

وہ اٹھ کر دبے پاؤں چلتی ہوئی اپنے کمرے کے دروازے کے قریب آئی اور جھری سے صحن میں جھانکا تو اس نے دیکھا کہ پرویز، دلدار حسین کو بیٹھک میں بٹھانے کی بجائے باہر صحن میں ہی اس سے باتیں کر رہا ہے، سدھوراں کے کانوں تک ان دونوں کی باتیں کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''یار پرویز......! تُو نے بڑے دن لگا دیئے، کیا ابھی تک بھابی کو راضی نہیں کر سکا، اس اُدھر انسپکٹر یاور حیات نے ناک میں دم کر رکھا ہے، سارا دھندا چوپٹ کر دیا ہے۔'' یہ دلدار حسین تھا، سدھوراں کو اس کی باتیں زہر لگتی تھیں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کمینے شخص کا منہ نوچ لے مگر اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جواب میں اس کا شوہر پرویز سے کیا کہتا ہے۔

''یار دلدارے......! تھوڑے دن اور ٹھہر جا، آج کل میں ایک مسئلے کا شکار ہوں۔''

''ارے یار! اس سے بڑھ کر اور کیا مسئلہ ہو سکتا ہے، پہلے اپنی بیوی کو انسپکٹر یاور کے پاس......!''

''دلدارے......!'' اچانک سدھوراں کو پرویز کی جوش غیرت سے لبریز کرخت آواز سنائی دی، پرویز کی اس گرجدار آواز میں بلا کی تختی تھی جس نے سدھوراں کا دل سرشار کر دیا تھا۔ سدھوراں پھر زیادہ دیر وہاں نہیں کھڑی رہی اور کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی اور دلدار حسین کے قریب آ کر اسے گھورتی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔

''کیوں ڑے......! کیا تیری کوئی بیوی، بیٹی نہیں ہے، تُو اسے کیوں نہیں بھیج دیتا اس کمینے انسپکٹر کے پاس...... میں کہتی ہوں دفع ہو جا یہاں سے......''

دلدار کے لئے یہ سب قطعاً غیر متوقع صورت حال تھی، اس نے ایک نظر پرویز کی طرف دیکھا مگر پرویز کے چہرے پر بدستور ٹھنڈی ہوئی سرد مہری محسوس کر کے وہ زہر خند انداز میں دانت پیس کر واپس مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

سدھوراں نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں اب پریشانی کے آثار عود کر آئے تھے، سدھوراں نے بڑی محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما اور حلاوت بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیا ہوا سائیں...... ! آپ کیوں پریشان ہیں...... اچھا ہی ہوا جو اس مردود کو ہم نے صاف جواب دے دیا...... اب یہ دوبارہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا اور نہ ہی یہاں آنے کی جرأت کرے گا۔''

''مگر سدھوراں......! یہ مردود میرے لئے مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔'' پرویز نے جواباً فکر بھرے لہجے میں کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"سائیں......! آپ ایسا کیوں نہیں کرتے، یہ خراب دھندا ہی چھوڑ دیں اور رزق حلال کمائیں، اللہ سائیں نے تم کو ہوٹل کی نیک کمائی کا ذریعہ دے تو رکھا ہے، یہی بڑی ہے۔"

بیوی کی بات سن کر پرویز نے چند ثانیے گہری اور پُرسوچ خاموشی کے بعد کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے تیری بات سدھوراں......! لیکن میں جن لوگوں کے ساتھ اس دھندے میں ملوث ہوں، وہ بہت خطرناک ہیں، اگر میں ان کا ساتھ چھوڑنا چاہوں تو وہ...... وہ لوگ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"مگر سائیں......! اللہ سائیں سب سے بڑا ہے، آپ صدق دل سے تائب ہو جائیں تو وہ آپ کی ضرور مدد کرے گا، اس پر بھروسہ رکھیں اور اسی سے مدد مانگیں۔" سدھوراں نے اسے تشفی دی۔

وہ فہمی انداز میں اپنا سر ہلانے لگا پھر یکدم اپنا سر جھٹک کر بولا۔ "اچھا ٹھیک ہے، اس مسئلے کو بھی دیکھ لیں گے، چلو دیر ہو رہی ہے، جہاں داد کے باپ سے ملنے نہیں چلنا......؟" سدھوراں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ کو جیسے ٹیکسی کی صورت میں اڑن کھٹولا ہاتھ آ گیا تھا جسے وہ اب فل اسپیڈ سے دوڑائے چلی جا رہی تھی، وہ بدطینت ٹیکسی ڈرائیور کو بڑی خوبصورتی سے دھوکا دے کر صاف بچ آئی تھی، اب وہ ٹیکسی کو پوری رفتار کے ساتھ بھگا رہی تھی، سڑک سنسان تھی پھر جب ذرا دیر بعد وہ کورنگی کریک کے چوراہے پر آئی تو سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے چند لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکنا چاہا مگر فوزیہ ان پر توجہ دیے بغیر زناٹے سے نکل گئی، آس پاس لوگوں نے ایک جوان لڑکی کو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں داب لی تھیں مگر فوزیہ کو ان لوگوں کی حیرتوں کی پروا کب تھی، وہ تو جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھی، وہ قیوم آباد چورنگی سے گزرنے لگی تو اسے سدھوراں کا خیال آیا، اس کا گھر بھی تو ادھر ہی تھا، اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ یقیناً سدھوراں سے ملتی ہوئی جاتی لیکن اس وقت تو فوزیہ کو خود اپنی پڑی ہوئی تھی، اس لیے وہ سیدھی ڈیفنس والے راستے آگے نکلی چلی گئی، بالآخر فوزیہ بخیر و عافیت اپنے بنگلے پر پہنچ گئی۔

اس کے مما، پاپا کی حالت غیر ہو رہی تھی، انہوں نے جو اپنی لاڈلی بیٹی کو زندہ سلامت

دیکھا تو جیسے دوبارہ جی اٹھے۔ سرجن وصی شاہ پہلے ہی علاقے کے ایس پی اور ٹی پی او کو اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا چکے تھے، بیگم وصی شاہ کا خیال تھا کہ معاملہ دبا دینا چاہیے مگر دونوں باپ، بیٹی ان مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا تہیہ کر چکے تھے لہٰذا سرجن وصی شاہ نے فوراً پولیس آفیسرز سے رابطہ کیا اور نئی صورتِ حال سے انہیں آگاہ کیا۔

چونکہ انہوں نے پہلے ہی اپنی بیٹی فوزیہ کے اغوا سے متعلق واردات کو راز میں رکھنے کی درخواست کی تھی، اس لیے ٹی پی او اور ایس پی ضابطے کی کارروائی کے لیے سادہ لباس میں ان کی کوٹھی پہنچے۔ ویسے بھی ان تینوں کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم تھے لہٰذا جب فوزیہ سے ملزموں کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تو فوزیہ نے بلاکم و کاست اغوا کنندگان کے بارے میں انہیں تفصیلاً بتا دیا۔ فوزیہ نے دونوں پولیس آفیسرز کو یہ بھی بتایا کہ جہاں داد تھر کے ایک بااثر زمیندار وڈیرے میر منصب خان کا اکلوتا بیٹا ہے جن کی رہائشگاہ کراچی میں بھی ہے۔ میر منصب خان کا نام انسپکٹر مشتاق احمد کے لیے شناسا تھا نہ صرف یہ بلکہ وہ میر منصب خان کی ڈیفنس والی رہائشگاہ سے بھی بخوبی واقف تھا لہٰذا انہوں نے فوری طور پر میر منصب خان سے ملاقات کا ارادہ کیا۔

"محض ملاقات کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ٹی پی او صاحب......!" سرجن وصی شاہ نے غصے سے تلملا کر کہا۔ "آپ کو انہیں حکم دینا ہوگا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے جہاں داد کو فوراً گرفتاری کے لیے پیش کرے، اس نے کسی معمولی ہاری کی بیٹی کو اغوا نہیں کیا ہے، اسے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا یار......! تمہیں کیوں فکر کرتے ہو۔" انسپکٹر مشتاق احمد نے دوستانہ لہجے میں کہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں میر منصب خان کو جانتا ہوں، وہ ایک شریف اور عام روایتی وڈیروں سے ہٹ کر ایک اچھا انسان ہے، تم دیکھنا وہ خود ہی اپنے بیٹے کو ہمارے حوالے کر دے گا لیکن......!" انسپکٹر مشتاق احمد نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سرجن وصی شاہ یکدم بولے۔ "لیکن کیا یار......؟"

ان کے قدرے حیرت آمیز استفسار پر انسپکٹر مشتاق صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے ہولے سے کھنکار کر بولا۔ "میرا خیال ہے جہاں تک آپ کی صاحبزادی کے اغوا کا معاملہ ہے، وہ دیرینہ دشمنی کا موجب نہیں ہے، اگر ہم جہاں داد کو گرفتار کرنے کی بجائے اگر آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کے بارے میں وارن کر دیں تو زیادہ بہتر رہے گا بصورت دیگر آپ بھی کوئی چھوٹی شخصیت نہیں ہیں، خواہ مخواہ معاملہ اچھالا جائے گا اور پھر کیا خبر دشمنی کا یہ سلسلہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دارز ہوتا چلا جائے۔''

انسپکٹر مشتاق احمد کی مفاہمانہ صراحت پر سرجن وصی شاہ ایک لمحے کو کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تاہم ان کے ساتھ بیٹھی فوزیہ نے اس کی بات کی غایت کو سمجھتے ہوئے فوراً کہا۔

''آپ کی بات بہت حد تک درست ہے انکل! واقعی ہمارے اور میر منصب خان کے بیچ کسی قسم کی کوئی دشمنی نہیں بس ایک چھوٹے سے معاملے پر جہاں داد کے دماغ میں ٹیڑھ سی آ گئی ہے اور میں آپ کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ جہاں داد واقعی اپنے باپ وڈیرے میر منصب خان سے بہت ڈرتا ہے، میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔''

''اور اگر دوبارہ اس نان سینس جہاں داد نے یہ اوچھی حرکت کر ڈالی تو.....؟'' سرجن وصی شاہ بولے۔

''تو پھر میرا وعدہ ہے کہ جہاں داد کو کڑی سے کڑی سزا دلوا کر رہوں گا۔'' انسپکٹر مشتاق احمد نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ اب دوبارہ ایسی کوئی حرکت کرنے کی جرأت کرے گا، ایک بار انہیں مدِمقابل کی طاقت کا اندازہ ہو جائے تو پھر خود ہی خاموشی سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔'' بیگم وصی شاہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

یہ طے کرنے کے بعد دونوں پولیس افسران وہاں سے رخصت ہو گئے، ڈاکٹر فوزیہ نے اسی وقت ڈاکٹر جواد احمد کو فون کیا، پہلے تو اسے فوزیہ کی آواز سن کر یقین ہی نہیں آیا پھر اس نے جلدی سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ اسی وقت اس کے ہاں پہنچ رہا ہے۔ اس کی عجلت آمیز بے چینی پر فوزیہ زیرِلب مسکرا دی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ فوزیہ کی رہائشگاہ پر تھا۔

''ہرگز نہیں اس کمینے جہاں دادا کو اس اوچھی اور مجرمانہ حرکت کی ضرور سزا ملنی چاہئے۔'' وہ ڈاکٹر فوزیہ سے ملنے اور اس سے ساری تفصیل سننے کے بعد بھنا کر بولا۔

''مگر جواد..... ! انکل مشتاق احمد نے یہ نہیں کہا کہ وہ اسے یوں ہی چھوڑ دیں گے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے بتایا اور اضافہ کیا۔ ''وہ اس کی ٹھیک ٹھاک ٹکور کریں گے، میرا خیال نہیں کہ اس کے بعد وہ دوبارہ میرے سامنے آنے کی جرأت کرے اور پھر یہ بھی تو سوچو نا کہ یہ ہماری عزت کا بھی معاملہ ہے۔''

اس کی بات سن کر ڈاکٹر جواد خاموش سا ہو گیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''تھینکس گاڈ.....! شکر ہے کہ تم خیریت سے گھر آ پہنچیں..... میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا،

کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا میں نے تمہیں، بہرحال اب تم ذرا محتاط رہنا۔''

فوزیہ اس کی بات سن کر زیرِلب مسکرا دی۔

☆======☆======☆

''یہاں کس سے ملنے آئی تھی تُو بتا..... میں ابھی اس کے کلہاڑی سے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا۔'' خالقو چند ثانیے گھبرائی کھڑی اپنی بہن ملوکاں کو شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں..... ماما..... اللہ رکھیو سے ملنے آئی تھی۔'' ملوکاں نے بدحواس ہو کر کہا۔

''یہ کون سا تیرا ماما ہے کہ جس سے میں واقف نہیں۔'' خالقو اسے آگ برساتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا اور پھر آگے بڑھ کر ایک زنانٹے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ ''بکواس کرتی ہے کمینی..... سچ سچ بتا، اڑیں کون سے یار سے مل کر آ رہی تھی، بتا ورنہ..... ادھر ہی ''کاری'' کر کے تیرے کلہاڑیوں سے ٹکڑے کر دوں گا، بول.....؟''

یہ موقع ایسا تھا کہ ملوکاں کی فطری سرکشی گھبراہٹ اور خوف تلے دب کر رہ گئی تھی مگر پھر بھی اس نے ذرا ہمت کر کے بھائی سے کہا۔ ''اداسائیں.....! اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں آتا تو ابھی چل میرے ساتھ..... میں تجھے ماما اللہ رکھیو سے ملاتی ہوں، وہی تجھے بتا دے گا کہ میں کس سے ملنے یہاں آئی تھی اور ماما اللہ رکھیو کو تو تُو بھی جانتا ہے ادا.....! یہ وہی شخص ہے جو مجھے اور میراں کو تمہارے پاس لے آیا تھا۔''

''ہاں..... ہاں.....! میں اچھی طرح جانتا ہوں اسے، چل پھر میرے ساتھ.....'' خالقو نے غصیلے لہجے میں دانت پیس کر کہا اور پھر یہ لوگ جیسے ہی واپس ماما اللہ رکھیو کے گھر کی طرف پلٹے تو اچانک ملوکاں کی نگاہ سامنے پڑی، وہ ٹھٹک کے رہ گئی، سامنے سے ماما اللہ رکھیو آتا ہوا دکھائی دیا، اسے دیکھتے ہی ملوکاں ایک ہذیانی چیخ مار کر اس کی طرف دوڑی اور اس سے لپٹ کر رو پڑی۔

''ماما.....! مجھے بچالو، میرا ادا خالقو مجھے ''کاری'' کر کے جان سے مارنا چاہتا ہے، اس کے ساتھ وہ مردود آچر خان بھی ہے۔'' ملوکاں نے خوف سے لرزیدہ لہجے میں اس سے کہا۔

ماما اللہ رکھیو فوراً اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے ازراہ تشفی ہولے سے بولا۔

''حوصلہ کر دھینے.....! تیرے ادا کی آنکھوں میں اس وقت لالچ کی پٹی بندھی ہے، وہ تیرے کو مارنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا تُو اس کے لیے سونے کی چڑیا ہے۔'' ماما اللہ رکھیو کی بات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سن کر ملوکاں کو احساس ہوا کہ یہ بات درست ہے، خالقو اسے ہلاک کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مارے گا، وہ محض اسے ڈرانا چاہتا ہے۔ یہ سوچ کر ملوکاں کو ذرا حوصلہ ہوا، اس اثناء میں وہ دونوں ان کی طرف گھورتے ہوئے قریب آن پہنچے تھے۔

''اللہ رکھیو......! میری بہن تجھ سے کیوں ملنے آئی تھی؟'' قریب پہنچتے ہی خالقو نے درشت نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

ماما اللہ رکھیو نے آہستگی کے ساتھ ملوکاں کو خود سے الگ کیا اور پھر خالقو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے انتہائی پُرسکون لہجے میں اس سے بولا۔ ''یہ میری دھیوں (بیٹیوں) جیسی ہے، کیا ایک دھی اڑیں بابا سے نہیں ملنے آسکتی، چریا......!'' ماما اللہ رکھیو نے ڈانٹا، وہ ایک جہاندیدہ شخص تھا، اسے بہر حال یہ معلوم تھا کہ ملوکاں درحقیقت کس سے ملنے آئی تھی اسی لئے اس نے اپنے لہجے سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر ہونے نہیں دی اور پورے سکون کے ساتھ پُراعتماد لہجے میں اس نے خالقو کو مطمئن کرنا چاہا تھا، یہی سبب تھا کہ خالقو اب کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ کھڑا آچر خان بغور ماما اللہ رکھیو کو گھورے جا رہا تھا۔

خالقو کو خاموش پا کر اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے ماما اللہ رکھیو سے پوچھا۔ ''تو اڑیں گھر میں اکیلا رہتا ہے یا تیرے ساتھ دوسرا بھی کوئی ہے، میرا مطلب ہے تیرا کوئی بیٹا یا بھتیجا......؟''

اس کے اس مکارانہ سوال پر ملوکاں ایک بار پھر پریشان سی نظر آنے لگی اور اس نے کن انکھیوں سے ماما اللہ رکھیو کی طرف دیکھا کہ اب وہ کیا جواب دیتا ہے۔ ماما اللہ رکھیو بھی ایک کائیاں شخص تھا، وہ اس سوال پر ذرا بھی نہ بوکھلایا اور بڑے اطمینان کے ساتھ ہولے سے مکار آچر خان کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ''تو اس چھوکری ملوکاں کا کیا لگتا ہے......؟''

اس کے پوچھنے پر آچر خان ایک لمحے کو گڑبڑا سا گیا مگر پھر ڈھٹائی سے بولا۔ ''پہلے میرے سوال کا جواب دے۔''

''کیوں میں پہلے تیرے سوال کا جواب دوں...... ؟'' ماما اللہ رکھیو اس بار تند لہجے میں بولا۔ ''تیرا کیا حق ہے جو تو مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے، کیوں میں تجھے بتاؤں کہ میرے گھر میں کون کون رہتا ہے......؟''

''اچھا...... اچھا......! ختم کرو اس بحث کو......'' خالقو جھلا کر بولا۔ پھر وہ ملوکاں کو گھور کر بولا۔ ''چل نی آ...... میرے ساتھ گھر چل......''

اس کی بات سن کر پھر ملوکاں نے ماما اللہ رکھیو کی طرف مدد طلب نگاہوں سے دیکھا تو ماما نے خالقو سے کہا۔ ''چلو میں بھی ساتھ چلتا ہو، بہت دن ہوئے بھا سکھیو سے ملے ہوئے۔''

ماما اللہ رکھیو کو ملوکاں کے حالات کا پتہ تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ملوکاں اب اپنے چاچا سکھیو کے ہاں رہنے لگی تھی، اسی لیے ماما اللہ رکھیو نے ملوکاں کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے کی بجائے چالاکی سے خود بھی ساتھ چلنے کا خیال ظاہر کیا۔

ملوکاں نے دیکھا کہ خالقو کے چہرے پر ایک لمحے کو تذبذب کے آثار پیدا ہوئے مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ جیسے اپنی کینچلی بدلتے ہوئے یکدم بولا۔ ''ماما سائیں......! تو کیوں بردبرد تکلیف کرتا ہے، میں ہوں ناں......''

''اڑے بابا چھورا......! تکلیف کیسی، بھا سکھیو سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج اسی بہانے اس سے بھی مل لوں گا۔'' ماما اللہ رکھیو کی بات پر خالقو اور آچر خان دونوں لاجواب سے ہو گئے...... ماما، ملوکاں کو لے کر آگے چل دیا، خالقو اور آچر خان راستے میں سے کھسک گئے تھے۔

ماما اللہ رکھیو نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور ملوکاں کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھایا کہ اب وہ ادھر کا رخ نہ کرے، یہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ سانول کے لیے بھی بہتر ہو گا باقی رہی بات سکھیو چاچا سے ملنے کی، اس سے وہ پھر کسی دن آ کر مل لے گا مگر اس سے پہلے وہ اپنے بھانجے سانول کا عندیہ لینا چاہتا تھا لہٰذا ماما اللہ رکھیو نے ملوکاں کو نہر کے کنارے چھوڑ دیا جہاں میراں پانی کے گھڑے لئے اس کی منتظر تھی پھر ماما واپس لوٹ گیا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر پہنچا تو سانول بھی آ گیا پھر رات کا کھانا دونوں نے حسب معمول اکٹھے کھایا، اس کے بعد ماما اللہ رکھیو نے سانول کو ساری بات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سانول......! ملوکاں ایک معصوم اور اچھی لڑکی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تجھے چاہتی بھی ہے، میں چاہتا ہوں تیرا گھر بھی بس جائے اور اس بے چاری کی بھی مصیبت سر سے ٹل جائے، آج کل وہ اپنے چاچا سکھیو کی سرپرستی میں اسی کے پاس رہ رہی ہے...... تو کہتے تو میں اس سے ملوکاں کے سنگ کے بارے میں بات کروں......؟''

ماما اللہ رکھیو کی بات سن کر سانول خاموش رہا، اس کی پُرسوچ اور خاموش نظروں کے سامنے اچانک سدھوراں کا چہرہ رقصاں ہو گیا پھر اس کے چہرے پر تلخی سی پھیل گئی۔

''دیکھ رے چھورا......! میں تیرے دل کے حال سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' ماما اللہ رکھیو نے جیسے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں تو ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لڑکی کی وجہ سے اپڑاں دل میلا کئے ہوئے ہے، پر تُو یہ بھی تو سوچ کہ ساری لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، او چریا......! ملوکاں تجھے بہت چاہتی ہے، مجھے یقین ہے تُو اس کی محبت میں اپنا دکھ بھی بھول جائے گا۔"

"ماما......! محبت تو سدھوراں بھی مجھ سے کرتی تھی۔ پر پھر اس نے کیوں مجھے دھوکا دیا......اور دوسرے کے ہاتھوں کھلونا بن گئی۔" اس بار سانول نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

"اڑے بابا......! تُو نے تو ایک ہی بات اپڑیں دل میں لے لی ہے...... ہو گی اس بے چاری کی کوئی مجبوری......!"

"لیکن ماما......! اسے مجھ پر تو بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔"

"ایک لڑکی ذات کی بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں...... یہ ٹھیک ہے اس کی غلطی تھی کہ وہ ایک جابر اور ظالم شخص کے ہاتھوں کھلونا بن گئی پر آخر کو تُو نے تو اپڑاں گھر ایک دن بسانا ہے ناں......؟" ماما نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر بڑے رسان سے بولا۔ "دیکھ ڑے سانول......! میں بھی تیرے باپ کی جگہ ہوں...... کیا تُو میری خوشی کی خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتا......؟"

ماما کی بات سن کر سانول نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی...... یہ حقیقت تھی کہ سانول کو اپنے ماما سے بہت محبت تھی، وہ اس کے روپ میں اپنے مرحوم ماں، باپ کا چہرہ ہی دیکھتا تھا لہٰذا اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ماما......! تیری اگر اسی میں خوشی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

ماما اللہ رکھیو اپنے بھانجے کی سعادت مندی پر ایک دم خوش ہو گیا اور بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

اگلے دن وہ سیدھا سکھیو کے گھر پہنچا، روٹی اس نے وہیں کھائی پھر اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ بھا سکھیو......! میرا ایک ہی بھانجا ہے سانول...... بڑا نیک اور شریف...... تیری ملوکاں اس کے پاس سدا سکھی رہے گی...... وہ زمیندار حاجی مولا بخش کی زمینوں پر کام کرتا ہے تُو بھی اگر اپڑیں تسلی کرنا چاہتا ہے تو اس سے کبھی جا کر مل لینا۔"

اس کی بات سن کر سکھیو ایک دم خوش ہو کر دوستانہ بے تکلفی سے بولا۔ "اڑے بابا! مجھے چھوکرے سے ملنے کی کیا ضرورت ہے...... ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہ بھانجا ہے تیرا...... پر تُو کہتا ہے تو میں کسی وقت مل لوں گا۔"

"تو کیا میں "ہاں" سمجھوں بھا سکھیو......؟" ماما اللہ رکھیو نے امید بھرے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

سکھیو چند ثانیے توقف کر کے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے بابا...... مجھے منظور ہے...... پر دیکھ میں بہت گریب انسان ہوں...... میری اپڑیں دھی بھی جوان ہے اور شادی کی عمر پر ہے، تیاری میں کچھ وقت تو لگے گا ہی......!"

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں بھا سکھیو......!" ماما اللہ رکھیو خوش ہوتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "دیکھ مجھے کچھ نہیں چاہئے، بس دو کپڑوں میں اللہ سائیں کا نام لے کر اپڑیں دھی ملوکاں کو بیاہ دے، یہی ہمارے لئے بہت ہے اور رہی بات تیری اپڑیں دھی میراں کی تو کیوں فکر کرتا ہے، میراں تو میری بھی دھیوں (بیٹیوں) جیسی ہے، اس کا ہم دونوں مل کر کوئی اچھا سنگ ڈھونڈ لیں گے۔"

"اچھا بھا اللہ رکھیو......! پھر میری طرف سے ہاں ہی سمجھو اور عیوضہ (لڑکی کا رشتہ دینے کی رقم) بھی میں تم سے نہیں لوں گا۔" سکھیو نے کہا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور بعد میں تاریخ طے کرنے لگے۔

☆======☆======☆

"فریدو......فریدو......! تت......تُو...... یہاں کیسے...... بھاگی اللہ وسائی کہاں ہے بتا مجھے جلدی......؟" سارنگ نے فریدو کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔ فریدو کافی کمزور لگ رہا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بے چارے ننھی سی جان سے بڑی مشقت لی جاتی رہی ہو۔ فریدو رونے لگا، سارنگ کا دل گھبرا گیا، اس نے دوبارہ پریشان کن تفکر سے پوچھا۔ "فریدو......! رو مت......اب میں آ گیا ہوں ناں...... مجھے بتا بھاگی اللہ وسائی کہاں ہے......کدھر ہے وہ......؟"

فریدو ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "وہ......وہ......ایک ہندو ساہوکار کے ہاں ہے، وہ گاتریا تھا ناں اس نے ہمیں یہاں لا کر بیچ دیا تھا۔"

سارنگ اس کی بات سن کر دہل گیا اور غصے سے دانت پیسنے لگا پھر پوچھا۔ "کیا وہ تیرے ساتھ ہی رہتی ہے......؟"

"نہیں......! وہ ایک دوسرے ہندو کے ہاں نوکرانی بن کر رہ رہی ہے مر......" فریدو اتنا بتا کر ذرا تھما تو سارنگ نے بے چینی سے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''مگر کیا......؟''

''وہ جس ہندو کے ہاں نوکرانی ہے، وہ بھی اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی ادھر پانی بھرنے آتی ہے مگر......!'' اس نے پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو سارنگ نے دوبارہ پریشان ہو کر پوچھا۔

''مگر کیا......؟ تُو آگے کیوں نہیں بتاتا۔''

''وہ ہندو ساہوکار آج رات اسے دوبارہ گاتریا کو فروخت کرنے والا ہے۔''

سارنگ اس کی بات سن کر پریشان سا ہو گیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''کیا آج بھابی پانی بھرنے نہیں آئی یہاں......؟''

''نہیں......! شاید اب وہ ادھر نہیں آئے گی۔'' فریدو نے بتایا۔ پھر وہ سارنگ سے دوبارہ لپٹ کر روتے ہوئے بولا۔ ''ادا......! مجھے یہاں سے لے چلو، وہ ہندو ساہوکار بہت ظالم ہے، وہ مجھے بہت مارتا ہے ہنٹروں سے...... یہ دیکھ......!'' یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض اوپر اٹھائی تو سارنگ نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ پر سرخ لکیریں بنی ہوئی ہیں، اس معصوم کی زخمی پیٹھ دیکھ کر سارنگ کا دل کٹ گیا، وہ اسے تسلی دیتے ہوئے پیار سے بولا۔

''فریدو......! تُو بڑا بہادر بچہ ہے ناں......! اب تُو بالکل پریشان نہ ہو، میں آ گیا ہوں...... چل مجھے پہلے اس کمینے ہندو کا گھر دکھا جس نے بھابی اللہ وسائی کو نوکرانی بنا کر رکھا ہے۔''

اس کی بات سن کر فریدو کی معصوم آنکھوں میں یکدم خوف سا سمٹ آیا...... وہ بولا۔

''مگر مجھے اگر ذرا بھی دیر ہو گئی تو وہ ظالم ساہوکار مجھے بہت مارے گا۔''

''اس کمینے ساہوکار کا کیا نام ہے جس نے تجھے غلام بنا کر رکھا ہے......؟'' سارنگ نے پوچھا۔

''دیال داس نام ہے اس کا......!''

''اور بھابی اللہ وسائی کس ساہوکار کے ہاں ہے؟''

''اس کا نام رام دیال ہے......'' فریدو نے بتایا۔

سارنگ ذرا دیر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ''فریدو......! میری بات اب غور سے سن، تُو ایسا کر پہلے مجھے اپنے ساتھ لے چل اور دیال داس کا گھر دکھا، اس کے بعد مجھے رام دیال کے گھر کا پتہ سمجھانا، میں پہلے بھابی اللہ وسائی کو لے کر تیرے پاس آؤں گا تو گھر کے باہر مجھے تیار کھڑا ملنا...... پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''مگر ادا سارنگ......! دیال داس بڑا ظالم انسان ہے، وہ تو مجھے شام کو زنجیروں سے

کمرے میں قید کر دیتا ہے، میں کیسے باہر نکلوں گا......؟'' اس کے معصوم لہجے سے خوف ٹپک رہا تھا۔

سارنگ چند ثانیے خاموشی سے اپنے دانت پیستا رہا پھر اس کے بعد اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ''تُو اس کی فکر نہ کر...... میں تجھے کسی طرح سے نکال لاؤں گا...... پر پہلے مجھے اپنے ساتھ لے چل......''

اس کی بات سن کر فریدو زور زور سے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... نہیں...... ادا......! اب میں وہاں نہیں جاؤں گا، وہ بڑا ظالم ہے، پر میں تجھے ایک بات بتاتا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں......! بول کیا بات ہے؟''

''میں اور بھابی اللہ وسائی یہاں روزانہ پانی بھرنے آتے ہیں، کل بھابی نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ اسے آدھی قیمت میں دوبارہ گاتریا کے ہاتھ فروخت کیا جانے والا ہے اور بھابی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آج کسی طرح اس ہندو سیٹھ رام دیال کے ہاں سے بھاگ کر میرے پاس یہاں آئے گی پھر ہم دونوں بھاگ چلیں گے لیکن ادا......! میں جانتا ہوں ایسا کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ہم دونوں ایک بار پہلے بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن اس کے بدمعاشوں نے ہمیں فوراً پکڑ لیا تھا اور ہمیں بہت مارا تھا، ان کے پاس لاٹھیاں اور سانڈنیاں ہیں۔'' فریدو نے تفصیل بتائی۔

سارنگ ذرا دیر پریشان کن خاموشی میں مستغرق رہا پھر اس کے بعد بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے...... پہلے ہم یہاں انتظار کر لیتے ہیں، کیا خبر بھابی اللہ وسائی یہاں آ جائے۔''

''نہیں ادا......! میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ادھر اب نہیں آ سکتی...... اسے رام دیال نے قید کر رکھا ہے کیونکہ آج رات وعدے کے مطابق گاتریا اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے گا۔''

''چل پھر میرے ساتھ...... میں خود ہی رام دیال کا گھر تلاش کر لوں گا...... آ......!''

سارنگ نے اتنا کہا اور اس کا ہاتھ پکڑا مگر اس سے پہلے وہ جیوش بابا کا مٹکا بھرنا نہیں بھولا تھا...... اس نے پانی سے بھرا گھڑا سر پر رکھا اور فریدو کو لے کر جیوش بابا کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سارنگ نے پہلے فریدو کو ایک کھجور کے درخت کے جھنڈ میں کھڑا کیا اور پھر خود مٹکا اٹھائے جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا تو سامنے کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بوڑھا شیطان جیوش بابا اس مجبور لڑکی رکمنی کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیوش بابا، سارنگ کی اس بے وقت کے دخل در معقولات پر یکدم برافروختہ ہو کر بانٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ''دفع ہو جا یہاں سے...... جا......!''

وہ لڑکی بھی بے چاری یکدم سمٹ کر ایک طرف ہو گئی، اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔

''تُو نے سنا نہیں......! دفع ہو جا یہاں سے......'' جیوش بابا نے چلا کر دوبارہ کہا۔

سارنگ نے خاموشی سے پانی کا بھرا مٹکا ایک کونے میں رکھا، ایک نظر سکڑی سمٹی رکمنی پر ڈالی اور جھونپڑی سے باہر آ گیا۔

جھونپڑی سے باہر آ کر سارنگ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

اسے اس بوڑھے ہوس پرست پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا جو ایک معصوم لڑکی کی مجبوری سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ساتھ ہی سارنگ کو اس لڑکی رکمنی پر بھی غصہ آنے لگا جو اپنی کم عقلی کی بنا پر اس بوڑھے کے ہاتھوں کھلونا بننے پر تیار تھی تاہم سارنگ کو اتنا یقین تھا کہ جب تک وہ خود یہاں موجود ہے، وہ بوڑھا، رکمنی کی عزت تار تار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا...... سارنگ کو ابھی وہاں کھڑے ذرا ہی دیر گزری تھی کہ اس نے دیکھا جیوش جھونپڑی سے باہر نکلا اور اس کی طرف زہر خند نظروں سے گھورتا ہوا قریب آیا۔

''تُو اگر میرا چیلا بن کر یہاں رہنا چاہتا ہے تو یہاں کی کوئی بات تجھے باہر نہیں بتانی ہو گی سمجھا تُو......؟'' جیوش بابا مکروہ لہجے میں بولا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے گھناؤنے انداز میں مسکراتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ ''اور ویسے بھی اگر تُو نے کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو تیرا ہی نقصان ہو گا، کوئی تیری بات کا یقین ہی نہیں کرے گا بلکہ الٹا لوگ مار کر تیرا بھرکس نکال دیں گے۔'' وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر بولا۔ ''تُو نے میرا روپ تو دیکھ ہی لیا ہے، اگر تُو اب بھی میری چالیس دنوں تک سیوا کرنے کی ضد پر قائم ہے تو تیری مرضی...... ویسے تُو واپس لوٹ بھی سکتا ہے۔''

سارنگ ابھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا اور وہ کون سا واقعی اس بوڑھے شیطان کی سیوا کرنے آیا تھا، یہ تو اس کی ایک مجبوری تھی کہ وہ ابھی اس جھونپڑی میں قیام کرنا چاہتا تھا تاکہ جس مقصد کے لیے میلوں دور سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں آیا ہے، وہ پورا ہو جائے۔ سارنگ کو املی کی زبانی پہلے ہی اس بڈھے کی اصلیت کا علم تھا کہ وہ گاتریا کے ساتھ معصوم اور مجبور انسانوں کی اسمگلنگ جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا اور سارنگ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ دغاباز گاتریا ایک روز یہاں ضرور آئے گا جبکہ اب سارنگ کو تو فرید اپنی بھابی اللہ وسائی کے بارے میں بھی پتہ چل چکا تھا، اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ

بدکردار رام دیال آج رات اللہ وسائی کو گاتریا کے ہاتھ آدھی قیمت میں فروخت کرنے والا ہے، اسی لیے گاتریا کا اب یہاں آنا یقینی ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سارنگ نے اپنے دل میں مصمم ارادہ باندھ رکھا تھا کہ وہ ان دونوں شیطانوں یعنی جیوش بابا اور گاتریا کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہے گا تاکہ پھر کبھی یہ دونوں شیطان مجبور لڑکیوں کی عزت سے نہ کھیل سکیں اور نہ ہی بردہ فروشی جیسے گھناؤنے اور مذموم کاروبار کرنے کے قابل ہو سکیں۔

چنانچہ جیوش بابا کی بات سن کر سارنگ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مہاراج......! یہ کوئی بڑی بات نہیں، یہ جوان ناریاں (لڑکیاں) تو ویسے بھی آپ کی سیوا کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے چھما (معاف) کر دو...... میں بغیر اجازت اندر گھستا چلا آیا۔''

سارنگ کی چالاکی جیوش نہ سمجھ سکا بلکہ اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک لہرائی اور وہ یکدم خوش ہو کر سارنگ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''واہ تُو تو واقعی میرا پکا اور قابل اعتبار چیلا ہے...... دل چاہتا ہے اب تجھے یہاں سے جانے نہ دوں...... کیا تُو میرے پاس ہمیشہ رہے گا......؟ بہت عیش ہوں گے تیرے بھی......'' جیوش بابا، سارنگ کے جھکے چہرے کو بغور گھورتے ہوئے بولا۔

سارنگ نے پہلے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی پھر اوپری دل سے بولا۔ ''مہاراج......! اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو گی میں ساری عمر تمہارے چرنوں میں پڑا سیوا کرتا رہوں۔''

اس کی بات سن کر جیوش بابا ایک بار پھر خوش ہو گیا، وہ اسرار بھرے لہجے میں بولا۔ ''بھگوان اب......! آج رات میرا ایک خاص چیلا ادھر آئے گا تُو ایک کام کرنا جب تک میری اجازت نہ ہو، اندر کسی کو آنے نہ دینا، کبھی کبھی رات میں بھی میرے پاس لوگ آتے ہیں کوئی بہانہ بنا کر چلتا کر دینا، سمجھ گیا......؟''

سارنگ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی بات سن کر سارنگ کا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا...... وہ اس بوڑھے شیطان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا، آج رات کسی ''مہمان'' کے آنے والی بات پر سارنگ چونکا تھا۔ ''کیا وہ مہمان گاتریا ہو گا؟'' اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا تھا...... بہرطور سارنگ نے جیوش بابا کو اپنی وفاداری کا پورا یقین دلایا تو جیوش بابا اسے اپنے ساتھ اندر جھونپڑی میں لے آیا۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرویز اور سدھوراں ایک نئے عزم کے ساتھ میر منصب خان سے ملاقات کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلے، اس بار انہوں نے منی بس کی بجائے ٹیکسی کرلی تھی پھر ٹیکسی تھوڑی دیر بعد ڈیفنس میں داخل ہوگئی تھی جو قیوم آباد سے زیادہ دور نہ تھا۔ دونوں میاں، بیوی ٹیکسی کی عقبی سیٹ پر براجمان تھے، جیسے جیسے منزل کے وہ دونوں قریب پہنچ رہے تھے، ان کے اندر کی بے چینی بھی فزوں تر ہونے لگی تھی مگران دونوں نے ہمت اور حوصلے کے ساتھ خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا تھا...... پرویز، ٹیکسی ڈرائیور کو میر منصب خان کی کوٹھی کا ایڈریس بھی سمجھاتا جارہا تھا۔

پھر اس کے ذرا ہی دیر بعد ٹیکسی نے انہیں مطلوبہ کوٹھی کے سامنے اتار دیا، کوٹھی کے قریب پہنچ کر دونوں میاں، بیوی بری طرح ٹھٹکے تھے، کوٹھی کے گیٹ کے قریب ایک بڑی نیلے رنگ کی سنگل پجارو جیپ کھڑی تھی جس کی چھت پر نیلے رنگ کی بتی بھی نصب تھی، ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح باوردی گارڈ باہر مستعد کھڑا تھا، جیپ کو دیکھ کر پرویز اور سدھوراں نے اندازہ لگایا کہ اندر اس وقت کوئی اعلیٰ پولیس افسر موجود ہے۔

پرویز نے جلدی سے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر اسے رخصت کیا اور ایک الجھی ہوئی سی نظر سدھوراں پر ڈالی، جو قدرے پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے سدھوراں اندر کوئی بڑا پولیس افسر خان صاحب کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہے، تمہارا کیا خیال ہے، کیا کرنا چاہئے اب......؟''

سدھوراں نے شوہر کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے فوراً کہا۔ ''یہی تو موقع ہے ان سے ملنے کا، چلو اندر چلتے ہیں۔''

''چلو...... پھر میں تیار ہوں۔'' پرویز نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔ دونوں گیٹ کی طرف بڑھ گئے، گیٹ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا باوردی گارڈ موجود تھا۔

''بھائی......! ہمیں اندر خان صاحب سے ملنا ہے۔'' پرویز نے کہا تو کرخت چہرے والے گیٹ مین نے سر سے پاؤں تک ان دونوں کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''تم دونوں کون ہو اور وڈے سائیں سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

پرویز نے سدھوراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری بیوی ہے اور اس کا تعلق وڈے سائیں کے گوٹھ سے ہے، یہ وڈے سائیں کے پاس اپنی ایک فریاد لے کر آئی ہے۔''

باوردی گیٹ مین چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں اندر جا کر وڈے سائیں کو خبر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

وہ ذرا دیر بعد واپس آیا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا...... وہ دونوں خاموشی سے اس کے عقب میں چلتے ہوئے اندر آ گئے...... گیٹ مین انہیں ایک ڈرائنگ روم کے طرز کے کمرے میں بٹھا کر واپس لوٹ گیا۔

وہاں ایک ملازم نے پرویز سے کہا۔ ''سائیں وڈا اندر چند پولیس افسروں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہے، تھوڑا انتظار کرو جیسے ہی وہ فارغ ہوئے، میں آ کر تمہیں اندر وڈے سائیں کے پاس لے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

دونوں میاں، بیوی مضطربانہ انداز میں خاموشی سے بیٹھے رہے، اس اثناء میں ایک دوسرا ملازم کولڈ ڈرنک ان کے سامنے رکھی تپائی پر رکھ کر خاموشی سے چلا گیا، دونوں نے کولڈ ڈرنک پی، اس کے ذرا ہی دیر بعد باہر ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔

''شاید پولیس افسران واپس چلے گئے ہیں۔'' سدھوراں نے ہولے سے کہا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہی ملازم دوبارہ اندر داخل ہوا اور پھر ان دونوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا، پرویز اور سدھوراں خاموشی سے اس کے ساتھ ہولئے۔

وہ انہیں ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا تھا، کمرے کا ماحول خنک تھا اور بڑے شاہانہ طرز کی اشیاء سے مزین، سامنے ایک بڑے صوفے پر ایک بارعب شخص بوسکی شلوار، قمیض میں ملبوس ٹانگ پر ٹانگ رکھے براجمان تھا، اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں، چہرے پر رعونت کے تاثرات نمایاں تھے، اس کے عقب میں دو مسلح گارڈز مستعد کھڑے تھے، پرویز اور سدھوراں نے اندازہ لگایا کہ یہی شخص جہاں داد کا باپ میر منصب خان ہے، دونوں نے باادب ہو کر اسے سلام کیا۔

''بیٹھو بابا......!'' وڈیرے منصب خان نے سپاٹ لہجے میں انہیں بیٹھنے کو کہا۔ دونوں خاموشی سے اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

''ہاں بابا......! بولو کیا بات ہے......؟''

''بھوتار سائیں...... سمجھ میں نہیں آرہا میں کیسے بات کروں، مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی کیونکہ سائیں میری فریاد کا تعلق چھوٹے سائیں سے ہے۔'' سدھوراں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

منصب خان قدرے چونک کر سدھوراں کا چہرہ تکنے لگا پھر کھرکھراتے لہجے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بولا۔ ”تمہارا مطلب جہاں داد سے ہے؟“

”ہا..... ہاؤ سا..... سائیں.....“ سدھوراں نے سر جھکا کر کہا۔

”ہوں.....!“ وڈیرے منصب خان نے حلق سے ایک پُر خیال ہنکاری بھری اور پھر جب بولا تو اس کی بارعب آواز میں قدرے بوجھل پن سا عود کر آیا۔ ”دیکھو چھوکری.....! جہاں داد میرا پٹ ضرور ہے لیکن اگر اس نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو مجھ سے صاف صاف بات کر..... میں سن رہا ہوں۔“

وڈیرے کی بات سن کر سدھوراں کو حوصلہ ہوا اور اس نے ایک نگاہ اپنے قریب بیٹھے شوہر پرویز کو دیکھا پھر دھیرے دھیرے اس نے شروع سے آخر تک جہاں داد کی زیادتیوں کی ساری کتھا بلاکم و کاست سنا دی..... یہ سب سنا کر وہ بے اختیار ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔

وڈیرے منصب خان نے بغور سدھوراں کی فریاد سنی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سدھوراں کے قریب آیا اور اپنا دایاں ہاتھ بڑے شفقت بھرے انداز میں اس کے سر پر دھر کر مرتعش لہجے میں بولا۔ ”تُو ہماری بچ ہے، ہمیں تیری یہ بات پسند آئی کہ تُو نے کسی اور جگہ (پولیس وغیرہ) فریاد ڈالنے کی بجائے ہم سے اس کا ذکر کیا، اب تُو بالکل بے فکر ہو جا..... جہاں داد تیرا اب کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

بے اختیار سدھوراں نے وڈیرے کا ہاتھ تھام کر بڑی عقیدت کے ساتھ چوما پھر بولی۔ ”سائیں بھوتار.....! مجھے آپ سے یہی امید تھی اس لیے انصاف مانگنے آپ ہی کے در پر آئی تھی۔“

وڈیرا منصب خان اپنے صوفے کی طرف آیا اور بیک جنبش اپنے ایک آدمی سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ’جہاں داد کو فوراً ادھر حاضر کیا جائے۔“

”حاضر سائیں وڈا.....!“ ملازم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

”سائیں بھوتار.....! میں نے ایک اور عرضی دینی تھی۔“ معاً چند ثانیے کی خاموشی کے بعد سدھوراں نے وڈیرے سے کہا۔

”ہاں..... ہاں بولو.....! ہم سن رہے ہیں۔“ جواباً وڈیرے منصب خان نے کھلے دل کے ساتھ کہا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”سائیں.....! چھوٹے سائیں نے اب تک میرے ساتھ جو بھی زیادتیاں کی ہیں، میں انہیں معاف کرتی ہوں..... میری آپ سے بس اتنی عرضی ہے کہ آ..... آپ بھی اسے

معاف کر دیں..... بس اتنا ہی کہنا تھا..... بس یہی مطلب تھا..... بہت کہنا۔“

”ہرگز نہیں.....! ہم اسے معاف نہیں کر سکتے۔“ وڈیرا درشت لہجے میں بولا۔ ”جہاں داد ہمارا بیٹا ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے رہاکوں (کھیت مزدوروں) کی عزتوں کے ساتھ کھیلے..... اسے ہم پوری پوری سزا دیں گے۔“

سدھوراں کو دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی..... وڈیرا منصب خان بری طرح غصے سے کھول رہا تھا۔

پرویز، وڈیرے کی انصاف پسندی سے بڑا متاثر نظر آرہا تھا، ذرا دیر گزری تھی کہ وہی ملازم جا کر دوبارہ نمودار ہوا اور مؤدبانہ انداز میں وڈیرے سے بولا۔ ”سائیں وڈا.....! چھوٹے سائیں کو ان کے موبائل پر پیغام دے دیا ہے، وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“

جواباً وڈیرے نے اثبات میں سر ہلا دیا..... اس کے چہرے پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ماحول میں چند ثانیے عجیب سے کھچاؤ کی کیفیت طاری رہی پھر اس کے بعد پرویز نے سدھوراں کے کان میں کچھ کہا تو وہ وڈیرے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بس..... سائیں.....! ہمیں اجازت ہے.....؟“

”نہیں.....! جہاں داد کو آ لینے دو.....“ وڈیرے نے گمبھیر لہجے میں کہا اور سدھوراں نے چپ سادھ لی۔

خاصی دیر بعد جہاں داد آیا، اس کی نظر پرویز اور سدھوراں پر پڑی تو وہ بری طرح بوکھلا گیا پھر جیسے آن واحد میں وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا، اب اس کی آنکھوں میں طیش اور چہرے پر کرختگی عود کر آئی تھی اور وہ بڑے تلملائے ہوئے انداز میں پرویز اور سدھوراں کو گھورنے لگا اسی اثناء میں وڈیرے منصب خان کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”جہاں داد.....! کیا تُو اب اپنے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گیا ہے.....؟“

باپ کی بات سن کر جہاں داد نے دوسرے ہی لمحے قدرے شرمندہ ہو کر اسے سلام کیا۔

”بیٹھو..... ادھر سامنے.....!“ وڈیرے نے اپنے بیٹے کو دانستہ اپنے ساتھ بیٹھنے کی بجائے سامنے کے صوفے پر بیٹھنے کا حکم دیا جدھر پرویز اور سدھوراں بیٹھے تھے۔ جہاں داد اندر ہی اندر تلملاتا ہوا چاروناچار ذرا ہٹ کر صوفے کے کونے میں دھنس گیا، وڈیرا چند ثانیے اپنے بیٹے کو تیز نظروں سے گھورتا رہا۔

اچانک جہاں داد نے اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے باپ سے پوچھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''باباسائیں......! یہ دونوں ادھر کیوں آئے ہیں؟'' اس کا اشارہ پرویز اور سدھوراں کی طرف تھا۔

''پہلے تم میری ایک بات کا جواب دو۔'' اچانک وڈیرے میر منصب خان نے گونجدار آواز میں بیٹے سے کہا۔ اس کے مرتعش سے چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ اپنی اندرونی کھولتی ہوئی کیفیت پر بمشکل قابو پائے ہوئے ہے۔

''ڈاکٹر فوزیہ کو تم نے اغوا کیا تھا؟'' وڈیرے منصب خان نے سرسراتے لہجے میں دھماکا کیا۔ اس کی بات سن کر نہ صرف سدھوراں اور پرویز بھی بری طرح چونک پڑے تھے بلکہ جہاں داد بھی ایک لمحے کو گم صم سا ہو گیا تھا، وہ باپ کی استفسار طلب نظروں کی تپش محسوس کر کے پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

''باباسائیں......! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......؟''

''میں نے جو کہا ہے، وہ تم نے اچھی طرح سن بھی لیا ہے اور سمجھ بھی......!'' وڈیرے منصب خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس افسر مشتاق احمد آئے تھے اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ سرجن وصی حیدر شاہ کی بیٹی ڈاکٹر فوزیہ تمہاری قید سے فرار ہو کر اپنے گھر پہنچ چکی ہے......تم نے کیا اسے اپنے گوٹھ کی کوئی معمولی چھوکری سمجھ لیا تھا......؟''

''باباسائیں......! پہلے آپ ان دونوں کو یہاں سے رخصت کریں پھر میں آپ......!''

''ہرگز نہیں......!'' وڈیرا منصب خان اس کی بات سمجھ کر یکدم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا تو جہاں داد بھی فوراً باپ کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، ساتھ ہی پرویز اور سدھوراں بھی احتراماً اپنی جگہ سے اٹھنے لگے تو وڈیرے نے انہیں اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہا۔

''پہلے تم میری بات کا جواب دو جہاں داد......! تم نے ڈاکٹر فوزیہ کو اغوا کیا تھا اور کیوں......؟ مگر یاد رکھنا میں تمہارا باپ ہوں اور اگر مجھ سے تم نے کسی بھی قسم کی چالاکی چھپانے کی کوشش کی تو تمہیں یہ سچ تھانے جا کر اگلنا پڑے گا۔'' وڈیرے منصب خان کے لہجے میں بلا کا غیظ تھا اور لگتا تھا کہ انہوں نے آج اپنے لاڈلے بیٹے سے بڑی کڑی باز پرس کا تہیہ کر رکھا ہے۔ ادھر جہاں داد کا چہرہ پریشانی اور بدحواسی کے مارے تمتمانے لگا تھا، اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا، اس کی طول پکڑتی خاموشی پر وڈیرے منصب خان نے

سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو جہاں داد نے اپنا سر جھکا لیا۔

''تم نے......تم نے......اپنے باباسائیں کی عزت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا......کل تک جو پولیس والے مجھ سے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے، آج وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اور وہ بھی باوردی میرے پاس آ کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمہارے کرتوتوں کی داستان سنا رہے تھے اور میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا، کیا اسی دن کے لیے میں نے تمہیں جوان کیا تھا کہ تم اپنے باباسائیں کی عزت کو مٹی میں ملا دو......؟''

وڈیرا غیظ کے عالم میں کانپنے لگا۔ جہاں داد نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو وڈیرا اسے کچھ بولنے سے روکتے ہوئے پرویز اور سدھوراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس چھوکری سدھوراں کو آج سے تم میری پناہ میں سمجھو اور تم نے اس معصوم چھوکری کے ساتھ جو ظلم کیا ہے اور اب تک کرتے آ رہے ہو، تمہیں بعد میں اس کا حساب بھی دینا ہو گا......میری ایک بات کان کھول کر سن لو جہاں داد......! تم نے آج کے بعد ان دونوں کو پریشان کرنے یا کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا کیونکہ مجھے ایسی اولاد کی ضرورت نہیں جو اپنے باپ اور خاندان کی عزت کی دشمن ہو، میری بات سمجھ رہے ہو ناں......؟'' وڈیرے نے خاصی صراحت کے ساتھ کہا۔

''مگر باباسائیں......!''

''بس......! تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے اب......'' وڈیرے نے اس کی بات کاٹ کر اپنا ایک ہاتھ اسے خاموش رہنے کے انداز میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ میرا حکم ہے کہ تم اسی وقت شہر چھوڑ کر گوٹھ کی طرف لوٹ جاؤ اور جب تک میں تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہ دوں، تم نے ادھر کا رخ بھی نہیں کرنا ہے۔''

جہاں داد اپنے باپ کے غضب ناک لہجے پر خاموش ہو گیا مگر اس کے اندر کینہ و بغض کا طوفان کروٹیں بدلنے لگا تھا البتہ پرویز اور سدھوراں کے چہروں پر اب گہری طمانیت بکھر گئی تھی۔

☆======☆======☆

سرجن وصی شاہ بری طرح تلملائے ہوئے تھے، اپنی بیٹی فوزیہ کے اغوا والے معاملے کے بعد سے وہ اپنے گہرے دوست انسپکٹر مشتاق احمد سے بھی ناراض ہو گئے تھے، انہوں نے ہر حالت میں جہاں داد کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے اور کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا تہیہ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انسپکٹر مشتاق احمد نے یہ مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کیا تھا..... اگرچہ بعد میں ان کی بیگم اور بیٹی فوزیہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اب اس معاملے کو اخر ہی دفن کر دیں کیونکہ وہ وڈیرا زادہ دوبارہ ایسی اوچھی حرکت کرنے کی جرأت نہ کرے گا لیکن اس کے باوجود وصی شاہ کا غصہ کم نہ ہوا تھا۔

پھر ایک روز انسپکٹر مشتاق احمد نے ٹیلیفون پر سرجن وصی شاہ سے رابطہ کیا۔

''جناب.....! میں نے جہاں داد کے باپ منصب خان سے ملاقات کی تھی، وہ اپنے بیٹے کی اس حرکت پر سخت شرمسار تھے۔''

''ان کی شرمساری سے بات نہیں بنے گی انسپکٹر صاحب.....!'' سرجن وصی شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ارے بھئی.....! وہ تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''کون، وہ مردود جہاں داد.....! ٹھیک ہے، اسے لے آؤ میرے پاس، تمہارے اندر ہمت نہیں ہے تو میں خود اس کمینے کی گردن دبا دوں گا۔''

''مجھے تمہاری ذہنی اذیت کا بخوبی اندازہ ہے وصی شاہ.....! جہاں داد کا باپ منصب خان خود تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے اور میں اسی وقت اسے اپنے ہمراہ لے کر آ رہا ہوں۔'' انسپکٹر مشتاق احمد نے کہا مگر سرجن وصی شاہ کا غصہ پھر بھی نہ اترا۔

''اس کا باپ مجھ سے گالیاں سننے آ رہا ہے، دیکھو انسپکٹر مشتاق.....! تم میرے سچے اور اچھے دوست ہو تو اسی وقت جہاں داد کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دو بس.....!''

''میں تمہارا اچھا اور سچا دوست ہوں، اسی لئے تمہیں صحیح مشورہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں ناں یار.....!'' انسپکٹر مشتاق احمد نے رسانیت سے کہا۔ ''دیکھو ہم پولیس والوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوتا ہے..... تم ایک معزز شخص ہو..... تمہاری معاشرے میں اپنی ایک ساکھ ہے، میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا کہ یہ ایسا نازک اور حساس معاملہ ہے کہ اس کو جتنا بھی اچھالیں گے، اس سے تمہیں ہی نقصان پہنچے گا..... بہتر یہی ہے کہ معاملہ معافی تلافی کے بعد یہیں ختم کر دیا جائے۔'' پھر انسپکٹر مشتاق نے مسز وصی شاہ سے بات کی۔

''بھابی.....! آپ ہی سمجھائیں ناں وصی کو.....'' انسپکٹر مشتاق کی بات سن کر وہ سرجن وصی شاہ کو سمجھانے لگیں

☆======☆======☆

ملوکاں کے تو خوشی کے مارے زمین پر پاؤں ہی نہیں ٹک رہے تھے، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر کبھی اس طرح بھی اچانک مہربان ہونے لگتی ہے..... دل ناصبور کی حسرتیں اس طرح اچانک بھی پوری ہونے لگتی ہیں.....؟

ماما اللہ رکھیو اور چاچا سکھیو کی ملاقات کے دوران سانول اور ملوکاں کی شادی سے متعلق باتیں سکھیو کی بیٹی میراں نے سب سے پہلے سنی تھیں اور بعد میں خوشی سے نہال ہو کر میراں اندر کوٹھری کی طرف یہ خوشخبری ملوکاں کو دینے کے لیے دوڑ پڑی تھی کیونکہ اس وقت صحن میں چاچی بھی موجود تھی، اسی لئے ملوکاں لج کے مارے اندر کوٹھری میں ہی دبکی رہی تھی مگر اس کا دل مسرت سے بے طرح دھڑک کے جا رہا تھا اور پھر جب اس کی چچازاد میراں نے اسے یہ آ کر بتایا کہ اس کی سانول کے ساتھ نسبت طے کر دی گئی ہے تو ملوکاں کا چہرہ شرم اور مسرت سے گلنار ہو گیا۔

ادھر ساتھ والی جھگی میں دونوں لالچی ماں، بیٹے، عجیباں اور خالقو اس رشتے پر اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے کیونکہ وہ دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ملوکاں کے سنگ کا عوضہ (رقم) اب ایک دھیلہ بھی نہیں ملے گا جبکہ آچر خان نے ان دونوں لالچی ماں، بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ملوکاں کی شادی اس سے کر دیں تو وہ اس رشتے کا عوضہ پورے دو لاکھ روپے دے گا چنانچہ اب ان دونوں ماں، بیٹوں کے لیے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ سب تیری جلدی بازی کی وجہ سے ہوا ہے خالقو.....!'' مائی عجیباں نے بیٹے کے لتے لیتے ہوئے کہا۔ ''تیرے کو میں نے سمجھایا بھی تھا کہ ملوکاں ذرا اور ہی دماغ کی چھوکری ہے، زور زبردستی کرے گا تو کماد کی طرح سیدھی اکڑ جائے گی۔''

''تو پھر میں کیا کرتا اماں.....! تُو نے بھی تو ملوکاں کو آرام اور پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تھی پھر کیا ہوا.....؟'' خالقو نے برا سا منہ بنا کر ماں سے کہا تو عجیباں جزبز ہو کر رہ گئی۔

اچانک باہر سے ایک آواز ابھری۔ ''اڑے خالقو.....!'' خالقو اس آواز پر چونکا اور ہڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ تو آچر خان کے ہوٹل کا پیشکار سیدو ہے۔''

''ھاؤ ڑے! میں اندر ہی بیٹھا ہوں آ جا.....'' خالقو نے اندر ہی سے کھری چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

''میرے پاس ٹیم نہیں ہے..... آچر سائیں نے تیرے کو اسی وقت بلایا ہے ہوٹل پہ.....! اچھا میں چلا.....'' سیدو نامی، آچر خان کے ہوٹل کا پیشکار یہ کہہ کر فوراً چلا گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''پتہ نہیں کیوں آچر خان نے مجھے بلایا ہے، ابھی تو مل کے آیا تھا۔'' خالقو بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔

مائی عجیباں نے قدرے تفکر سے پوچھا۔ ''تو اب کیا کرے گا آچر خان سے مل کر... رہنے دے...''

''رہنے کیسے دوں اماں......!'' خالقو دانت پیستے ہوئے غصے سے بولا۔ ''میں چاچو سکھیو کو ملوکاں کے عیوضہ کے پیسے اکیلے نہیں کھانے دوں گا، اسے مجھے بتانا پڑے گا کہ اس نے کتنے پیسے کے بدلے ہماری ملوکاں کا رشتہ طے کیا ہے...... میں پہلے چاچا سکھیو سے ملتا ہوں پھر آچر خان کے ہوٹل جا کر اس سے بات کروں گا...... جھگڑا ہے تو جھگڑا سہی...!''

خالقو یہ کہہ کر جھگی سے باہر نکلا اور ذرا ہی دیر بعد چاچا سکھیو کی جھگی کے صحن میں موجود تھا۔ شکستہ صحن میں ایک کھری چارپائی پر چاچا سکھیو ایک میلے چیکٹ تکیے سے کہنی ٹکائے نیم دراز بیڑی پی رہا تھا۔

''چاچا......! تُو نے ملوکاں کے سنگ کا کتنا عیوضہ (روپیہ) طے کیا ہے؟'' خالقو نے سپاٹ لہجے میں اس سے پوچھا۔ چاچا سکھیو نے بیڑی کا کش لے کر دھواں اگلا پھر سیدھا ہو کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''نہ سلام...... نہ دعا...... کیا روپے نے تیرے کو اتنا اندھا کر ڈالا ہے ڑے چھوکرا......! تجھے تمیز نہیں گھر میں داخل ہونے کی......؟''

''چاچا......! میں تیرے سے فالتو باتیں نہیں کرنے آیا ہوں، مجھے بس تُو یہ بتا کہ تُو نے میری بہن ملوکاں کے سنگ......!''

''اڑے جا ادھر سے...... تُو ہوتا کون ہے مجھ سے یہ پوچھنے والا......؟'' چاچا سکھیو کو بھی بھتیجے کی بدکلامی پر طیش آ گیا، وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بھنا کر بولا۔

''میں ملوکاں کا بھائی ہوں۔'' خالقو آنکھیں نکالتے ہوئے درشتی سے بولا۔

''پر ملوکاں تجھ جیسے لالچی بھائی کو اپنا بھائی نہیں سمجھتی...... وہ اپڑیں مرضی سے یہاں میرے پاس آئی ہے بلکہ اب تو وہ میری پناہ میں ہے۔''

''میں خوب سمجھتا ہوں اس پناہ کو چاچا......!'' خالقو زہرخند لہجے میں طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ملوکاں اپڑیں عاشق سے شادی کرنا چاہتی ہے اور تُو اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے ٹکے کھرے کرنا چاہتا ہے۔''

''خالقو......!'' اچانک چاچا سکھیو اس کی زہر آلود گفتگو پر غضب ناک ہو کر چلایا اور یہی نہیں بلکہ اس نے آگے بڑھ کر خالقو کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ بھی جڑ دیا۔

''نکل جا فوراً یہاں سے ورنہ......؟'' چاچا سکھیو غصے کی شدت سے کانپنے لگا...... اس اثناء میں میراں، ملوکاں اور چاچی بھی پریشان سے وہاں آ گئے...... خالقو چند ثانیے چاچا سکھیو کو زہرخند نظروں سے گھورتا رہا پھر کینہ توز انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتا ہوا پاؤں پٹخ کر باہر آ گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا آچر خان کے ہوٹل پہنچا تو اس کے غصے سے لال، پیلے چہرے کو دیکھ کر آچر خان چونکا اور اسے ہوٹل کے اندر ایک چھوٹے سے الگ تھلگ کچے کمرے میں لے آیا۔

''اڑے خالقو......! خیریت تو ہے......؟'' آچر خان بغور اس کے غصے سے سرخ چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

''آچر خان......! مجھے پستول چاہئے۔'' خالقو پُرطیش لہجے میں دانت بھینچ کر بولا۔

''اڑے کیا اپڑیں بہن ملوکاں کو کاری کرے گا......؟''

''نہیں......! میں ابھی اور اسی وقت چاچا سکھیو کا کام تمام کردوں گا۔'' خالقو نے خوں فشاں لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے انتقام کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

''تجھے تو یہ کام پہلے ہی کر لینا چاہئے تھا جب اس بڈھے نے ملوکاں کا سنگ ماما اللہ رکھیو کے بھانجے سانول سے طے کر دیا تھا۔'' آچر خان نے سرسراتے لہجے میں کہا...... اس کی چندی چندی آنکھوں میں سفا کی ہلکورے لے رہی تھی۔ خالقو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنا غصہ بھلا کر بولا۔

''کیا تجھے پتہ ہے کہ......؟''

''ہاؤ......! تُو مجھے کیا سمجھتا ہے، کیا میں آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوں، اسی لیے تو میں نے سیدو کو تیری طرف پیغام دے کر بھیجا تھا۔'' آچر خان نے اسرار بھری مکاری سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر...... اب کیا کہتا ہے تُو......؟'' خالقو نے عجلت آمیز جارحانہ جوش سے پوچھا۔

''بس اس کا آسان حل یہی ہے کہ اس بڈھے سکھیو کا کام تمام کر دے۔''

''مگر......! پولیس......؟'' پہلی بار خالقو منمنائی آواز میں بمشکل بولا۔

''اڑے یار......! اس کو میں سنبھال لوں گا، دل بڑا کر میں ہوں ناں......! بڈھے کے مرنے کے بعد ملوکاں خود ہی تیری سرپرستی میں آ جائے گی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں اس کی جوان بیٹی میراں بھی تیرے رحم و کرم پر ہو گی پھر تُو بعد میں اس کے بھی ٹکے کھرے کر سکتا ہے، ڑے چھورا......!'' آچر خان نے سرسراتی ہوئی مکارانہ سرگوشی سے کہا اور خالقو کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آنکھوں میں لالچ کی چمک عود کر آئی۔

☆======☆======☆

رات کا سمے جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا، سارنگ کے دل کو عجیب سی بے چینی پریشان کرنے لگی تھی مگر اس بے چینی میں خوف شامل نہ تھا بجز اس کے کہ اس کے اندر منتقمانہ جوش کا ابال سا اٹھ رہا تھا۔ اس نے آج کی رات دو اہم کام نمٹانے تھے، پہلا یہ کہ اس ظالم ہندو ساہوکار رام دیال کے چنگل سے اپنی معصوم اور دکھوں کی ماری بھابی اللہ وسائی کو چھڑانا، دوسرے وہ دغاباز گاتریا ادھر جیوش بابا کی جھونپڑی میں آنے والا تھا۔ سارنگ گاتریا کا خون پینے کے لیے بے چین تھا، وہ اپنے اس ازلی دشمن کو کیسے بھول سکتا تھا، یہی تو وہ دھوکے باز شخص تھا جس کی وجہ سے وہ آج صحرا بہ صحرا کی خاک چھانتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا بلکہ گاتریا تو بھابی اللہ وسائی اور فریدو کا بھی مجرم تھا۔

سارنگ نے فریدو کو جھونپڑی سے ذرا پرے جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپا رکھا تھا۔ سارنگ بظاہر جیوش بابا کی جھونپڑی کے باہر ایک سیوک کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا مگر درحقیقت اس کا دھیان جھونپڑی کے اندر تھا جہاں جیوش بابا معصوم لڑکی رکمنی کے ساتھ تنہا موجود تھا۔ سارنگ نے اگرچہ اپنی طرف سے رکمنی کو جیوش بابا کے خلاف خوب ورغلایا تھا اور اسے طعن و تشنیع بھی کی تھی کہ وہ محض اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے جیوش بابا جیسے شیطان نما انسان کا کھلونا نہ بنے۔ سارنگ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر جیوش بابا نے اس معصوم اور مجبور لڑکی رکمنی کے ساتھ کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یوں تو سارنگ ایک سیوک کی حیثیت سے جیوش بابا کے قریب اندر ہی اس کی جھونپڑی میں رہنا چاہتا تھا مگر جیوش بابا ایک کائیاں شخص تھا، اس نے سارنگ کو سختی سے باہر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت دے رکھی تھی...... سارنگ کو جیوش بابا کی جھونپڑی میں دوسرا دن تھا، یہاں آ کر اس نے اپنا حلیہ بھی خاصا بدل لیا تھا، اسے خطرہ تھا کہ کہیں بارڈر سیکورٹی فورسز کے اہلکار جو یقیناً صحرائی بھیڑیوں کی طرح اس کے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے، کہیں ادھر نہ آ نکلیں۔

شام کے سائے دراز ہونے لگے تو سارنگ نے سوچا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟ یوں تو اسے سب سے پہلے ہندو ساہوکار رام دیال کے ہاں جانا تھا، جدھر اس کی بھابی اللہ وسائی قید تھی اور سارنگ نے ہر حال میں اسے چھڑانا تھا کیونکہ ننھے فریدو کے کہنے کے

مطابق رام دیال اب بھابی اللہ وسائی کو آدھی قیمت میں گاتریا کو واپس لوٹانا چاہتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ وسائی کا چھوٹا گود کا بچہ تھا اور دوسرے وہ بیمار بھی کافی رہنے لگی تھی۔

سارنگ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک اسے پاس ہی کہیں چند لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوزیں سنائی دیں...... وہ چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگا، اپنی داہنی جانب ایک سپاٹ سے ریتیلے ٹیلے کے عقب سے تین چار ہٹے کٹے اور کالے بھجنگ سے بدمعاش نما افراد آتے نظر آئے، ان کے تیور بڑے خطرناک معلوم ہو رہے تھے، سارنگ سنبھل کر بیٹھ گیا...... ان سب کے سر گنجے تھے، ہر ایک کے کان میں بڑا سا بالا جھول رہا تھا، چہروں پر کرختگی نے جیسے مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے، ان چاروں نے کھلے بٹنوں والی واسکٹیں اور گھیر دار نیفے والی گیروے رنگت کی شلواریں پہن رکھی تھیں۔

''ادئے...... کون ہے رے ٹو......؟'' وہ چاروں سارنگ کو دیکھ کر اسے گھورتے ہوئے اس کے قریب آئے تو ایک لحیم شحیم بدمعاش نے کرخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''میں...... مہاراج کا سیوک ہوں۔'' سارنگ خوف زدہ انداز میں بولا۔

''اچھا...... اچھا......! سمجھا، شک تو مجھے ہو گیا تھا کہ ٹو مہاراج بابا کا سیوک ہے...... ایک بات بتا ٹو نے ادھر آس پاس کسی نو، دس سالہ چھوکرے کو تو نہیں دیکھا؟'' اس نے اپنا تربوز جیسا سر ہلاتے ہوئے پوچھا تو سارنگ ایک لمحے کو ڈر سا گیا مگر پھر فوراً بولا۔

''ہاں...... ہاں......! ایک چھوٹے بالکے کو میں نے کسی بوڑھے کے ساتھ سانڈنی پر جاتے دیکھا تھا، وہ بہت ڈرا سہا ہوا نظر آ رہا تھا، پہلے تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے اندر مہاراج کی جھونپڑی میں پناہ دے دوں پر میں نے اسے بری طرح دھتکارا تو وہ یہاں سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے سانڈنی سوار کے ساتھ چلا گیا۔''

''کدھر...... کدھر گیا ہے وہ......؟''

''ادھر...... پورب کی طرف......'' سارنگ نے راجستھانی لہجے میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سنتے ہی وہ چاروں آگے نکل گئے، بدمعاشوں کے جاتے ہی سارنگ نے سکھ کا سانس لیا، وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ غنڈے ساہوکار دیال داس کے تھے جو فریدو کو بھوکے بھیڑیوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ سارنگ نے جب دیکھا کہ دیال داس کے غنڈے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں تو وہاں سے اٹھا اور جلدی سے لپک کر کھجور... جھنڈ کی طرف آیا جدھر فریدو چھپا بیٹھا تھا۔ سارنگ نے اسے جب دیال داس کے...

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بارے میں بتایا تو اس کے معصوم چہرے پر خوف کی پرچھائیں نمودار ہوگئیں مگر سارنگ نے اسے تسلی دیتے ہوئے سختی سے اس بات کی ہدایت کی کہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر چپ بیٹھا رہے۔

سارنگ اب دوطرفہ سوچوں میں الجھ کر رہ گیا تھا، کبھی وہ ارادہ باندھتا کہ پہلے رام دیال کے ہاں جا کر اپنی بھابی اللہ وسائی کو اس کی قید سے چھڑا لائے تو کبھی وہ سوچتا کہ اسے ادھر ہی رہ کر دغاباز گاتریا کا انتظار کرنا چاہئے، اسے اپنا آخری خیال زیادہ مناسب لگا کیونکہ فریدو نے اسے بتایا تھا کہ بھابی اللہ وسائی کو چونکہ رام دیال آج رات گاتریا کو واپس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ سارنگ کے محتاط انداز کے مطابق گاتریا یہاں آنے سے پہلے یقیناً رام دیال کے پاس جائے گا اور پھر بھابی اللہ وسائی کو اپنے قبضے میں لے کر ادھر اپنے اصل گرو گھنٹال جیوش بابا کے پاس آئے گا۔ یہ سوچ کر سارنگ مطمئن ہوگیا۔

اب وہ دوبارہ جھونپڑی کے باہر بیٹھ گیا تھا، آس پاس کا ماحول گہری خاموشی میں غرق تھا، رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی، روشن طباق چاند ناری کے تلک کی طرح گویا صحرا کی پیشانی پر دمک رہا تھا۔ صحرا کے چاند کی اپنی ایک مسحور کن دلکشی ہوتی ہے، نرم اور خنک...... لیکن سارنگ کو اس طلسماتی رات کے دلفریب منظر سے لطف اندوز ہونے کا ذرا برابر بھی ہوش نہ تھا، وہ جس مقصد کے لیے اتنا طویل سفر کر کے یہاں پہنچا تھا، اسے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پورا کرنا تھا...... سارنگ جلد از جلد بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے گرد دیدہ ونادیدہ دشمنوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک سارنگ کی نظر سامنے ایک انسانی ہیولے پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹک گیا، وہ کوئی سانڈنی سوار تھا، جو سانڈنی کو درمیانی رفتار سے دوڑاتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، اسے دیکھ کر سارنگ کو اپنے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں پر سنائی دینے لگیں، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور سانڈنی سوار پر نظریں گاڑ دیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہی مردود گاتریا ہے۔

چند لمحوں بعد سانڈنی سوار جھونپڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا تو اسے پہچان کر سارنگ کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں، وہ گاتریا ہی تھا، اسے دیکھ کر سارنگ کو اپنے طیش پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا تاہم سارنگ کو اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں گاتریا اسے پہچان نہ لے، اگرچہ اس کا امکان کم تھا کیونکہ کچھ نامساعد حالات اور کچھ سارنگ کی اپنی دست مشاقی نے کافی حد تک حلیہ بدل ڈالا تھا۔ سارنگ کے چہرے پر بہت گھنی داڑھی ابھر آئی تھی...... بال بھی جوگیوں

سنیاسیوں کی طرح لمبے اور جٹادار ہو گئے تھے...... مونچھیں، سر اور داڑھی کے بال مشترکہ انداز میں ہی چہرے پر پھیلے ہوئے تھے...... سارنگ کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ گاتریا کے ہمراہ بھابی اللہ وسائی نہ تھی، وہ سوچنے لگا کیا گاتریا ابھی رام دیال کے ہاں نہیں گیا بلکہ سیدھا وہ یہاں چلا آیا تھا؟

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا...... گاتریا آیا سانڈنی کو اس کے قریب لا کر نیچے اتر آیا، دونوں کی سرد اور سپاٹ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر گاتریا نے ہی ابتداء کی اور بغور سارنگ کو گھورتے ہوئے نخوت سے پوچھا۔ ''تو کون ہے......؟ اور یہاں کیا کر رہا ہے۔''

سارنگ نے آن کی آن میں اپنے اندر کے جوالامکھی پر قابو پایا اور یکدم مکارانہ عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں...... میں...... مہاراج جیوش بابا کا سیوک ہوں...... چالیس دن ان کے چرنوں میں چلہ کشی کرنے کے لیے ادھر آیا ہوں۔''

''اچھا......! میری سانڈنی کا خیال رکھنا۔'' گاتریا، سارنگ کے انداز تخاطب پر مطمئن ہو کر بولا اور پھر جھونپڑی کے اندر داخل ہوگیا...... سارنگ چند ثانیے اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ دبے پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھا اور اندر کی سن گن لینے لگا۔

''رام دیال کا مغز خراب ہوگیا ہے جو آدھی قیمت میں اس عورت کو واپس کر رہا ہے، تُو نے اچھا کیا گاتریا......! جو اس کے ہاں جانے کی بجائے سیدھا ادھر آ گیا۔'' یہ جیوش بابا کی آواز تھی۔

''سو تو ٹھیک ہے پر مہاراج......! یہ سندر ناری کون ہے......؟'' یہ گاتریا تھا...... سارنگ بغور ان کی باتیں سن رہا تھا...... وہ گاتریا کا اشارہ سمجھ گیا تھا، یقیناً اس نے جیوش بابا کے ساتھ موجود رکمنی کو دیکھ لیا تھا۔

''ہاں رے یہ ہے تو بڑی زبردست چیز...... پر ہے ذرا تیکھی......'' جیوش بابا نے کہا۔

''تو کیا ہوا...... میں جو آ گیا ہوں...... بول کتنے چاہئیں؟'' یہ گاتریا تھا۔

سارنگ کو اچانک احساس ہوا کہ رکمنی اندر موجود نہ تھی یا پھر سو رہی تھی ورنہ وہ ان دونوں شیطانوں کے عزائم جان کر ضرور چیختی چلاتی۔ یہ دیکھنے کے لیے سارنگ نے تیلی سی جھری بنا کر اس سے اپنی آنکھ چپکا دی...... (اندر واقعی اسے رکمنی فرش پر بے سدھ پڑی نظر آ رہی تھی، سارنگ کو فوراً شبہ ہوا کہ وہ سو نہیں رہی تھی بلکہ بے ہوش تھی یا بے ہوش کر دی گئی تھی۔

''مجھے امید تھی مہاراج کہ تم نے میرے لیے ضرور کوئی تازہ شکار پھانس رکھا ہوگا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی لئے میں نے روپے بچار کھے تھے اور رام دیال کی طرف نہیں گیا تھا ورنہ وہ باقی مال آدھی قیمت میں مجھے واپس کر دیتا۔'' گاتریا نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور اپنی قمیض کے اندر سے ایک بندھا ہوا رومال نکال کر جیوش بابا کی طرف بڑھایا۔

''گن لو، اتنے ہی ہیں جتنے میں دیتا آرہا ہوں...... بے فکر رہو۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے تو اب اسے فوراً لے جا، میں نے اسے جڑ سنگھی سنگھا دی ہے، یہ اب چار پانچ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔'' جیوش بابا نے نوٹوں کا رومال جھپٹتے ہوئے کہا اور گاتریا نے فوراً بے سدھ رکمنی کو اٹھا کر کاندھوں پر ڈال لیا۔

سارنگ کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی...... گاتریا کے لیے اس کے دل و دماغ میں جو نفرت کا طوفان چھپا ہوا تھا، وہ اب آتش فشاں کی مانند ابل پڑنے کو تھا...... سارنگ، معصوم رکمنی کو بہر صورت گاتریا کے خونی شکنجے سے بچانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ رذیل انسان معصوم رکمنی کو بھی بھابی اللہ دسائی کی طرح کہیں اونچے دام بیچ دے گا۔

سارنگ اب گاتریا کے جھونپڑی سے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

☆======☆======☆

آچر خان کی سفاکانہ ترغیب پر خالقو نے عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے چاچا سکھیو کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس ''کام'' کے لیے آچر خان نے اسے ایک پستول بھی مہیا کر دیا تھا، اس کے اندر تین گولیاں تھیں...... خالقو نے پستول اپنی قمیض کے اندر نیفے میں اڑس لیا تھا۔

''زن، زر اور زمین'' کی ہوس جب انسان کے سر پر سوار ہونے لگتی ہے تو وہ اپنے پرائے اور سگے رشتوں کو بے معنی محسوس کرنے لگتا ہے، یہی حال خالقو کا تھا، وہ لالچ میں اس قدر اندھا ہو چکا تھا کہ بلا جھجک اپنے سگے چچا سکھیو کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو خالقو نے اجرک کا ڈھاٹا اپنے چہرے پر سرکا لیا اور سکھیو چاچا کی گھات میں بیٹھ گیا...... اچانک اسے سکھیو چاچا آتا ہوا دکھائی دیا، خالقو اسی موقع کا منتظر تھا...... آس پاس ویرانی تھی، چاچا سکھیو اپنی جھگی سے ابھی تھوڑے ہی فاصلے پر تھا کہ خالقو نے اچانک اس کے قریب آکر یکے بعد دیگرے اس پر تین فائر جھونک مارے...... تینوں گولیاں بوڑھے چاچا سکھیو کے سینے میں پیوست ہوگئیں اور بے چارہ آواز نکالے بغیر زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

چاچا سکھیو کے سینے پر تین گولیاں اتارنے کے بعد خالقو پستول اپنی قمیض کے اندر نیفے میں اڑسے جھگی کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے اس کی ماں عجیباں سینے پر ہاتھ دھرے ذہن زدہ سے انداز میں کھڑی تھی۔ اس نے پھیلی ہوئی نظروں سے بیٹے کا چہرہ دیکھا تو وہاں اسے وحشت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ دونوں ماں بیٹے کی نظریں چار ہوئیں اور مائی عجیباں نے بیٹے کی سرد آنکھوں میں سفاکی کی جھلک محسوس کرتے ہوئے اٹک اٹک کر پوچھا۔ ''خ...... خالقو...... فائرنگ کی آواز۔''

''میں نے چاچا سکھیو کو قتل کر ڈالا ہے۔'' خالقو نے سفاک لہجے میں کہا تو مائی عجیباں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ادھر جھگی کے عین سامنے گولیوں کی سمع خراش آوازوں کے ساتھ چاچا سکھیو کی چیخ نے اندر موجود میراں، ملوکاں اور چاچا سکھیو کی بیوی کو ہراساں کر دیا۔ جھگی کے باہر آئے تو تینوں کے حلق سے دہشت کے مارے چیخیں نکل گئیں۔ تینوں خون میں لت پت چاچا سکھیو سے لپٹ گئیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اچانک ملوکاں کو احساس ہوا کہ چاچا سکھیو ابھی زندہ ہے۔ اس کے بوڑھے لب کپکپا رہے تھے۔ اس نے فوراً اپنا کان اس کے لبوں کے قریب کیا تو اسے چاچا سکھیو کی ڈوبتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''خ...... خ...... ن...... نے......'' اس سے آگے چاچا سکھیو کچھ نہ کہہ سکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، مگر ملوکاں چاچا سکھیو کے ادھورے لفظوں کا مطلب سمجھ چکی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے لالچی اور خود غرض بھائی خالقو کا چہرہ رقص کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت پاس کی جھگی سے مائی عجیباں اور خالقو بھی اپنے چہروں پہ غم و اندوہ کے تاثرات لئے نمودار ہوئے اور پھر وہیں چاچا سکھیو کی لاش کے پاس ہی بیٹھ کر دونوں ماں بیٹا بین کرنے لگے۔ ملوکاں نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ ایک لمحہ کو دونوں مکار ماں بیٹے کی طرف دیکھا پھر جیسے اگلے ہی لمحے اس پر ہسٹریائی دورہ پڑ گیا۔ جنگلی بلی کی طرح اپنے بھائی خالقو پر جھپٹی اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''ذلیل...... قاتل...... تو نے میرے چاچا کا خون کر دیا، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور لہجہ آتش فشاں ہو رہا تھا۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ بے چاری صدمے سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔

☆======☆======☆

وڈیرے میر منصب خان سے ملاقات کے بعد پرویز اور سدھوراں مطمئن ہو گئے۔ سب سے زیادہ خوش اور مطمئن سدھوراں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب بدفطرت جہاں داد

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں دوبارہ تنگ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ یہ دونوں اپنے گھر پہنچے تو پرویز اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا اور سدھوراں گھریلو امور میں مصروف ہوگئی۔

اس وقت دوپہر کے ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ سدھوراں گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد نہا دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ پرویز سے اس نے آج جلد گھر آنے کا وعدہ لیا تھا۔ جہاں دادوالے مسئلے سے نجات ملنے کی خوشی میں سدھوراں کا آج پہلی بار جی باہر گھومنے کو چاہا تھا۔ اب سدھوراں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑا آرام کرنے کے لیے اپنے گھر میں آکر مسہری پر دراز ہوگئی۔

اچانک اس کے پیٹ میں درد اٹھنے لگا۔ اس درد نے اسے بے حال کرکے رکھ دیا تھا۔ پرویز نے اس کی ضرورت کے پیشِ نظر گھر میں ایک کارڈلیس فون سیٹ لگوا رکھا تھا۔ سدھوراں پہلے تو ہونٹ بھینچے تکالیف برداشت کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر پھر جب اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگا تو مجبوراً وہ گرتی پڑتی فون سیٹ کی طرف گئی اور اس کا اسپیکر آن کرکے پرویز سے رابطہ کیا۔ پرویز اس کے اذیت میں ڈوبے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو فوراً سمجھ گیا اور اسی وقت ٹیکسی لے کر گھر پہنچا پھر اسی ٹیکسی میں سدھوراں کو ہسپتال لے گیا۔

گھنٹے بھر کے معائنے کے بعد سدھوراں کو لیڈی ڈاکٹر نے دواؤں کے نسخے اور چند ضروری ہدایات دے کر گھر روانہ کردیا۔ پرویز نے اسی وقت دوائیں خریدیں اور سدھوراں کو واپس گھر لے آیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے سدھوراں کو آرام کرنے کا بھی مشورہ دیا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ بالکل چارپائی ہی پکڑ لے۔ دراصل اسے بھاری چیزوں کو اٹھانے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر تھا۔ آج سدھوراں کی طبیعت خاصی بہتر ہوگئی تھی۔ حسبِ معمول سدھوراں کھانے وغیرہ سے فارغ ہوکر کچھ دیر کو آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔ لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ جانے وہ کتنی دیر سوئی تھی کہ اچانک وہ جاگی تو کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت جلدی میں ہو...... دروازے کی پُرشور دھڑ دھڑاہٹ سے جانے کیوں اس کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تاہم وہ اٹھی اور کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی۔ پھر دروازے کے قریب آکر اس نے آواز دی۔

''کون ہے؟''

''سدھوراں...... دروازہ کھولا!'' یہ پرویز کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی۔ جسے پہچان کر سدھوراں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ پرویز حواس باختہ ہوکر اندر آیا۔ اس کے چہرے

ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور تیر کی طرح اندر کمرے کی طرف دوڑا۔ سدھوراں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ پرویز نے اپنے کمرے میں آکر ایک الماری کھولی اور جلدی جلدی اندر سے پیسے اور کچھ ضروری کاغذات سمیٹنے لگا۔

سدھوراں نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''سدھوراں میں...... جا رہا ہوں...... پولیس میرے پیچھے ہے......'' پرویز نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تو سدھوراں دھک سے رہ گئی اور اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''پپ...... پولیس......''

''ہاں...... اس کمینے دلدار حسین کی کارستانی ہے یہ...... خیر میں دیکھ لوں گا اسے بھی، تم بالکل حوصلہ مت ہارنا...... میں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کروانے کی کوشش کروں گا...... تم اگر ڈاکٹر فوزیہ کے ہاں چند دن رہنا چاہو تو چلی جانا......'' پرویز نے جلدی جلدی کہا اور باہر کو لپکا۔ سدھوراں متوحش سی اس کے پیچھے دوڑی آئی۔

''مم...... مگر...... پرویز......''

''سدھوراں......! میرے پاس وقت کم ہے...... تو میری فکر نہ کر میں جلدی لوٹ آؤں گا۔'' پرویز اسے تسلی دے کر فوراً گھر سے نکل گیا۔

پرویز کے گھر سے نکلتے ہی سدھوراں بری طرح سسک پڑی۔ اس اچانک افتاد پر وہ پریشان ہی نہیں بلکہ انجانے خوف کا بھی شکار ہوگئی تھی۔ وہ اب پرویز کے بغیر خود کو تنہا محسوس کررہی تھی۔

پرویز کو گئے نصف گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ اچانک باہر پولیس کی گاڑیاں آکر رکیں۔ ایک موٹا سا پولیس انسپکٹر موبائل سے اترا اور سدھوراں کے گھر کا دروازہ ڈنڈے سے بجایا اور اس وقت تک بجاتا چلا گیا جب تک سدھوراں نے دروازہ نہیں کھول دیا۔ سدھوراں پولیس کو دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئی۔ پولیس انسپکٹر بڑی معنی خیز نظروں سے ڈری سہمی سدھوراں کو گھورے جا رہا تھا۔ یہ وہی انسپکٹر یاور حیات تھا جسے دلدار حسین نے پرویز کو رشوت کے طور پر اپنی بیوی سدھوراں کو اس کے حوالے کرنے کے لیے اکسایا تھا...... مگر پرویز نے دلدار حسین کو کھری کھری سنا کر چلتا کردیا تھا تب دلدار حسین نے بدلہ لینے کے لیے پرویز کے ہوٹل کے خفیہ اڈے میں چھاپہ لگوا دیا تھا۔ اب انسپکٹر یاور حیات سامنے کھڑی ڈری سہمی سدھوراں کو گھورے جا رہا تھا لیکن بھلا ہو محلے والوں کا...... وہ سب وہاں جمع ہوگئے تھے۔ انسپکٹر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یاور حیات کو زیادہ گل کھلانے کا موقع نہ مل سکا تھا اور وہ سدھوراں سے روایتی قسم کے سوالات پوچھنے کے بعد واپس چلا گیا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ کا آج ارادہ سدھوراں کے ہاں جانے کا تھا، اس کے لیے اس نے موسی کو تیار کرلیا تھا۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ وہ پہلوان دودھ والے کی بیوی کو بھی ہمراہ لے چلے مگر پھر بعد میں اس نے اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی وہ موسی کے ساتھ نکلنے ہی لگی تھی کہ اچانک ڈاکٹر جواد احمد کا فون آ گیا اور اس نے پرشوخ لہجے میں ''ہیلو'' کہتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ کے کانوں میں کوئی پیغام دیا تو اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا پھر اس کے حنائی لبوں پر بڑی دلنشیں سی مسکراہٹ ابھری۔ ''اچھا جناب......! بے صبری ہو رہی ہے......ابھی تو ایف آر سی ایس کرنا ہے۔''

''یہ تو شادی کے بعد بھی ہوتا رہے گا بلکہ فوزیہ کتنا اچھا لگے گا جب ہم ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن کر ایف آر سی ایس کے لیے لندن جا رہے ہوں گے۔'' ڈاکٹر جواد نے چہکتی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں خوش آئند مستقبل کی تابندہ امید پنہاں تھی۔

''لو جی شادی کے فوراً بعد کیا پڑھائی میں سر کھپائی کریں گے؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تو ڈاکٹر جواد کی جھنجلاتی ہوئی آواز ابھری۔

''دھت تیرے کی......! یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا...... چلو جی پہلے شادی تو کر لیں، باقی پڑھائی کے لیے تو پوری عمر پڑی ہے، بہر حال میرے بزرگ آج تمہارے ہاں آئیں گے اور تم کو دونوں طرف کے بزرگوں کی گفتگو پر کان دھرے رہنا ہو گا بلکہ مجھے پل پل کی خبر بذریعہ فون دینا ہو گی۔''

''جی جناب......! یہ جاسوسی والے کام مابدولت سے نہیں ہوں گے کیونکہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر مزید چند منٹوں کی پرشوخ اور ذومعنی گفتگو کے تبادلے کے بعد خدا حافظ پر موقوف ہوئی تو اس کے بعد فوزیہ نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ صبح کے دس بجے تھے، آج چھٹی کا دن تھا اور مہمانوں کی آمد شام پانچ بجے کے بعد ہی متوقع تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے موسی کو لیا اور اپنی کار میں سوار ہو کر سدھوراں کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد اس کی کار عین سدھوراں کے گھر کے دروازے پر رک گئی

ڈاکٹر فوزیہ کار سے اتری، دروازے پر جھولتے ٹاٹ کو پرے سرکا کر جب اس نے دستک دینی چاہی تو دروازے کے دونوں پٹ اسے بھڑے ہوئے دکھائی دیئے تاہم پھر بھی ڈاکٹر فوزیہ نے دروازے پر دستک دی مگر جواباً اندر خاموشی چھائی رہی...... فوزیہ کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں تب وہ دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی، سامنے صحن ویران پڑا تھا، موسی بھی اندر آ گئی۔ فوزیہ متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھنے لگی پھر اس نے دو تین مرتبہ سدھوراں کو پکارا مگر جواب ندارد...... اب تو فوزیہ کا ماتھا ٹھنکا اور اسے تشویش ہونے لگی کہ آخر سدھوراں کدھر گئی...... اس نے سارے کمرے دیکھ ڈالے تھے۔ دروازہ بھی کھلا پڑا تھا۔ پرویز کے معمولات کے بارے میں تو فوزیہ یہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت اپنے ہوٹل پر ہو گا مگر سدھوراں کو گھر میں ہی موجود ہونا چاہئے تھا پھر اس خیال کے تحت کہ کہیں سدھوراں پڑوس میں کسی کے ہاں نہ گئی ہو، اس نے موسی کو پاس پڑوس کے چند گھروں میں سدھوراں کو ڈھونڈنے کے لیے بھیج دیا۔

پھر جب موسی نے آ کر اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے اطلاع دی کہ سدھوراں پڑوس میں بھی نہیں ہے تو ڈاکٹر فوزیہ کو تشویش لاحق ہونے لگی...... پورا گھر خالی تھا، بھائیں بھائیں کرتے کمرے، سائیں سائیں کرتا صحن......

پھر اسی دوران محلے کی دیگر عورتیں بھی آ کر وہاں جمع ہو گئیں یوں یہ بات آگ کی طرح پورے محلے میں پھیل گئی کہ سدھوراں پراسرار طور پر غائب ہو چکی ہے۔

☆======☆======☆

مردود اور دغا باز گاتریا کو جھونپڑی سے باہر آتا دیکھ کر سارنگ فوراً دور ذرا کھجوروں کے جھنڈ میں جا دبکا اور منحوس گاتریا کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا...... رات اپنے جوبن پر تھی، چاند تاروں کی طلسماتی روشنی میں سارنگ نے جیوش بابا کی جھونپڑی کی طرف دیکھا جہاں سے گاتریا باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا، اس کے کاندھے پر ایک نسوانی وجود پڑا ہوا تھا، یہ رکمنی تھی بے ہوش......! سارنگ نے غصے سے دانت بھینچ لئے، وہ سمجھ گیا کہ اب یہ منحوس بھالی ہمسائی کی طرف اس معصوم رکمنی کا بھی یہی حشر کرے گا...... گاتریا نے باہر آ کر دائیں بائیں دیکھا شاید وہ جیوش بابا کے سیوک کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ سیوک اس کی موت بن کر ذرا فاصلے پر گھات لگائے بیٹھا ہے، بہر طور گاتریا نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور اپنی سانڈنی کی طرف بڑھا، پہلے بے ہوش رکمنی کو اس پر لادا بعد

میں خود بھی سوار ہو گیا پھر اس کی رسی تھامتے ہوئے اسے ٹٹکارا...... رات کے پُر ہیبت سناٹے میں سانڈنی آگے بڑھنے لگی...... سارنگ کا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا، گاتریا کو دیکھ کر جیسے اس کے سینے میں آتش انتقام یکدم شعلہ فشاں ہونے لگی تھی، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

سانڈنی اب کھجوروں کے جھنڈ کے بالکل نزدیک آ چکی تھی پھر وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی جیسے ہی سانڈنی قریب آئی، سارنگ اپنی جگہ سے شکاری بھیڑیے کی طرح نکلا اور گاتریا پر چھلانگ لگا دی، دونوں ریت پر آ گرے، سانڈنی ایک طرف کو کھڑی ہو گئی...... رکمنی کا بے سدھ وجود ہنوز اس کی چوڑی پشت پر لدا ہوا تھا۔ گاتریا بھی کم طاقتور نہ تھا، وہ ریت پر گرتے ہی سانڈ کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا، اب سارنگ اور گاتریا آمنے سامنے ایک دوسرے کو خوں فشاں نظروں سے گھور رہے تھے...... گاتریا، سارنگ کو نہیں پہچان پایا تھا مگر وہ اسے جیوش بابا کے سیوک کے طور پر ضرور پہچانتا تھا۔

"تیری یہ ہمت......؟ تُو نے...... تُو نے مجھ پر......!" گاتریا کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ اگلے ہی لمحے سارنگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چیتے کی طرح اس پر جھپٹا...... گاتریا، سارنگ کے مقابلے میں بہت منحنی سا تھا مگر قد کا لمبا تھا...... وہ دھڑ سے ریت پر گرا اور سارنگ اس کے سینے پر سوار ہوتے ہوئے غرا کر بولا۔

"مجھے پہچان مردود دغا باز گاتریا......! میں وہی ہوں جس کی بھابی اور اس کے معصوم بچے کو تُو دھوکے سے صحرائے تھر سے یہاں لے آیا تھا اور جانے اب تک تُو کتنے انسانوں کو بے گھر کر چکا ہوگا۔"

سارنگ کی بات سن کر ایک لمحے کو گاتریا ششدر رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے مگر پھر دوسرے ہی لمحے جان بچانے کی لگن خوف پر غالب آ گئی اور وہ کسی صحرائی لومڑی کی طرح سارنگ کے نیچے سے تڑپ کر نکلا اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس نے اپنی شلوکا نما قمیض کے اندر سے تیز چمکدار قرولی نکالی مگر سارنگ اس بے رحم ہتھیار سے ذرا بھی خائف نہ ہوا تھا لیکن وہ محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ گاتریا نے اپنے حلق سے وحشیانہ چیخ نکالی اور قرولی ہاتھ میں تولے سارنگ پر جھپٹا...... جیسے ہی گاتریا اس پر جھپٹا سارنگ بہ سرعت ایک طرف ہٹ گیا اور اس نے ذرا جھک کر گاتریا کے قرولی والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور اب اسے مروڑنے لگا...... سارنگ کو اب صحیح معنوں میں مردود گاتریا کی طاقت کا اندازہ ہوا...... وہ منحنی جسم ضرور تھا مگر کمزور بہر حال نہیں تھا، گاتریا نے زور کا گھونسا سارنگ کے پیٹ میں جڑ دیا، سارنگ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔

گاتریا نے سارنگ کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے دھکا دیا...... بدقسمتی سے سارنگ کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ پشت کے بل ریت پر جا گرا اور یہی گاتریا چاہتا تھا...... سارنگ کو چاروں شانے چت گرتے دیکھ کر وہ اپنے دائیں ہاتھ میں قرولی تولتا ہوا سیدھا سارنگ کے اوپر آ رہا تھا سارنگ موت کا خطرہ بھانپتے ہی یکدم ایک طرف کو لوٹ لگا چکا تھا، گاتریا دھپ سے ریت پر گرا تو سارنگ تڑپ کر پھرتی سے اٹھا اور گاتریا کے اوپر جا پڑا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے...... گاتریا کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح تیز دھار قرولی سارنگ کے وجود میں پیوست کر کے اسے گھائل کر دے مگر سارنگ نے اسے موقع نہیں دیا تھا، اس نے گاتریا کا قرولی والا ہاتھ دبوچ رکھا تھا۔

اچانک ایک موقع پر سارنگ نیچے آ گیا اور گاتریا پھر اس کے سینے پر سوار ہو گیا، اب گاتریا اپنے وجود کی پوری طاقت سے قرولی کو سارنگ کے سینے میں گھونپنے کی کوشش کر رہا تھا، سارنگ نے اللہ کا نام لیا اور اپنے جسم کی پوری قوت اپنے ایک بازو میں مجتمع کرتے ہوئے گاتریا کے قرولی والے ہاتھ کو سینے سے پرے کر دیا اور پھر ایک بھرپور گھونسا گاتریا کے چہرے پر جڑ دیا، گاتریا کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی اور یہی وہ موقع تھا جب سارنگ نے لیٹے لیٹے گاتریا کے ہاتھ سے قرولی جھپٹ لی پھر ایک لات سے گاتریا کو پرے اچھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "گاتریا......! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" سارنگ قرولی کو اپنے دائیں ہاتھ میں تولتے ہوئے قہر آلود لہجے میں غرایا۔ گاتریا نے اچانک قریب کھڑی سانڈنی کی طرف دوڑ لگائی مگر سارنگ اب اس زندہ چھوڑنے والا کہاں تھا، اس نے وہیں سے زقند بھری اور فرار ہوتے ہوئے گاتریا کی پشت میں تیز دھار قرولی اتار دی۔ رات کے دم بخود سناٹے میں گاتریا کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی ہولناک تھی...... سارنگ پر جیسے جنون سوار تھا، اس نے قرولی اس کی کمر سے کھینچ کر دوبارہ گھونپ دی، اس بار گاتریا تیورا کر ریت پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا اسی لمحے سارنگ سانڈنی کی طرف متوجہ ہوا، جس کی کمر پر بے ہوش رکمنی لدی ہوئی تھی...... سارنگ اپنے بدترین دشمن گاتریا کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اب خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا، اس نے سب سے پہلے رکمنی کے بے ہوش وجود کو فریدو کے پاس پہنچایا جو قریب ہی ڈھینگروں اور جھنگروں میں دو دن سے سارنگ کی ہدایت کے مطابق چھپا بیٹھا تھا...... سارنگ نے رکمنی کو وہاں چھوڑا، فریدو کو گاتریا کے مرنے کی خوشخبری سنائی جسے سن کر فریدو بہت خوش ہوا کیونکہ یہ منحوس گاتریا ہی تھا جس کی وجہ سے یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوگ خجل خوار ہوتے ہوئے کہاں سے کہاں آ گئے تھے، اب صرف بھاگی اللہ وسائی اور اس کے بچے کو رام دیال کی قید سے رہائی دلانا تھی لہٰذا سارنگ نے فریدو کو ہوشیار بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور پلٹا پھر سب سے پہلے اس نے گاتریا کی لاش کو دور ویرانے میں پھینک دیا تاکہ گدھ اور دوسرے صحرائی جانور اس کی لاش کو چٹ کر جائیں...... سارنگ اب راتوں رات ہی یہ سارے کام نمٹا دینا چاہتا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ قسمت بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی...... سارنگ نے خون آلود قرولی کو اپنی قمیض کے اندر چھپالیا اور سانڈنی پر سوار ہو کر آبادی کی طرف روانہ ہوا، وہ اب رام دیال کی حویلی پہنچ کر ایک آخری فرض نمٹانا چاہتا تھا یعنی بھاگی اللہ وسائی اور اس کے ننھے بچے منٹھار کو رام دیال کی قید سے آزادی دلانا۔ اس کے بعد سارنگ کا ارادہ ان کو سب کو لے کر اپنے دیس، اپنی دھرتی صحرائے تھر کی طرف کوچ کر جانا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سارنگ آبادی میں داخل ہو چکا تھا، ماحول پر مہیب سناٹا طاری تھا، کچی، پکی گلیاں ویران تھیں، فریدو نے سارنگ کو پہلے ہی سے رام دیال کا حویلی نما مکان دکھا رکھا تھا لہٰذا سارنگ کو رام دیال کا مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

رام دیال کا یہ حویلی نما بڑا سا مکان گلی کے آخری سرے پر اور ذرا الگ تھلگ واقع تھا، سارنگ سانڈنی کو مکان کے قریب لے آیا پھر اس کی پشت سے اتر کر مکان کے محل وقوع کا جائزہ لینے لگا، مکان زیادہ وسیع اراضی پر پھیلا ہوا نہیں تھا البتہ دو منزلہ تھا، سارنگ نے باریک بینی سے مکان کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ مکان کی چہار دیواری جو غالباً احاطے کے طور پر مستعمل تھی، زیادہ اونچی نہیں تھی پس سارنگ نے فوراً حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا اور سانڈنی کی پشت کو پیار سے تھپک کر اسے وہیں موجود رہنے کا اشارہ کیا اور مکان کے عقب میں آ گیا...... یہاں اسے دیوار ذرا سلیبن زدہ محسوس ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ دیوار کے عین اوپر بلندی پر پانی کی ٹنکی تھی اور پائپ لائنیں اوپر سے نیچے آ رہی تھیں، سارنگ نے فوراً پائپوں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا اور جلد ہی وہ احاطہ نما چہار دیواری پھاند کر اندر کود گیا، اندر مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی، چہار سو ویرانی کا راج تھا، سارنگ اندر کودنے کے بعد چند ثانیے صحرائی بلے کی طرح دم سادھے دبکا رہا پھر جب کوئی مشکوک آہٹ نہ ابھری تو وہ اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ گربہ قدمی سے آگے بڑھنا شروع ہوا، وہ ایک کمرے کی دیوار کے عقب سے گزر رہا تھا، اچانک سارنگ کو اس کمرے کی عقبی دیوار میں بنے روشندان سے روشنی چھوٹتی ہوئی نظر آئی، رات کے اس پہر

کمرے کے اندر روشنی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ کوئی اندر جاگ رہا تھا...... سارنگ اگرچہ کسی خیال کے تحت تھوڑا سا ٹھٹکا ضرور تھا مگر اس نے اپنی گربہ پیش قدمی ترک نہیں کی تھی، وہ بدستور آگے بڑھ رہا تھا اور پھر جیسے ہی وہ روشن دان کے نیچے سے دبے پاؤں گزرنے لگا تو اچانک اس کی ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی...... سارنگ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے، اس نے کھڑے کھڑے سر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھا، وہ اس کے سر سے زیادہ اونچا نہ تھا، سارنگ خاموشی سے مگر بغور کھڑا رونے کی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا، اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ آواز غیر مانوس نہ تھی، پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا وہ بدنصیب بھاگی اللہ وسائی کا تھا پھر دوسرے ہی لمحے سارنگ کو ایک ننھے معصوم بچے کے بھی رونے کی آواز سنائی دی تو یکدم اس کا دل دکھ سے بھر گیا، اس کا دل صاف گواہی دے رہا تھا کہ اندر وہ دونوں بدنصیب موجود تھے۔

☆======☆======☆

چاچا سکھیو کے بہیمانہ قتل کے بعد ملوکاں، میراں اور بیوہ چاچی کے دلوں میں گہرے غم و اندوہ کے ساتھ ایک انجانے قسم کے خوف نے بھی گھر کر لیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ چاچا سکھیو کی طبعی موت نہیں ہوئی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا اور قاتل ہونے کا شک سیدھا خالقو پر جا رہا تھا بلکہ اب تو یہ شک اس وقت یقین میں بدل چکا تھا جب ملوکاں نے غم، اندوہ کا طوفان تھمنے کے بعد چاچی اور میراں کو یہ بتایا کہ مرتے وقت چونکہ ملوکاں، چاچا سکھیو کے قریب تھی اس نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں بمشکل یہ بتایا تھا کہ اسے قتل کرنے والا اور کوئی نہیں خالقو ہے۔ ویسے بھی اگر چاچا سکھیو مرتے وقت یہ نہ بھی بتاتا تو بھی حالات اور قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس بدنصیب بوڑھے کو قتل کرنے کا جرم خالقو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔

ملوکاں یوں تو اس اچانک غم زدہ حالات یا ناگہانی افتاد پر ایک لمحے کو گم صم ہو گئی تھی لیکن پھر جب سکھیو چاچا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تو اس کی جلتی سلگتی آنکھوں میں اپنے بے غیرت اور خودغرض بھائی خالقو کا مکروہ چہرہ رقص کرنے لگتا تھا تب ملوکاں کے اندر باغیانہ خیالات نے پوری شد و مد کے ساتھ سر اٹھانا شروع کر دیا، وہ جان گئی تھی کہ اسے کمزور اور بے سہارا کیا جا رہا تھا تاکہ اسے بآسانی اپنے مفادات کی سولی پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چڑھایا جاسکے...... وہ خوب جانتی تھی کہ پہلے اس کے باپ کو ذہنی مرض میں مبتلا کر کے اس کا نفسیاتی قتل کیا گیا اور اب چاچا سکھیو کو بھی قتل کر ڈالا، ملوکاں یہ بھی خوب جانتی تھی کہ خالقو یہ سب آچر خان کی ملی بھگت سے کرتا آرہا تھا، ان شوریدہ خیالات نے ملوکاں کے اندر آگ سی بھر دی۔ سانول اور ماما اللہ رکھیو کو بھی چاچا سکھیو کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی...... ملوکاں نے پھر گوٹھ والوں کے مشورے کے مطابق تھانے میں اس بہیمانہ قتل کی رپورٹ درج کروانے کی ٹھانی تو اس کی ماں عجیباں مائی اور بھائی خالقو پریشان نظر آنے لگے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ملوکاں تھانے میں خالقو کا نام نہ لے دے اور اس وقت خالقو مزید پریشان ہو گیا جب ملوکاں گوٹھ کے دیگر معتبر لوگوں کے ساتھ تھانے جانے لگی تو اس نے جاتے جاتے خالقو کو شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

''پپ...... پٹ...... خالقو...... ! تت...... تُو بھاگ جا، مجھے تو لگتا ہے کہیں ملوکاں پولیس میں تیرے خلاف پرچہ نہ کٹوا دے۔'' ملوکاں اور دیگر لوگوں کے تھانے روانہ ہوتے ہی جب دونوں ماں، بیٹا اپنی جھگی میں داخل ہوئے تو مائی عجیباں نے تشویش زدہ لہجے میں خالقو سے کہا۔

''ٹھیک ہے امڑ...... ! میں ابھی سیدھا آچر خان کے ہوٹل جاتا ہوں، اب میرے لیے وہی کچھ کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سیدھا آچر خان کے ہوٹل پہنچا۔

''کیوں ڑے تُو بڑا پریشان نظر آرہا ہے، بھلا اب پریشانی کیسی......؟'' آچر خان نے اسے دیکھتے ہی معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

وہ دونوں حسب معمول ہوٹل کے اندرونی الگ تھلگ گوشے میں کھجور کی چٹائی پر بیٹھے تھے...... آچر خان کی مٹھی میں بیڑی دبی ہوئی تھی، ایک اس نے خالقو کو بھی خود ہی سلگا کر دی۔

''باؤ یار آچر سائیں...... ! پریشانی کی بات تو ہے اسی لئے تو میں تیرے پاس دوڑا چلا آیا۔'' خالقو نے بیڑی کا طویل کش لے کر کہا اور پھر اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے مزید بولا۔'' پتہ نہیں آچر سائیں...... ! اس بڈھے سکھیو کی مرتے وقت کیسے مجھ پر نظر پڑ گئی تھی...... تین گولیاں کھا کر بھی اس کے لاغر جسم میں جان باقی تھی...... جب ملوکاں اسے سنبھالنے جھگی سے باہر آئی تو بڈھے نے مرتے مرتے ملوکاں کے کان میں میرے نام کی سرگوشی کر ڈالی تھی، اب ملوکاں گوٹھ کے چند معتبروں کے ساتھ تھانے میں قاتل کے خلاف پرچہ کٹوانے گئی ہے۔''

''اور تجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ملوکاں تیرے خلاف قتل کا پرچہ نہ کٹوا دے۔'' آچر خان ہنسی بجائے مٹھی میں دبی ہوئی بیڑی کی راکھ جھاڑتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو خالقو نے بونقوں کی طرح اپنا سر ہلا دیا۔

''اڑے بابا چھوکرا...... ! تُو نے مجھے کیا ایسے ہی سمجھ رکھا ہے، میرا یہ جو ہوٹل ہے ناں ادھر ہر قسم کا آدمی آتا ہے، یہ تھانے کا انچارج بھی اپڑاں یار ہے، پر تیرا جھگی سے غائب رہنا درست نہیں ہے، اس طرح لوگوں کو اور شک ہوگا تو ابھی واپس چلا جا اور ملوکاں کے تھانے سے لوٹنے کا انتظار کر۔'' چند لمحے کے توقف کے بعد آچر کچھ سوچتے ہوئے پھر بولا۔'' بلکہ خالقو...... ! تیرے کو بھی اپڑیں ملوکاں کے ساتھ تھانے جانا چاہئے تھا، پر خیر...... ! کوئی بات نہیں...... اب تُو چلا جا......''

خالقو نے اثبات میں سر ہلایا اور سیدھا اپنی جھگی کا رخ کیا۔ وہاں پہنچا تو ماں نے ازراہِ تفکر پوچھا۔'' پٹ...... ! کیا کہہ رہا تھا آچر خان......؟''

خالقو قریب بچھی کھری چارپائی پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔'' کہہ رہا تو کچھ نہیں ہوگا، میں ہوں، سنبھال لوں گا، علاقے کے تھانہ سے میری جان پہچان ہے۔''

ماں کو تسلی پھر بھی نہیں ہوئی، بولی۔'' دیکھ لے پٹ...... ! پولیس آتی ہے تو کسی کو نہیں بچاتی اور مار مار کر بھرکس نکال دیتی ہے۔''

خالقو کو ماں کی بات پر ایک دم غصہ آ گیا۔'' تو اور کیا کروں میں...... بھاگ جاؤں گھر سے تاکہ پولیس کو مجھ پر پکا شک ہو جائے۔''

ماں سہم کر چپ ہو رہی...... آچر خان سے ملاقات کے بعد خالقو کی جو تھوڑی بہت پریشانی کم ہوئی تھی، اب ماں کی باتوں سے پھر سوا ہونے لگی۔ خاصی دیر بعد باہر شور سنائی دیا، لوگوں کی باتوں کے علاوہ کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ بھی اس میں شامل تھی، خالقو جلدی سے اٹھا، اچانک جھگی کا ٹاٹ پرے سرکا اور دو پولیس والے اندر داخل ہوئے، انہوں نے ہتھکڑیاں تھام رکھی تھیں۔

''تمہیں سکھیو کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر کہا اور اسے آہنی زیور پہنا دیا۔ قریب کھڑی عجیباں نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔

قصہ کوتاہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا، ملوکاں نے تھانے جاتے ہی اپنے بھائی خالقو کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کروا دی تھی اور متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر چھٹل شاہ نے فوراً خالقو کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے تھے، اسے لاک اپ کر دیا گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملوکاں کو اب اپنے بھائی خالقو سے نفرت ہوگئی تھی بلکہ وہ تو اپنی ماں سے بھی نفرت کرنے لگی تھی، خالقو کو گرفتار کروانے کے بعد ملوکاں کے اندر کی آگ کچھ ماند پڑی تھی بلکہ اس نے تو اب تہیہ کرلیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ خالقو کو قرار واقعی سزا دلوا کر رہے گی، وہ جانتی تھی کہ خالقو نے اس کے ٹکے کھرے کرنے کے لیے ہی سکھیو چاچا کو راستے سے ہٹایا تھا، اب ملوکاں نے حالات سے ٹکر لینے کی قسم کھا رکھی تھی...... اگرچہ اس کے اس اقدام سے اس کی بیوہ چاچی، میراں اور ماما اللہ رکھیو نے بس دکھ کا اظہار کیا تھا، ماما اللہ رکھیو تو تھوڑی دیر وہاں رہ کر چلا گیا پھر اس کے جاتے ہی مائی عجیباں روتی پیٹتی اور اپنی بیٹی ملوکاں کو کوستی ہوئی جھگی میں داخل ہوئی اور قریب کھڑی اپنی بیٹی ملوکاں کو جھنجھوڑتے ہوئے غصے سے بولی۔ ”تُو کیسی بہن ہے رَی...... اڑیں سگے بھائی کو بھی نہیں بخشا تُو نے...... اسے پولیس کے حوالے کر کے ہی چھوڑا، اب مل گئی تیرے کلیجے کو ٹھنڈک......!“

ملوکاں پر ماں کی گریہ وزاری کا مطلق اثر نہ ہوا، اس نے کسی قدر ناگواری سے ماں کا ہاتھ پرے جھٹکا اور پھر اسے تلخ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میں نے جو کیا ہے بالکل صحیح کیا ہے، اس نے چاچا سکھیو کا خون کیا ہے بلکہ اس نے اور تُو نے مل کر میرے بابا کو بھی ذہنی پریشانی میں مبتلا کر کے اس کو مار ڈالا...... تم دونوں ماں، بیٹے لالچ میں اندھے ہو چکے ہو۔“

ادھر بیوہ چاچی اور میراں ایک طرف خاموش کھڑے سسک رہے تھے، اگرچہ انہیں بھی اپنی بھلاوج کا آنا برا لگا تھا مگر جب ان کی اپنی ہی بیٹی اس کے لتے لے رہی تھی تو ان کا درمیان میں کچھ کہنا عبث تھا۔

”ماں......! تُو یہاں سے چلی جا......“ ملوکاں نے ناگواری سے اپنا منہ ایک طرف پھیر کر سرد لہجے میں کہا۔

عجیباں تڑ سے بولی۔ ”میں اب کہاں جاؤں...... میرے گبھرو بیٹے کو تُو نے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل ڈالا...... اب میرا کون سہارا بنے گا......؟“

”تیرا یہ گبھرو بیٹا کماتا کیا تھا ماں جو تجھے اس پر اتنا فخر تھا......؟“ ملوکاں نے اچانک اس کی طرف دیکھ کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں سے وہ تھوڑے بہت روپے لاتا تھا، وہ بھی میں جانتی ہوں اچھی طرح بس تُو یہاں سے چلی جا ماں......! اس کمینے بھائی نے ہمارا بھی تو سہارا چھین لیا...... بتا چاچی اور میراں کا اب کیا بنے گا...... ان بے چاریوں کا ایک ہی تو سہارا تھا جو تیرے لالچی بیٹے نے چھین لیا۔“ لمحہ بہ لمحہ ملوکاں کے لہجے میں درشت آمیز تلخی عود کر آئی تو ایسے میں وہ دونوں ماں، بیٹیاں روتی سسکتی ہوئی اندر کوٹھری میں چلی گئیں۔

”دیکھ دھینے......! اب بھی کچھ نہیں بگڑا تُو اگر تھانیدار کو جا کر یہ کہہ دے کہ خالقو بے گناہ ہے تو......!“

”ہرگز نہیں ماں......!“ ملوکاں یکدم ماں کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بے غیرت بھائی خالقو نے چاچا سکھیو کا خون کیوں کیا ہے، اسے اب اپنے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے...... ماں......! میں اب تیرے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، تُو چلی جا یہاں سے۔“ بیٹی کی کاٹ دار بے رخی پر مائی عجیباں کے چہرے پر ایک لمحے کو نفرت کے تاثرات ابھرے اور پھر وہ اسے گھورتی ہوئی وہاں سے چلی گئی...... اس کے جاتے ہی ملوکاں، بیوہ چاچی اور میراں کو تسلی دینے کی غرض سے اندر کوٹھری میں آگئی۔

☆======☆======☆

آچر خان کو خالقو کی گرفتاری کی اطلاع مل چکی تھی اور اب وہ متعلقہ تھانے کے انسپکٹر چھٹل شاہ کے کمرے میں موجود تھا۔ ”انسپکٹر سائیں! آپ مائی باپ ہو، یہ کیس ادھر ہی ختم کر دو تو میں ساری عمر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔“ آچر خان نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے سامنے کرسی پر براجمان انسپکٹر چھٹل شاہ سے کہا۔

انسپکٹر چھٹل شاہ اس کی ”خدمت“ والی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر وہ ایک ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر تھا چنانچہ وہ آچر خان کے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے متانت سے بولا۔ ”آچر خان......! یہ کوئی چھوٹا موٹا کیس نہیں ہے، قتل کا کیس ہے قتل کا...... جس کی سزا پھانسی ہے یا پھر عمر قید......!“

”سائیں......! پیسے سے کیا نہیں ہو جاتا...... آپ کو میں......!“

”آچر خان......!“ معاً انسپکٹر چھٹل شاہ اس کی بات کاٹ کر قدرے کڑک دار لہجے میں بولا۔ ”یہاں پیسہ نہیں چلے گا صرف انصاف چلے گا اور بس......!“

”کیا ضمانت وغیرہ......!“

”وہ عدالت میں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ قتل کا کیس ہے اور پولیس آلۂ قتل بھی برآمد کر چکی ہے۔“

انسپکٹر کی بات سن کر آچر خان بری طرح چونک پڑا، وہ اب خالقو کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا اور پھر اس سے ملاقات کیے بغیر وہاں سے چلا آیا، اسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ خالقو اب اس کے کام کا آدمی نہیں رہا، اب ملوکاں کو حاصل کرنے کے لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے خود حرکت میں آنا پڑے گا کیونکہ اب تو چاچا سکھو بھی اس دنیا میں نہیں رہا تھا البتہ آچو خان، ماما اللہ رکھیو اور بالخصوص سانول کی موجودگی سے ضرور کھٹک رہا تھا۔

☆======☆======☆

انسپکٹر یاور حیات کے اپنی پولیس پارٹی کے ساتھ واپس لوٹتے ہی سدھوراں کے گرد محلے کی چند ہمدرد عورتوں کا جمگھٹا سا لگ گیا، وہ اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھنے لگیں مثلاً پولیس کیوں آئی تھی؟ کیا پرویز کو گرفتار کرنا چاہتی تھی؟ مگر سدھوراں کے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا، وہ بے چاری مزید پریشان ہوگئی تو اس نے ان عورتوں سے نہایت عاجزی کے ساتھ اسے تنہا چھوڑ دینے کی درخواست کی پھر ذرا ہی دیر بعد سدھوراں تنہا رہ گئی اور اپنے کمرے میں آکر رونے لگی، وہ بری طرح پریشان تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کیا کرے...... پرویز مفرور تھا اور پولیس اس کے تعاقب میں تھی، خود سدھوراں جانتی تھی کہ بقول اس کے شوہر پرویز کے یہ ساری کارستانی اس کے دوست دلدار حسین کی تھی کیونکہ پرویز نے اس کی ایک شرمناک ترغیب پر اسے بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا اور وہ خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر چلا گیا تھا۔

اسے پرویز کی فکر تھی سو تھی مگر اب تو اسے اپنی اور اپنے ہونے والے بچے کی بھی فکر زیادہ ستا رہی تھی...... اچانک اسے اپنی محسنہ عظیم ڈاکٹر فوزیہ کا خیال آیا تو اس کے اندر چھائی مایوسیوں کی تاریکی چھٹنے لگی، اس نے اسی سے ڈاکٹر فوزیہ سے ملاقات کرنے کی ٹھانی، دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی...... وہ چونک گئی پھر کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی، کھولنے سے پہلے اس نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔ ''کون ہے......؟''

''بھابی......! میں ہوں دلدار حسین......!'' دوسری طرف سے آواز ابھری جسے پہچان کر سدھوراں پہلے تو ڈری گئی مگر پھر دوسرے لمحے اس کے چہرے پر نفرت سی کھنڈ آئی اور پھر جواباً وہ اسی لہجے میں بولی۔

''تم دفع ہو جاؤ یہاں سے بدمعاش......! ورنہ میں ابھی شور مچا کر محلے والوں کو اکٹھا کرلوں گی۔''

''بھابی......! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں، مجھے جیسے ہی پتہ لگا کہ پرویز کے ہوٹل پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے اسے گرفتار کرنے کے لیے تو میں......''

''تم نے تو اپنی دشمنی نکال لی نا......! پولیس والوں کے ساتھ سازش کر کے اب

یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' سدھوراں نے اس کی بات کاٹ کر غصیلے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے دلدار کی نہایت شستہ آواز ابھری۔ ''بھابی......! میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، دوستوں میں لڑائی ہوتی رہتی ہے، میں وہ بات کب کا بھول گیا ہوں، میں تو اس لئے آیا تھا کہ پرویز بھائی کی ضمانت قبل از گرفتاری ہو جائے، میں نے اس سلسلے میں علاقے کے بڑے پولیس افسر سے بھی بات کی تھی مگر جیسے آپ کی مرضی بھابی......! میں چلا جاتا ہوں۔'' دلدار نے بڑی مکاری سے کہا تو سدھوراں کے چہرے پر پہلی بار تذبذب کے تاثرات ابھرے۔ اس وقت وہ ایسے نازک حالات سے دوچار تھی کہ اسے تنکے کا سہارا بھی بہت معلوم ہو رہا تھا، اس بے چاری کو صحیح اور غلط کی بھی پہچان نہیں رہی تھی، یہی سبب تھا کہ وہ مکار دلدار حسین کے جھانسے میں آگئی اور اسے جاتا پا کر جھٹ سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کی نگاہ پڑی، دلدار واپس لوٹ رہا تھا، ایسے میں وہ واپس لوٹتا ہوا سدھوراں کو بے ضرر اور بے قصور محسوس ہوا، اس نے بے ساختہ اسے آواز دے ڈالی۔

''دلدار بھائی......! ذرا رکنا......!''

دلدار رک گیا پھر لوٹ کر دروازے کے قریب آیا، اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

''تت...... تم کسی ضمانت کی بات کر رہے تھے؟'' سدھوراں نے کھلے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بھابی......! دراصل میں چاہتا ہوں اگر پرویز بھائی کی گرفتاری سے پہلے اس کی ضمانت ہو جائے تو بہتر رہے گا ورنہ اگر خدانخواستہ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا تو بعد میں پرویز کو چھڑانے میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔'' دلدار نے چالاکی سے کہا۔

سدھوراں کو اپنی حالت کے پیش نظر زیادہ دیر کھڑے ہونے میں نقاہت سی ہو رہی تھی، اس نے دلدار سے قدرے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھائی! اندر آجاؤ، مجھے کھڑے ہونے میں دقت ہو رہی ہے۔'' سدھوراں یہ کہہ کر اسے اندر آنے کا راستہ دینے کی غرض سے پلٹی تو دلدار اپنی کامیابی پر مسرور مسرور سا اندر داخل ہوا اور عقب میں دروازہ کو کنڈی لگانے کی بجائے اسے صرف بھیڑ دیا۔

''بھابی......! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، مجھے آپ ذرا بیمار سی نظر آرہی ہیں......؟'' صحن میں آکر دلدار نے اپنے لہجے میں مکارانہ ہمدردی سموتے ہوئے پوچھا مگر سدھوراں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سے الجھن آمیز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاثرات پھیل گئے تھے مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ہونٹ بھینچ کر معنی خیز انداز میں ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ پھر سدھوراں اسے اندر کمرے میں لے جا رہی تھی مگر دلدار ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''بھ...... بھابی......! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں اور زیادہ دیر رکنا بھی نہیں چاہتا۔''

''مم...... مگر تم تو ضمانت کی بات کر رہے تھے؟'' بے چاری سدھوراں اچانک پریشان سی نظر آنے لگی۔

''ہاں......! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہمیں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔'' دلدار نے مکاری سے کہا۔ ''پرویز بھائی کی ضمانت کے لیے میرے ساتھ آپ کا بھی چلنا ضروری ہے۔''

''میرا چلنا......؟''

''ہاں بھابی......! ہم کسی پولیس افسر سے ملنے تھوڑی جا رہے ہیں، یہ تو حرام خور ہیں، میں شہر کے کمشنر کے ہاں تمہاری فریاد لے جانا چاہتا ہوں...... تم خود چلو گی تو اس پر اثر پڑے گا کیونکہ کمشنر صاحب نرم دل کے ہمدرد آدمی ہیں۔'' دلدار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اور سدھوراں بے چاری تذبذب کا شکار ہو گئی۔ موجودہ حالات نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا، اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے، ہر قدم انجانے اندیشوں کا راہی معلوم ہوتا تھا مگر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے سے مزید پریشانیاں بڑھ سکتی تھیں، وہ دلدار پر بھروسہ نہ کرتی تو پھر کیا کرتی......؟ ایسے حالات میں اچھے بھلے آدمی کی عقل خبط ہو کر رہ جاتی ہے اور سدھوراں تو پھر صنفِ نازک تھی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر چادر اوڑھی اور دلدار کے ساتھ چل دی، اسے دروازے پر تالا لگانے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔

دلدار نے ٹیکسی کر لی تھی...... سدھوراں عقبی سیٹ پر براجمان تھی اور دلدار ٹیکسی ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر...... سدھوراں، دلدار کے ساتھ چلی تو آئی تھی مگر اب اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ سدھوراں کا دلدار کے ساتھ گھر سے نکلنے کا یہ وہ وقت تھا جب اس کے جانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر فوزیہ، موسیٰ کے ساتھ سدھوراں کے گھر پہنچی تھی تو اسے خالی گھر بھائیں بھائیں کرتا ملا تھا۔

ٹیکسی سبک رفتاری سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور سدھوراں عقبی سیٹ پر شدید گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار تھی، تقریباً نصف پون گھنٹے تک ٹیکسی معروف شاہراہوں پر گامزن رہنے کے بعد اچانک ایک پوش علاقے میں آ گئی، یہ نئی رہائشی اسکیم کا کوئی زیر تکمیل

پروجیکٹ تھا اور تیاری کے آخری مراحل میں تھا، سدھوراں کی بے چینی اس ویران اور دور دراز علاقے کو دیکھ کر مزید سوا ہونے لگی، اس کے خیال کے مطابق کمشنر صاحب کا دفتر کسی معروف اور بارونق علاقے میں ہونا چاہئے تھا۔

''دلدار بھائی......! کمشنر صاحب کا آفس ادھر ہے......؟'' بالآخر اس نے پوچھ لیا۔

دلدار نے جواباً کہا۔ ''ہم کمشنر صاحب کے دفتر نہیں ان کی رہائشگاہ کی طرف جا رہے ہیں کیونکہ اپنے دفتر میں وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔''

دلدار کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی مگر دل اس کا ہنوز بے چینی میں مبتلا تھا پھر ایک پوش بنگلے کے سامنے دلدار نے ٹیکسی والے کو رکنے کا کہا۔

پھر ٹیکسی کے رکتے ہی دلدار ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے نیچے اتر آیا اور اس دوران سدھوراں بھی نیچے اتر آئی، پریشانی نے اس کی طبیعت مزید بگاڑ دی تھی، اس کو اب شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی...... ٹیکسی والا چلا گیا تو اچانک ایک پرانے ماڈل کی ایک کار طوفانی رفتار سے ان کے قریب آ کر چرچراتے ٹائروں کے ساتھ رکی...... سدھوراں اور دلدار دونوں چونک سے گئے پھر اچانک کار سے تین افراد نمودار ہوئے، ان میں ایک شخص کو دیکھ کر سدھوراں کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے تاثرات پھیل گئے جبکہ قریب کھڑے دلدار کے چہرے پر الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے، ان تینوں میں سے وہ شناسا آدمی پرویز تھا، اس نے ایک قہربار نظر قریب کھڑے دلدار پر ڈالی اور پھر سدھوراں کے قریب آ کر بولا۔ ''سدھوراں......! تو اس مردود کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے......؟''

سدھوراں نے اسے اپنے یہاں آنے کا حال بتایا تو پرویز کے چہرے پر درشتگی کے ساتھ اب نفرت بھی عود کر آئی اور وہ آگے بڑھ کر دلدار کا گریبان پکڑتے ہوئے خونخوار لہجے میں غرا کر بولا۔ ''رذیل انسان......! تجھے جرأت کیسے ہوئی میری بیوی کو یہاں لانے کی ...بول؟''

دلدار، پرویز کو اچانک دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا تھا مگر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی قریب کھڑی سدھوراں نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''پرویز......! دلدار بھائی کو غلط مت سمجھو، یہ تمہاری ضمانت کے لیے مجھے یہاں......!''

اچانک پرویز نے سدھوراں کی بات کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ ''سدھوراں......! یہ ذلیل آدمی تجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے، یہ بنگلہ کمشنر کا نہیں ہے بلکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس عیاش آدمی انسپکٹر یاور حیات کا عشرت کدہ ہے۔''

پرویز کی بات سن کر سدھوراں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی اور پھر اچانک اسے چکر آ گیا، وہ بے اختیار اپنا سر پکڑ کر غش کھانے کے انداز میں ذرا لڑکھڑا سی گئی...... پرویز نے دلدار کا گریبان چھوڑا اور سدھوراں کو سنبھالنے کے لیے لپکا، ادھر دلدار نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک جانب دوڑ لگا دی...... پرویز غش کھاتی سدھوراں کو تھامتے ہوئے چیخ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا۔''اس مردود کا پیچھا کرو...... یہ جانے نہ پائے۔''

اس کا حکم سنتے ہی اس کے دونوں ساتھی فوراً دلدار کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے، ادھر سدھوراں بے ہوش ہو کر پرویز کی بانہوں میں جھول چکی تھی۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو گھر پر غیر موجود پا کر بری طرح پریشان تھی، اس نے وہاں محلے کی عورتوں سے بھی سدھوراں کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی مگر سب نے لاعلمی کا ہی اظہار کیا تھا البتہ ایک عمر رسیدہ عورت نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے اسے بتایا۔''سدھوراں آج کل اپنے شوہر پرویز کے ساتھ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لیے جاتی رہتی تھی، ہوسکتا ہے وہ اس وقت بھی وہیں گئی ہو۔''

ڈاکٹر فوزیہ نے اس سے اس لیڈی ڈاکٹر کے کلینک یا میٹرنٹی ہوم کے بارے میں بھی پوچھا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا پھر ڈاکٹر فوزیہ خاصی دیر تک وہاں انتظار کرنے کے بعد موسیٰ کے ساتھ اپنی کار میں آ بیٹھی...... اس کا ارادہ پولیس کو اطلاع کرنے کا تھا چنانچہ اس نے کار میں بیٹھتے ہی اپنے پرس سے موبائل نکالا اور انسپکٹر مشتاق احمد کے نمبر پنچ کرنے لگی، تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوتے ہی ڈاکٹر فوزیہ نے شستہ لہجے میں کہا۔''انکل...... آداب...... میں ڈاکٹر فوزیہ بات کر رہی ہوں۔''

دوسری طرف سے جواباً انسپکٹر مشتاق احمد شفیق لہجے میں بولے۔''ہاں بیٹی فوزیہ...... خیریت تو ہے کیسے فون کیا......؟''

ان کے استفسار پر ڈاکٹر فوزیہ نے سدھوراں کی پُراسرار گمشدگی کے متعلق انہیں آگاہ کیا تو وہ چند ثانیے پُرسوچ خاموشی کے بعد بولے۔''ٹھیک ہے، اگر تمہیں کسی قسم کے اغوا کا شک ہو رہا ہے تو میں ابھی کارروائی کا آغاز کرتا ہوں اور ساتھ ہی متعلقہ تھانے سے بھی رابطہ کرتا ہوں۔''

''جی بہت بہتر......!'' ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور پھر موبائل آف کر کے دوبارہ اسے پرس میں ڈال لیا اور اپنی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اب وہ سدھوراں کے شوہر پرویز کے ہوٹل کی طرف گامزن تھی۔

سارے راستے اس کے دماغ میں سدھوراں سے متعلق پریشان کن اور وسوسہ انگیز خیالات گردش کرتے رہے، وہ سوچ رہی تھی آخر سدھوراں یوں اچانک کدھر غائب ہو گئی تھی...... اس کی حالت ایسی تو نہیں تھی کہ وہ کہیں آ جا سکتی...... پھر اچانک اسے اس وڈیرے جہاں داد کا خیال آیا، کہیں اس نے تو سدھوراں کو نہیں اٹھوا لیا......؟ یہ متوحش سا خیال آتے ہی وہ کانپ سی گئی مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ انسپکٹر مشتاق احمد نے جہاں داد کے باپ وڈیرے میر منصب خان سے اس کی ڈیفنس والی شاہانہ کوٹھی میں ملاقات کر کے انہیں تنبیہہ کی تھی کہ وہ اپنے اوباش بیٹے کو قابو میں رکھے۔ یہ تب کی بات تھی جب ڈاکٹر فوزیہ کو جہاں داد نے یرغمال بنانے کی مجرمانہ حرکت کی تھی اور وڈیرے میر منصب خان کی طرف سے معافی تلافی کے بعد یہ معاملہ سرد پڑ گیا تھا، یہی سبب تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ کو اپنا یہ خیال بھی رد کرنا پڑا کہ جہاں داد دوبارہ سدھوراں کے ساتھ ایسی کوئی اوچھی حرکت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

انہی پریشان کن خیالات میں جب ڈاکٹر فوزیہ پرویز کے ہوٹل پہنچی جو نرسری میں واقع تھا تو اسے بند پایا...... اسے بڑی حیرت ہوئی پھر اس کے بعد وہ پرویز کے گہرے دوست پہلوان دودھ والے کی دکان پر آئی تو اس سے معلوم ہوا کہ پرویز کو پولیس پکڑ نے ہوٹل آئی تھی اور اس نے ہی اس کا ہوٹل سیل کیا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو پرویز کے ہوٹل پر پولیس چھاپے کی بڑی حیرت ہوئی، وہ سوچنے لگی کہ آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا...... ڈاکٹر فوزیہ اب دہری پریشانی کا شکار ہونے لگی، بہرطور وہ کار میں بیٹھی اور اپنی رہائشگاہ پر آ گئی۔

اندر پہنچی تو اسے معلوم ہو کہ ڈاکٹر جواد احمد کی امی اور چند دیگر مہمان آئے ہوئے ہیں...... ڈاکٹر فوزیہ، ڈاکٹر جواد احمد کی والدہ کے آنے کا مطلب بخوبی جانتی تھی مگر اس کے دل و دماغ میں سدھوراں کی پریشانی کا غلبہ تھا اور وہ خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

مختلف حالات کے پیشِ نظر ''بڑوں'' میں طے پایا کہ سرِدست ان دونوں کی منگنی کر دی جائے، شادی ڈاکٹر فوزیہ کے ایف آر سی پی کرنے کے بعد تک مؤخر کر دی گئی۔ سرجن بھی حیدر شاہ کا خواب اور خود ان کی ہونہار بیٹی ڈاکٹر فوزیہ کا یہ شوق تھا کہ وہ لندن سے ایف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آر سی پی کی ڈگری حاصل کرے۔ یوں تو ڈاکٹر جواد بھی میڈیسن میں ایف سی پی ایس کر رہا تھا، بہر طور ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد احمد کی منگنی کی تاریخ تین دن بعد کی طے کر دی گئی۔

☆======☆======☆

سارنگ چند ثانیے تاریکی میں دم بخود کھڑا ان دونوں ماں، بیٹے کے رونے اور سسکنے کی آوازیں سنتا رہا پھر وہ سائے کی طرح دیوار سے چپکا، بے آواز قدموں سے چلتا ہوا سامنے کے رخ پر آ گیا۔ یہ کوٹھری نما کمرہ تھا، جو گھر کے وسیع صحن کے داہنی جانب ایک کونے میں بنا ہوا تھا، صحن ویران تھا جدھر مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی، دروازے کے قریب پہنچ کر سارنگ نے دیکھا کہ دروازے پر محض کنڈی لگی ہوئی تھی، خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا، یہ کمرہ کیونکہ وسیع و عریض گھر کے اندر تھا اس لئے شاید اسے مقفل کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی۔ اس نے آہستگی سے کنڈی کھولی اور دروازے کا صرف ایک پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر بلب کی یرقان زدہ روشنی میں سارنگ کی نظر جونہی سامنے ایک کونے کے سیلن زدہ فرش پر پڑی تو اس کا دل، دکھ اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے بھر گیا، اس کی الم نصیب بھابی اللہ وسائی اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لیے بیٹھی رو رہی تھی۔ سارنگ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سراسیمہ سی نظر آنے لگی، وہ سارنگ کو اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے پہچان نہیں پائی تھی مگر دوسرے ہی لمحے سارنگ نے آگے بڑھ کر انتہائی مجبور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سر پر ملائمت آمیزی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے رقیق لہجے میں بولا۔ ''بھابی......! یہ میں ہوں سارنگ......!'' اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ بھابی اللہ وسائی کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی کے تاثرات ابھرے اور اس کا ستا ہوا چہرہ یکدم کھل گیا، وہ بے یقینی سے اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی لرزاں آواز میں بولی۔

''سس......سارنگ......! یہ......یہ......تم ہو؟''

''ہاں......بھابی......! یہ میں ہوں سارنگ......! تیرا بھائی......چل جلدی کر، میں نے تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، آ جا میرے ساتھ۔'' سارنگ نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس کی گود میں ہمکتے ہوئے بچے کو بھی پیار کیا۔ بھابی اللہ وسائی کی حالت پر اس کا دل کٹ کر رہ گیا، وہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور نحیف نظر آ رہی تھی، اس بے چاری کے سر کے بال بھی جھڑ چکے تھے جس کا مطلب تھا اسے وہ پراسرار بیماری ابھی تک چمٹی ہوئی تھی جو اسے

تھر میں قحط سالی کے دوران لگی تھی اور اس بیماری کی وجہ سے اس بے چاری کو اپنے معصوم نومولود بچے سمیت قافلے سے الگ کر دیا گیا تھا جس کا خمیازہ دونوں معصوم ماں، بیٹے ابھی تک بھگت رہے تھے۔

سارنگ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان دونوں ماں، بیٹے کو باہر نکال لایا پھر انہیں سانڈنی پر بٹھا کر آگے تاریکی میں بڑھ گیا۔ جیوش بابا کی جھونپڑی کے قریب پہنچنے تک اس نے بھابی اللہ وسائی کو طویل اور پُر مصائب سفر کے بارے میں مختصراً آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے کس طرح اس مردود گاتریا کو بھیانک انجام سے دوچار کیا نیز فریدو کے متعلق بھی سارنگ نے اسے بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ پھر جیوش بابا کی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سارنگ سانڈنی کو کھجوروں کے جھنڈ کے قریب لایا جدھر فریدو اور بے ہوش رکمنی موجود تھے، رکمنی کو ہوش آ چکا تھا اور وہ بہت سراسیمہ اور پریشان نظر آ رہی تھی تاہم فریدو نے اسے سارنگ کی ہدایت کے مطابق ہوش آنے پر آگاہ کر دیا تھا کہ کس طرح جیوش بابا اسے مردود گاتریا کے حوالے کر چکا تھا مگر سارنگ نے اسے جہنم واصل کر ڈالا۔ یہ سب لوگ آپس میں مل کر بہت خوش تھے۔ اب سارنگ کے سر پر رکمنی کی ذمہ داری بھی تھی، اسے بھی بخیریت اس کے گھر تک پہنچانا تھا لہٰذا جب اس نے یہ کام بھی نمٹانے کی غرض سے رکمنی سے گھر چلنے کو کہا تو وہ بے چاری رو دی اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میں اب اپنے گھر کیسے جا سکتی ہوں، میرے ماتا، پتا مجھے پھر اسی شیطان کے حوالے کر دیں گے۔''

سارنگ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں......! اب ایسا نہیں ہو گا کیونکہ تم نے وکرماجیت سے شادی کرنے کا جو ڈرامہ رچایا تھا، وہ الٹا تمہارے ہی گلے آن پڑا تھا، اب ظاہر ہے تم ایسا نہیں کرو گی تو تمہارے ماتا، پتا بھی تمہیں اب دوبارہ اس کے حوالے نہیں کریں گے۔'' پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ''ویسے مجھے گاتریا کی طرح اس شیطان جیوش بابا کو بھی نیست و نابود کر دینا چاہئے۔''

''نن......نہیں بھیا......! ایسا غضب بھی نہ کرنا۔'' اچانک رکمنی نے اسے باز رکھتے ہوئے متوحش سے لہجے میں کہا۔ ''جیوش بابا کے گندے خون سے اپنے ہاتھ کیوں خراب کرتے ہو......؟ اگر تم نے اس کو مار ڈالا تو تم سب ایک اور بڑی مصیبت کا شکار ہو جاؤ گے اور تمہارا واپسی کا سفر بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا کیونکہ اس گوٹھ کے لوگ اس شیطان کی یوں بھی پوجا کرتے ہیں...... وہ مشتعل ہو کر تم لوگوں کے پیچھے پڑ جائیں گے اور ریت میں قدموں کے نشانات کے ذریعے تم لوگوں کو تلاش کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکمنی کی صراحت پر سارنگ خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ''پھر چلو میں تمہیں پہلے تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔''

''نہیں بھیا......! یہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں...... میں خود اپنے گھر چلی جاؤں گی، تم لوگ یہاں سے نکلنے میں دیر مت لگاؤ...... آگے پتہ نہیں کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے۔'' رکمنی نے خلوص سے کہا۔ اس کی بات درست تھی۔ سارنگ کے پاس واقعی بہت کم وقت تھا، سرحد پار کر کے اپنے دیس نکلنا بھی ایک الگ اور کم خطرناک کام نہ تھا، رہی بات رکمنی کی، وہ تو تھی ہی یہاں کی رہنے والی، اپنے گھر پہنچنا اس کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔

پھر سارنگ، بھابی اللہ وسائی اور فریدو، رکمنی سے رخصت ہو کر سانڈنی پر سوار تاریکی میں لق و دق صحرا کی وسعتوں کی طرف بڑھ گئے۔

سارنگ اپنے ایک مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب اسے سرحد پار کرنا تھی اور یہ مرحلہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا کیونکہ سارنگ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جب تھر سے سرحد پار کر کے راجستھان کی سرحد میں داخل ہوا تھا تو ایک مڈبھیڑ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز سے ہو گئی تھی اور وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا پھر سفاک انڈین آفیسر اسے زبردستی پاکستانی جاسوس بنانے پر تل گیا تھا اور یہ جرم اس کے سر تھوپنے کے لیے اس نے اس پر تشدد کی بھی انتہا کر دی تھی، بعد میں وہ ان کی گرفت سے نکل بھاگا تھا۔ سارنگ کو یقین تھا کہ اب وہ بھیڑیوں کی طرح اس کے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے مگر سارنگ کو خود سے زیادہ بھابی اللہ وسائی، اس کے ننھے بچے اور فریدو کی فکر تھی، اس نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ وہ انڈین سیکورٹی فورسز کی نظروں میں آئے بغیر سرحد پار کر جائے، اس نے ایک محتاط اندازے کے تحت متبادل راستہ اپنایا تھا اور اب خدا سے یہی دعائیں مانگتا ہوا محوِ سفر تھا کہ وہ خیریت سے سرحد پار کر کے اپنی دھرتی پر پہنچ جائے۔

زادِ راہ کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا مگر وہ اس وقت جس صحرائی مقام سے گزر رہے تھے، وہاں کہیں کہیں کھجوروں کے درخت نظر آ رہے تھے اور دو ایک برساتی ٹوبے بھی انہیں دکھائی دیئے تھے، اس طرح انہوں نے کھجوروں اور پانی سے پیٹ بھرا تھا اور زادِ راہ کے نام پر تھوڑا بہت کھجوروں اور پانی کا ذخیرہ بھی کر لیا تھا...... سارنگ کو بھابی اللہ وسائی نے دورانِ سفر اپنی اور فریدو کی کربناک روداد سے بھی آگاہ کیا تھا جب وہ مردود گاتریا دھوکے سے اسے اور فریدو کو یرغمال بنا کر راجستھان لے آیا تھا اور ہندو سیٹھ کے ہاتھ انہیں فروخت کر دیا تھا۔ بھابی اللہ وسائی نے سارنگ کو اپنی کتھا سناتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جب رام

دیال نے اسے اپنی کنیز بنایا تو پھر اس کے سر کی جلد کی پُراسرار بیماری کا بھی اس نے ہی ایک حکیم سے علاج کروایا تھا اور اس سے کافی افاقہ ہوا تھا۔

اب دور مشرق کی سمت صحرائی ٹیلوں سے افق سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا مگر سارنگ نے سفر ترک نہ کیا اور مسلسل اللہ کے آسرے پر چلتا رہا، اسے پوری امید تھی کہ اللہ نے اگر اب تک اسے اتنے مشکل اور دشوار گزار حالات سے سرخرو فرمایا تھا تو وہی آگے بھی اس نیک مقصد میں ضرور کامیاب کرے گا۔

اچانک سارنگ کو اپنی داہنی جانب ذرا دور ریت کے بگولے اڑتے ہوئے دکھائی دیئے...... وہ بری طرح ٹھٹک گیا، وہ یہی سمجھا کہ کہیں یہ کسی صحرائی طوفان کا آغاز تو نہیں مگر پھر جلد ہی اسے یہ احساس ہوا کہ یہ طوفان نہیں بلکہ کوئی مختصر سا قافلہ ہے جو بیل گاڑیوں پر مشتمل تھا۔

سارنگ نے کسی خیال کے تحت سانڈنی کو روک دیا پھر وہ سب ریت پر اتر کر کھڑے ہو گئے، وہ قافلہ پانچ، چھ بیل گاڑیوں پر مشتمل تھا، سارنگ ان کے راستے سے ذرا ہٹ کر کھڑا قافلے کے قریب آنے کا منتظر تھا۔ یوں اس کا دل انجانے اندیشوں سے دھڑک رہا تھا مگر اس قافلے والوں سے راستہ پوچھنا بھی ضروری تھا ورنہ وہ اس اجنبی سرزمین میں راستہ بھٹک سکتا تھا...... قافلہ ان کے قریب آ کر رک گیا، ان میں مرد، عورت، بوڑھے اور بچے سب ہی شامل تھے، یہ سب خانہ بدوش تھے...... جسیم اور خاکستری رنگت والے۔ سب سے اگلی بیل گاڑی میں سوار ایک عمر رسیدہ شخص نے سارنگ سے بولا۔ ''رے بالکے......! ادھر کیا کرتے ہو......؟''

سارنگ نے اپنا مقصد بیان کیا تو عمر رسیدہ شخص نے اسے مطلوبہ راستہ سمجھایا اور پھر اپنے بیلوں کی پشت پر چابک مار کر انہیں آگے بڑھا دیا...... سارنگ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے پاس موجود تھوڑی کھجوریں کھائیں اور پانی سے حلق تر کیا اور آگے بڑھ گئے...... ابھی تھوڑا ہی دور چلے ہوں گے کہ اچانک سارنگ کو بائیں جانب پھر ریت سی اڑتی نظر آئی مگر سارنگ اب رکنا نہیں چاہتا تھا، وہ سانڈنی کو درمیانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا...... فریدو اس کے آگے سانڈنی کی موٹی گردن پر بیٹھا تھا جبکہ سارنگ کے پیچھے بھابی اللہ وسائی...... یوں تو سارنگ کبھی سانڈنی سے اتر کر بھی تیز تیز چلنے لگتا تھا مگر بہ وقتِ ضرورت وہ خود بھی سانڈنی پر سوار ہو کر اسے دوڑانے لگتا۔

سارنگ کو اپنی دھرتی کا راستہ معلوم ہو چکا تھا لہٰذا اب ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کرنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہتا تھا، اس نے سرحد پار کرنے کا ایک محتاط طریقہ سوچ لیا تھا، وہ رات کی تاریکی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا...... وقت گزرتا رہا، صحرا میں تپش بڑھنے لگی مگر سارنگ کا سفر مسلسل جاری رہا پھر اسے ایک نخل کے آثار نظر آئے، اس نے اس کی چھاؤں میں گرم دن کاٹنے کا فیصلہ کیا، اس کے اندازے کے مطابق اب وہ سرحد سے چند میلوں کے فاصلے پر تھا۔

☆======☆======☆

چاچا سکھیو کی موت کے بعد سے اب ملوکاں کو زیادہ شدت کے ساتھ اپنے دوسرے بھائی سارنگ کی یاد آنے لگی تھی کیونکہ وہ تینوں عورتیں یعنی ملوکاں، چاچی اور میراں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ ادھر یہ تینوں الم نصیب عورتیں اپنی قسمت کو رو رہی تھیں اور ادھر بدخصلت آچر خان اپنے ہوٹل میں بیٹھا ایک نئی سازش کے تانے بانے بن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ملوکاں کی نسبت ماما اللہ رکھیو کے بھانجے سانول سے طے کر دی گئی ہے، یہی سبب تھا کہ چاچا سکھیو کو خالقو کے ہاتھوں قتل کروانے کے باوجود اس کا مسئلہ وہیں اٹکا ہوا تھا بلکہ اب خالقو کی ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ مزید الجھ ہو گیا تھا۔ آچر خان اب کف افسوس ملتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے خالقو کے ہاتھوں چاچا سکھیو قتل کروانے کی غلطی کی، وہ اسے قتل کروانے کی بجائے ماما اللہ رکھیو کے بھانجے کو قتل کروا دیتا تو ساری کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ کیونکہ اس کی راہ کا اصل کانٹا تو سانول تھا چنانچہ اس نے سانول کو راستے ہٹانے کا فیصلہ کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید خالقو کی طرف سے بھی تشویش لاحق ہونے لگی تھی کہ جب خالقو کو یہ پتہ چلے گا کہ وہ اسے جیل سے چھڑانے میں ناکام رہا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ وہ پولیس کو اصل حقیقت بتا دے کہ اسے چاچا سکھیو کو قتل کرنے پر اس نے ہی اکسایا تھا اور آلہ قتل بھی آچر خان نے ہی اسے دیا تھا۔ یہ سوچ کر آچر خان کو اب اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ اگر خالقو نے پولیس کے آگے سچ بول دیا تو پولیس اسے دھرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔

اب آچر خان سوچنے لگا کہ اسے تھانے جا کر خالقو سے ملاقات ضرور کرنی چاہئے۔ وہ اسے تسلی تشفی دینا چاہتا تھا، اب تو ویسے بھی خالقو کی مدد کرنا آچر خان پر لازم ہو چکا تھا، اس نے اسی وقت سب سے پہلے تھانے جا کر خالقو سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا اور سیدھا تھانے پہنچا۔ اس وقت انسپکٹر پھلل شاہ وہاں موجود نہ تھا، آچر خان نے ایک پولیس والے کی مٹھی گرم کی تو اس کا کام آسان ہو گیا۔

خالقو اپنے گرو گھنٹال آچر خان کو دیکھ کر بولا۔ ''آ...... آچر سائیں......! میری ضمانت کا کیا بنا...... مجھے یہ پولیس والے بہت مارتے ہیں...... مجھے فوراً یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔ آچر سائیں......!'' وہ بہت پریشان تھا، اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی اور بہت پتلی حالت ہو رہی تھی اس کی۔

آچر خان اسے تسلی دیتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ''اڑے چریا......! تُو کیا سمجھتا ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، کوشش کر رہا ہوں میں۔'' پھر وہ دائیں بائیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔ ''اچھا یہ تو بتا تُو نے پولیس کو کچھ بتایا تو نہیں ہے نا......؟''

''نہیں......! میں نے ابھی اقرار جرم نہیں کیا، اتنا کچا تھوڑا ہی ہوں میں۔'' خالقو سینہ پھلا کر بولا۔ آچر خان کو دیکھ کر اسے ذرا حوصلہ ہوا تھا۔ وہ مزید بولا۔ ''پر آچر سائیں......! پولیس مجھے بہت مارتی ہے...... کل بھی مجھے اس نے مارا تھا۔''

''اچھا......! یہ تو اور اچھی بات ہے، اس طرح تیرا کیس اور مضبوط ہوگا کیونکہ پولیس عدالت سے ریمانڈ لئے بغیر تشدد نہیں کر سکتی۔'' آچر خان نے وکیلوں کی طرح اسے نکتہ سمجھایا۔

''آچر سائیں......! میری ضمانت کا کیا ہوا......؟'' خالقو نے پوچھا تو اسی وقت پولیس والے نے آ کر آچر خان سے کہا۔

''بس سائیں! ملاقات ختم...... تھانیدار صاحب آنے والے ہیں۔'' اس کی بات سن کر آچر خان نے خالقو کو تسلی تشفی دی اور وہاں سے لوٹ آیا۔

آچر خان ایک سازشی اور بڑا منصوبہ ساز شخص تھا، اتنا تو اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ خالقو کہ وہ اب بچا نہیں سکتا کیونکہ خالقو کے خلاف اس کی بہن ملوکاں کی گواہی اور آلہ قتل بہت مضبوط محرک تھے، جو اسے عمر قید یا پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتے تھے چنانچہ اس نے اب ایک تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کیا...... وہ اب اپنے منصوبے پر فوری عمل کرنا چاہتا تھا ورنہ خالقو کو اگر شہر کی بڑی جیل منتقل کر دیا جاتا تو اس کا منصوبہ فیل ہو سکتا تھا، اس نے اچھی طرح اپنے اس خفیہ منصوبے پر غور کیا تو اسے ہر طرح سے اپنا منصوبہ بے داغ اور تیر بہدف محسوس ہوا...... اس کا دل اپنی ذہانت پر آپوں آپ بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ اس خفیہ منصوبے کی کامیابی کے بعد سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ آچر خان اب خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

ادھر ماما اللہ رکھیو روزانہ ملوکاں، میراں اور چاچی کی خبر گیری کے لیے ان کے ہاں آتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتا تھا۔ ایک روز اس نے چاچا سکھیو کی بیوہ سے کہا۔ ''ادی مان واری......! اللہ سائیں، بھا سکھیو کو جنت نصیب کرے، انسانی ہمدردی کے ناتے مجھے اب تمہاری اور سب سے زیادہ دھی ملوکاں کی فکر رہنے لگی ہے، یہ موقع تو نہیں ہے یہ بات کہنے کا مگر جب حالات ہی ایسے ہوں تو ہمیں چاہئے کہ جلد سے جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو بہتر ہے۔''

''ادا سکھیو......! میں تیری بات سمجھ رہی ہوں، اب تُو جیسے بول......!'' چاچی نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

''ادی......! ہمیں اب سانول اور ملوکاں کی شادی کر دینا چاہئے، بالکل سادگی اور خاموشی کے ساتھ......!''

چاچی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو ماما اللہ رکھیو چند ثانیے کچھ سوچتا رہا، اس کے متذبذب چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ کوئی ایسی بات بھی کہنا چاہتا تھا جس کے لیے اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ تب پھر بیوہ چاچی نے ہی اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے ادا......! تُو کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے؟''

''ہا...... ہاں ادی مان واری......!'' اس کے استفسار پر ماما اللہ رکھیو نے ذرا حوصلہ پکڑتے ہوئے فوراً کہا اور مزید بولا۔ ''دیکھو ادی......! میری بات اگر تیرے کو بری لگے تو ناراض مت ہونا مگر رب سائیں جانتا ہے ایسا میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کرنا چاہتا ہوں، ادی مان واری......! زمانہ بہت خراب ہے، ملوکاں کی شادی کے بعد تُو اور میراں دھی تنہا رہ جاؤ گی، میراں کو بھی میں اپنی دھی سمجھتا ہوں، دراصل میں چاہتا ہوں کہ ملوکاں اور سانول کی شادی کے بعد میرے پاس رہنے کی بجائے وہ دونوں ادھر تمہارے پاس ہی رہیں، اس طرح تمہیں بھی سہارا ہو جائے گا یا پھر تُو اور میراں دھی میرے ساتھ آ کر رہو، ہم سب مل کر خوش رہیں گے۔'' ماما اللہ رکھیو نے اتنا کہہ کر سکھیو کی بیوہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بے اختیار چاچی کی آنکھیں بھیگ گئیں...... ماما اللہ رکھیو کے خلوص بھرے لہجے نے اسے رقیق سا کر دیا تھا۔

''روتی کیوں ہو ادی......! اگر تجھے تیرے ادا کی بات اچھی نہیں لگی تو......!''

''نہیں ادا......! یہ بات نہیں۔'' چاچی نے فوراً اس کی بات کاٹ کر رقیق القلبی سے کہا۔ ''تُو نے تو یہ کہہ کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے، بھلا تیری بات مجھے کیوں بری لگے گی...... پر میں زمانے سے ڈرتی ہوں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیرے گھر رہنے کی بجائے سانول اور ملوکاں شادی کے بعد ادھر ہی آ کر رہیں، ہمارے ساتھ......!''

''لے بھلا اس میں احسان کی کیا بات ہے...... ٹھیک ہے پھر یہی بہتر ہے، تو اب شادی کی تاریخ خود ہی بتا دے، مجبوری ہے، ابھی تو بے چارے بھا سکھیو کی قبر کی مٹی بھی سوکھی نہیں ہے، پر کیا کریں عورتوں والی مجبوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن......''

''ٹھیک ہے بھا......! تُو جو تاریخ، مہینہ بتائے گا، وہی ٹھیک رہے گا۔'' بالآخر وہ دل مسوس کر بولی۔

اور ماما اللہ رکھیو نے اس ماہ کا آخری ہفتہ دے دیا۔ چاچی نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

☆======☆======☆

سدھوراں کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر پرویز ایک لمحے کو کچھ پریشان سا ہو گیا، اس کے دونوں ساتھی، مردود دلدار کو پکڑنے کے لیے اس کے تعاقب میں دوڑ چکے تھے، پرویز خود بے ہوش سدھوراں کو انسپکٹر یاور حیات کے نوتعمیر شدہ بنگلے کے سامنے سنبھالے کھڑا تھا پھر وہ بمشکل سدھوراں کے بے ہوش وجود کو سنبھالتے ہوئے اپنی کار تک لایا، کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسے اندر سیٹ پر لٹا دیا...... سدھوراں اب نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگی، اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی، پرویز نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی، ذرا ہی دور اس کے دونوں ہانپتے ہوئے ساتھی آ گئے۔

''وہ بھاگ گیا استاد......!'' ایک نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔

''میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں اسے قریبی ہسپتال لے جا رہا ہوں، تم چوکنا رہو اور ابھی اپنے اڈوں سے بھی دور رہو۔'' پرویز نے انہیں ہدایات دیں پھر ان کی کچھ سنے بغیر کار آگے بڑھا دی اور مین شاہراہ پر آ گیا...... پرویز کے چہرے پر تشویش جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی، عقبی سیٹ پر لیٹی نیم بے ہوشی کی حالت میں سدھوراں کے کراہنے کی آوازیں اب بتدریج بڑھنے لگی تھیں، پرویز اس کی حالت سے بخوبی واقف تھا، پرویز کو دلدار پر بری طرح طیش آ رہا تھا، اس رذیل نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معصوم سدھوراں کو پھانسنے کی کوشش کی تھی، اس کمینے کو سدھوراں کی حالت پر بھی رحم نہ آیا تھا...... پرویز کے دل و دماغ میں اب دلدار سے انتقام لینے کی آگ سلگ رہی تھی۔

بہر طور وہ مطلوبہ میٹرنٹی ہوم پہنچا اور سدھوراں کو وہاں داخل کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ سدھوراں کے پاس کسی عورت کا رہنا ضروری ہے، اس صورت حال نے اسے مزید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پریشان کر دیا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس عورت کا بندوبست کرے جو سدھوراں کے پاس موجود رہے اور اس کی تیمارداری کرے...... اسے خود اپنے دھر لیے جانے کی بھی پریشانی لاحق تھی، پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور وہ خود اس سے چھپتا پھر رہا تھا پھر اچانک اسے سدھوراں کی ہمدم دیرینہ ڈاکٹر فوزیہ کا خیال آیا لہٰذا اس نے میٹرنٹی ہوم کی ایک نرس اور آیا کی مٹھی گرم کرتے ہوئے سدھوراں کا پوری طرح خیال رکھنے کی تاکید کی اور پھر خود دوبارہ کار میں آ کر بیٹھا اور سیدھا ڈاکٹر فوزیہ کی رہائشگاہ پر آ پہنچا مگر ڈاکٹر فوزیہ گھر پر موجود نہ تھی البتہ ماسی نے پرویز کو پہچان لیا تھا۔ پرویز نے جلدی جلدی اسے اپنے اور سدھوراں کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی اس میٹرنٹی ہوم کا پتہ بھی اسے سمجھا دیا کہ اگر ڈاکٹر فوزیہ آئیں تو وہ انسانی ہمدردی کی خاطر وہاں جا کر سدھوراں کی خیر خبر لے لیں۔

وہاں سے پرویز سیدھا نرسری اپنے دوست پہلوان دودھ والے سے ملا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے بھی اسے یہ بتایا کہ ڈاکٹر فوزیہ یہاں آئی تھی اور اس کا اور سدھوراں کا پوچھ رہی تھی۔

''یار......! میں اس وقت بہت پریشان ہوں اور پولیس کے ڈر سے چھپتا پھر رہا ہوں تُو ذرا بھابی کو کسی طرح سدھوراں کے پاس بھیج دے، میں تیرا یہ احسان ساری زندگی نہیں فراموش کروں گا۔''

''ارے یار......! کیسی باتیں کرتا ہے، ہم تو یاروں کے یار ہیں، تُو بے فکر ہو جا، میں ابھی خود تیری بھابی کو لے کر سدھوراں کے پاس پہنچتا ہوں۔'' پرویز نے اسے جلدی جلدی میٹرنٹی ہوم کا پتہ سمجھایا اور اپنی کار میں آ بیٹھا۔

اس کی آنکھوں سے انتقام کے شعلے پھوٹ رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ دلدار اسے کہاں ملے گا...... اس کا رخ اب بنگالی پاڑے کی طرف تھا۔

لگ بھگ گھنٹے بعد وہ ایک پسماندہ سی کچی بستی پہنچا، وہ سیدھا ایک جوئے خانے میں پہنچا جو بظاہر ایک چھپر نما گندے سے ہوٹل پر مشتمل تھا، وہاں ''دغل'' پر موجود دو آدمیوں نے پرویز کو پہچان لیا، وہ اس کے چڑھے ہوئے تیوروں کو بھانپتے ہوئے جارحانہ انداز میں پرویز کی طرف بڑھے، ساتھ ہی انہوں نے اپنی شلوار کے نیفوں سے گراری دار چاقو نکال لئے تھے...... وہاں موجود دیگر اوباش لوگ صورت حال کی نزاکت بھانپ کر کنی کترانے لگے، ادھر پرویز ان دونوں کو چاقو ہاتھ میں تولتے ہوئے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر یکدم ٹھٹک کر رک گیا اور پھر قہر بار نظروں سے دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''کہاں ہے وہ کمینہ

دلدار......!؟''

''استاد کا نام تمیز سے لو ورنہ......!'' دلدار کے ایک گرگے نے زہر خند لہجے میں کہا تو پرویز نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر زور سے لات رسید کر دی...... چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا، دوسرا چاقو تولتا ہوا غرا کر پرویز پر جھپٹا...... پرویز نے ذرا سنبھل کر اس کے چہرے پر لات رسید کر دی، وہ بلبلا کر پیچھے الٹ گیا...... پرویز اس وقت ہر قسم کے نتائج سے عاری اور بے پروا تھا مگر ادھر ان دونوں بدمعاشوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور بیک وقت خونخوار کتوں کی طرح اس پر جھپٹے...... اس بار پرویز نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا ایک کی ناک پر رسید کر دیا جہاں سے خون کا پرنالہ پھوٹ پڑا مگر پھر جب پرویز نے دوسرے کے سینے پر اپنی لات رسید کرنی چاہی تو وہ بھی اس مرتبہ محتاط ہو کر کمال پھرتی سے پرویز کی اپنے سینے کی طرف اٹھی ہوئی لات کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اسے بل دینے کی کوشش کرنے لگا مگر پرویز بھی انہی کے قبیل کا آدمی تھا چنانچہ وہ فوراً اپنی زمین پر ٹکی ایک ٹانگ کے سہارے زور سے اچھلا اور دوسری ٹانگ کی بھرپور ضرب مدمقابل کے چہرے پہ رسید کر دی...... اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی اور وہ عقب میں لڑکھڑاتا ہوا گرتا چلا گیا۔

پرویز کی ٹانگ آزاد ہوتے ہی وہ پہلے والے مدمقابل کی طرف متوجہ ہوا، جس نے اپنی خون آلود ناک کی پروا کیے بغیر دوبارہ پرویز پر حملہ کرنے کی جرأت کی اور قریب رکھی ایک کرسی اٹھا کر پرویز پر دے ماری، پرویز فوراً نیچے جھک گیا، کرسی وہاں بچھی ایک بدوضع سی چوبی میز پر ٹوٹ کر گر پڑی، باقی لوگ ارد گرد دم سادھے کھڑے یہ جنگ دیکھنے میں محو تھے، ان سب کے چہروں سے عجیب طرح کا اشتیاق جھلک رہا تھا، اس اثناء میں وہ دونوں مدمقابل سنبھل کر کھڑے ہو چکے تھے اور پرویز کو بڑی کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ پرویز نے جس مدمقابل کی ناک کی تواضع کی تھی، اس کی مضروب ناک سے بھل بھل بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو خوفناک بنا دیا تھا مگر پرویز مثل آتش فشاں بھبک رہا تھا، اپنے دشمن دلدار کے ان دونوں غنڈوں کی حیثیت اس کے سامنے ادنیٰ چیلوں سے بڑھ کر نہ تھی لہٰذا جیسے ہی وہ دونوں غنڈے پرویز کو پچھاڑنے کے لیے اس کی طرف لپکے، پرویز نے ایک کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ لی اور اسے گھما کر دوسرے مدمقابل پر دے مارا مگر دوسرا بھی کائیاں تھا، اس نے خود کو بچاتے ہوئے بہ سرعت گھونسا پرویز کے جبڑے پر رسید کر دیا صرف ایک ثانیے کے لیے پرویز کا دماغ جھنجنا سا گیا تب اس کے اندر کا لاوا جیسے ابل پڑا، اس نے دوسرے مدمقابل کی اس مہم جوئی کا مزہ چکھانے کے لیے اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پیٹ پر لات رسید کر دی، مدمقابل کے حلق سے اذیت ناک چیخیں بلند ہو گئیں اور وہ فرش پر پڑا مارے درد کے اینٹھنے لگا...... پہلے والے نے میدان چھوڑ کر بھاگنا چاہا تو پرویز نے اسے دبوچ لیا، ٹھیک اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی، پرویز کو گولی کی جان لیوا جھپک بالکل اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی محسوس ہوئی، وہ ذرا ٹھٹک گیا، سامنے دلدار ہاتھ میں ایک خوفناک سیاہ ٹی ٹی پستول پکڑے اس کی جانب قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا، پرویز نے فوراً اپنے مدمقابل اور اس کے بھگوڑے گرگے کو جھپٹ کر اپنی ڈھال بنا لیا۔

''پرویز...... ! میرے ساتھی کو چھوڑ دے ورنہ تیری لاش بھی ادھر نظر نہیں آئے گی۔'' دلدار خونخوار لہجے میں پرویز کو گھورتے ہوئے بولا۔

پرویز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرجدار لہجے میں بولا۔ ''سور کے بچے...... ! میں تیرا خون پی جاؤں گا، تو نے میرے گھر قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی......؟''

اس کی بات سن کر دلدار کے بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ ہنسی ابلی اور وہ ٹی ٹی پستول والا ہاتھ لہراتے ہوئے چند قدم آگے بڑھا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''تیرے سر پر اپنی نئی نویلی بیوی کا کچھ زیادہ ہی عشق سوار ہو گیا تھا کہ تُو ہمیں بھی بھول گیا۔''

''بکواس بند کر کتے ورنہ......؟'' پرویز زہرناک لہجے میں مشتعل ہو کر چلایا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گرفت میں پکڑے ہوئے دلدار کے گماشتے کو اس پر اچھال دیا اور ساتھ ہی خود بھی بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور دلدار پر چھلانگ لگا دی۔ پرویز، دلدار کو اپنے ساتھ رگیدتا ہوا کرسیوں اور میزوں سے الجھتا ہوا فرش پر گرا ساتھ ہی دلدار کے ہاتھ سے پستول بھی نکل کر دور تک پھسلتا ہوا چلا گیا۔

دلدار نے کمر کے بل زمین پر گرتے ہی اپنے دونوں گھٹنے سکیٹر کر پرویز کے پیٹ پر جمائے اور اسے دور اچھال دیا اور پھرتی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہی اس نے قریب دھری کرسی اٹھا لی۔ ادھر پرویز نے جیسے ہی کھڑے ہونے کی کوشش کی، دلدار نے تاک کر کرسی اس کے سر پر دے ماری...... پرویز کو اپنا سر چٹختا محسوس ہوا اور ایک ثانیے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچ گئے...... دلدار اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر وحشی درندے کی طرح اس پر پل پڑا اور پرویز کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی...... پرویز کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور پھر جیسے ہی اس نے اپنے خون کا ذائقہ چکھا تو پھر وہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا، اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح گردش کرنے لگا اور وہ غراتا ہوا دلدار کے ساتھ لپٹ گیا پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنی دائنی ٹانگ کا گھٹنا اس کے

پیٹ پر رسید کر دیا...... یہ وار دلدار کے لیے ضرب شدید ثابت ہوا، اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ ابھری تو پرویز نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کی ناک پر بھی ٹکر رسید کر دی...... یہ اس کا مخصوص وار تھا کیونکہ وہ جس انداز سے اپنے مدمقابل کی ناک پر سر کی ٹکر رسید کرتا تھا، اس میں اس کی ناک کا بانسہ سرک کر مدمقابل کا چہرہ ہی بگاڑ دیتا تھا اور ساتھ ہی نہ ختم ہونے والے خون کا پرنالہ جاری ہو جاتا...... اپنے اس مخصوص وار سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دلدار کے ایک گماشتے کو لمبا لٹا چکا تھا مگر دلدار، پرویز کی توقع کے برخلاف سخت جان ثابت ہوا تھا...... وہ اپنی مضروب ناک کی پروا کیے بغیر وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے پرویز کو آگے کی طرف دھکیلتا چلا گیا اور پرویز کی کمر ایک میز کے کونے سے جا ٹکرائی، پرویز کے حلق سے تکلیف کی شدت سے کراہ خارج ہو گئی...... اسے لمحہ بھر کو بے بس پا کر دلدار اس سے الگ ہو گیا، اس اثناء میں دلدار کے دوسرے چار پانچ ڈشکرے بھی جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو کر اس کی مدد کو آ گئے اور دلدار کا اشارہ پاتے ہی ان سب نے مل کر پرویز کو دبوچ لیا اور اس پر لاتوں، مکوں کی بارش کر دی...... پرویز نڈھال ہو کر بے دم سا فرش پر گر گیا، اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

☆======☆======☆

ماسی کی اطلاع پر ڈاکٹر فوزیہ اسی وقت اسے اپنے ساتھ لے کر آندھی طوفان کی طرح میٹرنٹی ہوم پہنچی تھی جہاں سدھوراں کو داخل کیا گیا تھا، وہاں کی لیڈی ڈاکٹر آسیہ نے جب ڈاکٹر فوزیہ کو یہ خوشخبری سنائی کہ سدھوراں کو اللہ نے چاند سا بیٹا دیا ہے، اب زچہ بچہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں تو اسی وقت ڈاکٹر فوزیہ نے ساری پیمنٹ اپنے ذمے لے لی اور سدھوراں کے کمرے میں آ گئی...... وہاں دودھ والے پہلوان جی اور ان کی بیوی پہلے سے موجود تھے، سدھوراں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں ایک ننھا منا وجود ہمک رہا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو بہنوں کی طرح چاہنے لگی تھی...... اسے اب ماں کے روپ میں دیکھ کر بے اختیار سدھوراں پر پیار آ گیا۔ سدھوراں بھی ڈاکٹر فوزیہ کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''بب...... باجی...... آ...... آپ......؟'' سدھوراں کے ہونٹ لرزے اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں...... وہ کہنیوں کے بل اٹھنے لگی تو فوزیہ یکدم آگے بڑھ کر اس سے جا لگی۔

''سدھوراں...... ! تُو ٹھیک تو ہے نا...... یہ کیا ہے......؟'' فوزیہ نے مسرت بھرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انداز میں پوچھا اور پھر بچے کو پیار کرنے لگی اور بولی۔ ''کیا نام رکھا ہے اس منے سے شیطان کا......؟''

سدھوراں نے ممتا بھری نگاہوں سے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے اپنے بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ابھی تو اس کا نام نہیں رکھا باجی......! آپ خود ہی اس کا نام رکھ لیں۔''

''اچھا بھئی! اس کا نام آج سے احمد علی ہے۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے کہا اور پھر پوچھا۔ ''ارے بھئی کسی نے اس کے کان میں اذان بھی دی ہے؟''

اس کی بات سن کر پاس ہی کرسی پر براجمان پہلوان جی نے خوشدلی کے ساتھ کہا۔ ''آہو جی بہن جی......! میں نے ہی سب سے پہلے اس کے کان میں اذان دی تھی۔''

''باجی......! بھائی پہلوان جی اور بھابی کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے، میں اکیلی تھی، یہ دونوں ہی فرشتہ صفت یہاں موجود رہے۔'' سدھوراں نے ممنون نگاہوں سے پہلوان جی اور ان کی فربہ اندام بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

پہلوان جی کی بیوی یکدم بولی۔ ''ارے بہن......! احسان کی کیا بات ہے، تجھے میں نے اپنی بہن کہا ہے تو سمجھا بھی ہے۔''

پھر ڈاکٹر فوزیہ کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا، اس نے سدھوراں سے پرویز کے بارے میں پوچھا تو اچانک سدھوراں کے چہرے پر اداسی کے ساتھ پریشانی کے تاثرات بھی پھیل گئے مگر وہ پہلوان جی اور اس کے بیوی کی موجودگی کی وجہ سے کچھ بتانے سے کترانے لگی۔

تب پھر پہلوان جی نے اچانک بتایا۔ ''میں نے سنا ہے پرویز کے ہوٹل پر پولیس کا چھاپہ پڑا تھا...... سدھوراں! تُو ہی کچھ بتا، آخر پرویز ہے کدھر......؟ اگر خدانخواستہ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا ہے تو ہم اسے چھڑانے کی کوشش کریں گے۔''

پہلوان کی بات سن کر سدھوراں نے سوچا کہ اب ان سے کچھ چھپانا مناسب نہیں تب پھر اس نے پرویز سے متعلق ان سب کو مختصراً آگاہ کردیا۔ وہ سب، بالخصوص ڈاکٹر فوزیہ پریشان ہوگئی پھر چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد پہلوان جی کو مخاطب کر کے بولی۔ ''پہلوان جی......! آپ ایک اور احسان کردیں اس بیچاری پر......!''

''اوہو...... بہن جی......! یہ غیریت والی باتیں کیوں کر رہی ہیں...... پرویز تو میرا یار ہے...... احسان کیسا؟''

''پہلوان جی......! آپ سے اگر ہو سکے تو پرویز کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں ویسے میں بھی انسپکٹر مشتاق احمد سے بات کروں گی، اگر خدانخواستہ پرویز شہر کے کسی بھی

نے میں ہوگا تو اس کے لیے کچھ کیا جا سکے گا۔''

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر سدھوراں کے پژمردہ پڑتے چہرے پر امید بھری خوشی کے اثرات اُمڈ آئے اور وہ حوصلہ پکڑتے ہوئے فوزیہ سے بولی۔ ''باجی......! پرویز برا ضرور تھا مگر اب اس نے ہر برائی سے توبہ کرلی ہے...... اسے اب اس کے برے ساتھیوں نے ہی اس توبہ کی سزا دی ہے۔''

''ہاں...... ہاں میں سمجھ رہی ہوں سدھوراں......! تم پریشان مت ہو۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اسے تسلی دی اور پہلوان جی سے دوبارہ مخاطب ہوکر بولی۔ ''پہلوان جی......! آپ پہلے اپنے طور پر پرویز بھائی کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں پھر مجھے گھر پر اطلاع دے دینا، اس کے بعد میں بھی کچھ کروں گی، ویسے آپ دونوں کافی تھک چکے ہوں گے، اگر گھر جانا چاہیں تو......!''

''اونا جی نا......! ہم کوئی تھکے وکے نہیں۔'' پہلوان جی نے مخصوص لہجے میں کہا۔

اچانک لیڈی ڈاکٹر آسیہ ایک نرس کے ساتھ اندر داخل ہوئیں اور خلیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ سدھوراں کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیسی ہو سدھوراں......؟''

''جی ڈاکٹرنی صاحبہ......! ٹھیک ہوں۔''

''بچے کو دودھ پلا رہی ہو اپنا......؟''

''جی ڈاکٹرنی صاحبہ......!''

''شاباش......! اسے صرف اور صرف اپنا ہی دودھ پلانا کیونکہ ماں کا دودھ نوزائیدہ بچے کے لیے غذا بھی ہے اور دوا بھی......!'' یہ کہہ کر ڈاکٹر آسیہ نے سدھوراں کا تفصیلی معائنہ کیا پھر ڈاکٹر فوزیہ سے کہا۔ ''زچہ، بچہ دونوں ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہیں...... اگر آپ انہیں گھر لے جانا چاہیں تو لے جا سکتی ہیں۔''

''بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ آپ کا......! ہم بھی یہی چاہ رہے تھے کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے ڈاکٹر آسیہ کا شکریہ ادا کیا اور وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

سدھوراں کو اسی وقت وہاں سے ڈسچارج کر دیا، ڈاکٹر فوزیہ، سدھوراں کو اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی مگر سدھوراں، ڈاکٹر فوزیہ پر مزید بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی، اس نے اپنے گھر جانے کو کہا تو ڈاکٹر فوزیہ نے اسے پیار سے جھڑک دیا اور پھر زبردستی اسے ساتھ لئے کار میں آ بیٹھی...... پہلوان جی اور ان کی بیوی بھی آ بیٹھے...... پھر یہ سب لوگ وہاں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روانہ ہوگئے۔

☆======☆======☆

وہ مختصر سا نخلِ کھجوروں اور بوہ کی کانٹے دار جھاڑیوں پر مشتمل تھا، قریب ہی ایک برساتی ٹوبہ بھی تھا جو خشک تھا، سارنگ ان سب کو لئے تین چار باہم جڑے ہوئے تنوں والے کھجور کے درختوں کے سائے میں آ گیا، اس نے سانڈنی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا پھر یہ لوگ ریت پر ایک کپڑا بچھا کر بھنے ہوئے چنے کھانے لگے، ریت پر گری ہوئی کھجوریں فریدو نے اکٹھی کی تھیں۔ بھابی اللہ وسائی اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی، سارنگ تھوڑا بہت کھا پی چکنے کے بعد وہاں سے اٹھا اور اپنی آنکھوں پر اپنے ایک ہاتھ کا چھجا بنا کر دور تپتے ہوئے لق و دق ریگزار کو تکنے لگا، اس مختصر سے قافلے کے خاکستری چہرے والے نے اسے سرحد کی طرف کا جو راستہ ذہن نشین کروایا تھا، اس حساب سے سارنگ بالکل ٹھیک سمت پر سفر کر رہا تھا...... اس خاکستری چہرے والے نے اسے سرحد تک رہنمائی کے سلسلے میں سب سے بڑی نشانی اپنے قافلے کے نقشِ پا کی دی تھی کیونکہ وہ لوگ بھی سرحد کے کسی قریبی گاؤں سے آرہے تھے۔

سارنگ کا اب ارادہ شام ہونے کے ساتھ ہی آگے نکلنے کا تھا چنانچہ اس نے شام تک ذرا آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر یہ سب لوگ وہیں لیٹ گئے مگر سونے سے قبل سارنگ، سانڈنی کو ایک درخت سے باندھنا نہیں بھولا تھا...... وہ سب کھجوروں کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں سوگئے۔

وقت دبے پاؤں سرکتا رہا، آگ اگلتا سورج سوا نیزے پر پہنچ کر اب تھکے ماندے پنچھی کی طرح مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا، چہار سو سناٹے دار صحرائی ویرانہ پھیلا ہوا تھا پھر دھیرے دھیرے سورج کی پُرتپش کندنی کرنیں سنہری پڑنے لگیں، دن بھر چلنے والی بادِ سموم بھی معتدل ہونے لگی تھی پھر جب سورج کی لال ٹکیہ دور مغربی ٹیلوں کے عقب میں لڑھکنے لگی تو چہار سو اندھیرا پھیلنے لگا۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب انسان سونے سے پہلے اپنے دل میں یہ تہیہ کر کے لیٹے کہ میں نے صرف چند گھنٹے نیند لینی ہے یا فلاں وقت جاگنا ہے تو عموماً وہ متعین کردہ وقت پر جاگ پڑتا ہے، یہی کچھ سارنگ بھی کر کے سویا تھا چنانچہ جیسے ہی شام گہری ہونے لگی تو سارنگ کی آنکھ کھل گئی...... جاگتے ہی اس نے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی بیدار کیا اور

ایک بار پھر یہ سب لوگ سانڈنی پر سوار ہو کر منزل کی جانب گامزن ہوگئے۔

جانے کیوں منزل کے قریب پہنچنے کے احساس کے ساتھ ہی سارنگ کے دل و دماغ میں انجانے اور پُرتشویش وسوسے صحرائی بچھو کی طرح اندر ہی اندر ڈنک مارنے لگے...... سارنگ کو بار بار انڈین سیکورٹی فورسز کی طرف سے خطرہ لاحق تھا، وہ اس سنگین حقیقت سے خوبی واقف تھا کہ اس نے انڈین سیکورٹی والوں کے ایک اہلکار کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا، اگرچہ ایسا اس نے اپنے دفاع میں کیا تھا کیونکہ اسے بے گناہ پاکستانی جاسوس ہونے کا مجرم ٹھہرایا جا رہا تھا...... اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے ساری عمر بھارتی فورسز کی اذیت گاہوں میں ناکردہ جرم کی سزا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھگتنا پڑتی۔

سارنگ کی کامیابی کے لیے یہ آخری اور فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ وہ بخیر و عافیت بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو یہاں سے نکال لے جائے۔ وہ سانڈنی کو اب دوڑا نہیں رہا تھا کیونکہ وہ کسی قسم کی بھگدڑ مچائے بغیر اس ''ڈینجر زون'' سے نکل جانا چاہتا تھا۔ آسمان صاف اور روشن ہو چکا تھا، ٹمٹماتے تاروں کی یلغار سمیت طباق چاند کی طلسماتی روشنی چہار سو چٹکی ہوئی تھی۔

معاً سارنگ کو روشن چاندنی میں سامنے خاردار آہنی تار کی باڑ نظر آئی، اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا، اس خاردار آہنی باڑ کو دیکھ کر اس کے ذہنِ رسا نے فوراً یہ اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے ملک کی سرحد کے اب بالکل قریب پہنچ چکا ہے کیونکہ اس باڑ کے بعد فری زون شروع ہوتا تھا...... خاردار باڑ زیادہ اونچی نہیں تھی مگر بہر حال اسے سانڈنی سمیت پار کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے اس نے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو سانڈنی سے اترنے کو کہا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا پھر سب سے پہلے اس نے بمشکل بھابی اللہ وسائی کو باڑ پار کروائی پھر فریدو کو اس کے بعد جب سانڈنی کو باڑ پار کروانے لگا تو اس کے کھر آہنی تاروں میں الجھ گئے۔ اس مقام سے ٹھیک بائیں طرف شمال کی سمت لگ بھگ دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز کی بیرک کے ٹرانسمیشن روم میں دائیں بائیں پانچ میل کے دائرے میں عمل پذیر رہنے والی لاسلکی لہروں نے آہنی خاردار کی بازگشت سے سیکورٹی والوں کو خبردار کر دیا بس پھر کیا تھا، آناً فاناً وہاں موجود انڈین آفیسر نے اپنے پانچ عدد اہلکاروں کو ساتھ لیا اور پھر یہ سب لوگ ایک تیز رفتار چوڑے ٹائروں والی فوجی جیپ میں سوار ہو کر مطلوبہ سمت کی طرف روانہ ہوگئے۔

ادھر سارنگ اس سنگین خطرے سے بے نیاز بھاری بھرکم سانڈنی کے خاردار تاروں میں پھنسے ہوئے کھروں کو نکالنے میں مصروف تھا کہ اچانک سیکورٹی والوں کی جیپ اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سر پر پہنچ گئی ...... سارنگ ایک لمحے کو اپنی جگہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔

''ہالٹ ...... !'' سارنگ پر نظر پڑتے ہی انڈین اہلکار بڑی پھرتی کے ساتھ جیپ سے کود کر گنیں تانے اس کے قریب آگئے، انڈین آفیسر نے سارنگ کو فوراً پہچان لیا اور چلا کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''خبردار ...... ! یہ جانے نہ پائے ...... یہ وہی ہے جو ہمارے ایک آدمی اشوک کو قتل کر کے بھاگا تھا۔''

سارنگ نے یہ سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، باڑ کی دوسری طرف موجود بےچاری بھابی اللہ وسائی اور فریدو بھی خوف زدہ ہو گئے، انڈین آفیسر کے لہجے کو سارنگ پہچان چکا تھا۔

اس کے بعد کا قصہ مختصر عرصے میں نمٹا لیا گیا اور ان سب کو گرفتار کر کے بیرک میں لایا گیا۔ اب سارنگ ہی نہیں بلکہ بھابی اللہ وسائی اور فریدو سب ہی سنگین حالات کا شکار تھے، سارنگ کی پریشانی اور تشویش یہ سوچ سوچ کر فزوں تر ہو رہی تھی کہ اب تو اسے اپنی صفائی پیش کیے بغیر تختہ دار پر چڑھا دیا جائے گا پھر بھابی اللہ وسائی، اس کے گود کے ہمکتے ہوئے بچے اور فریدو کا کیا بنے گا ...... ؟ مایوسی نے پوری طرح سارنگ کو دل گرفتہ اور شکست خوردہ سا کر دیا تھا۔ ادھر وہ سفاک اور خرانٹ انڈین آفیسر پہلے ہی اس پر ادھار کھائے بیٹھا تھا کیونکہ سارنگ اس کے ایک ماتحت اشوک کو قتل کرنے کے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔

''ہوں ...... ! اب تو تمہارے پاکستانی جاسوس ہونے میں شبہ نہیں رہا ...... اب تم اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی بتاؤ گے۔'' خرانٹ انڈین آفیسر نے سارنگ سے غراتے ہوئے پوچھا۔ اسے کمرے کے وسط میں ایک اسٹول نما کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔

''میرے ساتھی تم نے دیکھ ہی لیے ہیں آفیسر ...... ! ایک مصیبتوں کی ماری عورت، اس کا نومولود بچہ اور ایک گیارہ سالہ لڑکا ...... !'' سارنگ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تو تم اب بھی انکاری ہو کہ تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو ...... ؟''

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم آخر مجھے زبردستی پاکستانی جاسوس بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہو ...... ؟'' بالآخر سارنگ نے اس بار تلخ لہجے میں کہا تو وہ خرانٹ آفیسر یکدم ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے فوجی بوٹ سارنگ کے چہرے پر رسید کر دیا ...... سارنگ کے حلق سے اذیت ناک چیخ خارج ہو گئی وہ پیچھے الٹ گیا، اسٹول زمین کے ساتھ نصب تھا ...... انڈین آفیسر نے خونخواری کے ساتھ سارنگ کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور

اس کی آنکھوں میں گھورتا ہوا ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''تم نے ہمارے چار اہلکاروں کے ساتھ جنگ کی پھر ایک کو قتل کر کے ان کی جیپ لے کر فرار ہو گئے ...... یہ کارنامہ کسی عام یا معمولی آدمی کا نہیں ہو سکتا ...... ایسا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہی کر سکتا ہے ...... کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟''

''میں ...... میں ...... سچ کہہ رہا ہوں ...... !'' سارنگ نے بمشکل ہانپتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

انڈین آفیسر نے ایک گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارے لیے حتمی احکامات مجھے اوپر سے لینے ہی پڑیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے وہاں موجود اپنے دیگر اہلکاروں کو مخصوص اشارہ کیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا ...... اس کے کمرے سے نکلتے ہی سارنگ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بیدردی سے کونے میں ڈال دیا گیا اور جب وہ جانے لگے تو سارنگ نے جنونی انداز میں چیختے ہوئے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کے بارے میں پوچھا مگر وہ لوگ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

سارنگ بے بسی کے عالم میں اپنا سر پٹختا رہ گیا، مایوسی اور تفکر نے مل کر اسے نڈھال سا کر دیا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی منتشر اور پریشان کن کیفیات پر قابو پا لیا اور اللہ سے دعا مانگنے لگا۔ اللہ کا ذکر کرنے کے دوران اس کے اندر قدرتی طور پر ہمت جاگنا شروع ہوئی اور اسے یقین کامل ہونے لگا کہ اللہ نے جہاں اسے اب تک ایسی کٹھن مشکلوں سے نکالا تھا، وہی آئندہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا ...... بس ذرا ہمت، حوصلے اور جرأت سے کام لینا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے مفر کی راہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ...... اس کے کانوں میں اب بار بار اس سفاک انڈین آفیسر کے زہر خند الفاظ گونجنے لگے جس نے جاتے سمے دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا۔ ''اس کے بارے میں اب اسے اوپر والوں سے احکامات لینے پڑیں گے۔'' جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ خبیث آفیسر اب سارنگ کی زندگی اور موت کا فیصلہ ادھر ہی کرنا چاہتا تھا۔ سارنگ کو اپنی بھابی اللہ وسائی اور فریدو کی فکر ستانے لگی کہ جانے ان خبیثوں نے ان بےچاروں کو کہاں قید کر رکھا تھا۔ سارنگ کی ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ اس بار اس کے ہاتھ، پاؤں آہنی زنجیروں سے جکڑ دیئے گئے تھے اور وہ گٹھڑی سا بنا ہوا تھا، اس حالت میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا ...... اس عقوبت خانے میں صرف ایک یرقان زدہ بلب روشن تھا، بوسیدہ سے فرش کے وسط میں نصب آہنی اسٹول اور خود اس کے علاوہ باقی ہر چیز سے عاری یہ عقوبت خانہ اور بھی بھیانک

محسوس ہو رہا تھا، باہر رات دبے پاؤں بیت رہی تھی اور سارنگ کو گٹھڑی بنے اسی حالت میں جانے کتنے گھنٹے بیت گئے...... کمرے میں روشن دان کے نام پر صرف ایک چوکور سا روزن بنا ہوا تھا جہاں سے ٹمٹماتے ہوئے تاریک آسمان کا مقدور بھر منظر نظر آ رہا تھا۔ نیند تو سولی پر بھی آ جانے کے مصداق سارنگ وہیں ایک کونے میں گٹھڑی بنا سو گیا۔

ایک کھڑکے سے وہ جاگا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو گن بردار باوردی انڈین اہلکار ملک الموت کی طرح اس کے سر پر کھڑے تھے...... کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے آنے والے دن کے اجالے سے سارنگ کو احساس ہوا کہ صبح ہو چکی تھی۔ ایک اہلکار نے ہاتھوں میں بدوضع سی ٹرے تھام رکھی تھی اور اس کی کمر سے مشین گن کی سیاہ نالی جھانک رہی تھی جبکہ دوسرا اپنے ہاتھوں میں گن تھامے اس کی نال کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا تھا...... پہلے والے نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹرے سارنگ کے قریب زمین پر رکھی پھر وہ سارنگ کے بند کھولنے لگا...... سارنگ کو اگرچہ اس موقع کا انتظار تھا مگر وہ بیک وقت ان دونوں مسلح اہلکاروں سے بھڑنے کا خیال بھی دل میں لانے سے کترا رہا تھا لیکن جب اس کے سارے جکڑ بند کھول کر اسے ایک اہلکار نے پُرغرور اور نخوت بھرے انداز میں یہ بتایا۔ ''اوپر والوں نے اسے فائرنگ اسکواڈ کے آگے پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔'' تو پھر سارنگ نے کرو یا مرجاؤ کے اصول پر ہر ممکن خود کو بچانے کی کوشش کا مصمم ارادہ کر لیا۔

وہ ٹرے کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے وجود میں لہو رنگ سناٹے اترے ہوئے تھے...... وہ دونوں اہلکار وہاں سے جانے لگے...... سارنگ نے زمین پر بیٹھے بیٹھے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اچانک اس کی رگوں میں پارہ دوڑ گیا...... وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت میں آیا اور انجام سے یکسر غافل ہو کر دروازے کے آگے پیچھے بڑھتے ہوئے دونوں اہلکاروں میں سے پیچھے والے پر سارنگ چیتے کی طرح جھپٹا اور آنِ واحد میں اس کی کمر سے جھولتی ہوئی گن اپنے قبضے میں کرتے ہی اسے زور سے دھکا دیا، وہ اپنے آگے والے مسلح ساتھی سے جا ٹکرایا...... پھر جب تک دونوں سنبھلتے، سارنگ نے خودکار مشین گن کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے لبلبی دبا دی...... برسٹ چلنے کی خوفناک آواز گونجی اور وہ دونوں اہلکار کریہہ چیخوں کے ساتھ زمین پر گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگے۔

سارنگ پھرتی کے ساتھ ان لاشوں سے چھلانگیں لگاتا ہوا ایک مختصر سی ویران راہداری میں آ گیا اور سیدھا دوڑتا چلا گیا تب اچانک اس نے دیکھا، سامنے وسیع ہال تھا اور آٹھ دس کے لگ بھگ باوردی انڈین اہلکار گنیں تھامے اس کی طرف آ رہے تھے مگر سارنگ نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ان پر اوپر تلے برسٹ فائر کر دیئے...... نصف سے زائد اہلکار دلخراش چیخوں کے ساتھ تیورا کر گرے اور باقی چند بچے کھچے اہلکار دیوار کے ساتھ چپک گئے اور انہوں نے نے بیک وقت سارنگ پر فائر کھول دیا۔

سارنگ نے بمشکل خود کو اندھا دھند فائرنگ کی زد سے بچایا اور راہداری کی اندرونی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا، وہ دشمنوں کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر بدستور انہیں حملے کی زد پر رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے دوبارہ ان پر فائر کھول دیا...... اس وقت اندر سائرن بج اٹھا...... سارنگ کو امید تھی کہ اس دور افتادہ اور مختصر سی چوکی میں زیادہ نفری نہ ہوگی...... اس کے دوسرے حملے نے دو چار کو مزید گرا دیا جبکہ ایک نے بھاگنے کی کوشش کی تو سارنگ نے اسے پکڑ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ سارنگ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا، اچانک سامنے کی راہداری میں بھاری بوٹوں کی چاپ ابھری...... سارنگ نے زخمی اہلکار کی گن چھین کر اسے لاشوں کی طرف دھکیل دیا پھر ایک گن اس نے کمر سے لگائی اور دوسری ہاتھ میں پکڑ لی...... راہداری میں تین اہلکار نمودار ہوئے، ان میں ایک وہی سفاک انڈین آفیسر تھا جسے دیکھ کر سارنگ کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ ان تینوں کو اپنی گن کے نشانے کی زد میں لیتا، ان تینوں نے سارنگ پر تڑاتڑ گولیاں برسا دیں...... سارنگ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

☆======☆======☆

ملوکاں اور سانول کی شادی کی تاریخ اٹھارہ دن بعد طے کر دی گئی تھی، چاچا سکھیو کی بیوہ سے بات کرنے کے بعد اگرچہ ماما اللہ رکھیو مطمئن تو ہو گیا تھا مگر ابھی اس نے ایک آخری مشورہ اپنے چہیتے بھانجے سانول سے بھی کرنا تھا چنانچہ وہ سکھیو کی بیوہ سے ملنے کے بعد واپس اپنے گھر پہنچا اور سانول سے کہا۔ ''پٹ......! تیرے سے ایک بات کرنی تھی۔''

''ہاں ماما......! سن رہا ہوں۔''

''پٹ......! میں تیرے بیاہ کی تاریخ پکی کر آیا ہوں، بس چٹ منگنی پٹ بیاہ...... اٹھارہ دن بعد......!''

''ٹھیک ہے ماما......! جیسے تیری مرضی، میں نے کب انکار کیا ہے۔'' سانول نے بےتاثر لہجے میں کہا۔

''دیکھ پٹ......! میں تجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ماما اللہ رکھیو نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہا پھر سانول کی مستفسرانہ خاموشی پر وہ آگے بولا۔ ''بھا سکھیو کو اللہ سائیں جنت نصیب کرے، اس کے گزر جانے کے بعد سے اس کی بیوہ اور بیٹی بالکل بے سہارا رہ گئی ہیں ہر ملوکاں کی شادی کے بعد وہ دونوں عورتیں اور بھی تنہا رہ جائیں گی...... میں چاہتا تھا کہ ملوکاں سے شادی کرنے کے بعد تو ان دونوں، دھیوں کا سہارا بن کر ان کے ساتھ رہے تو یہ بڑا ثواب کا کام ہوگا۔''

ماما اللہ رکھیو کی بات سن کر سانول یکدم پریشان سا نظر آنے لگا...... یوں تو وہ اپنے ماما کی کوئی بات مشکل ہی سے ٹالتا تھا مگر یہ بات اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی، وہ بولا۔

''ماما...... ! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''اس میں بھلا ہونے کو کیا ہے پٹ...... !'' ماما نے کہا۔ ''میں نے سیدھی سی بات تیرے سامنے رکھی ہے۔''

''پر ماما...... ! تُو بھی تو اکیلا رہ جائے گا؟''

''اڑے تو میری فکر کیوں کرتا ہے، میں تیرے سے دور تھوڑی ہوں، ایک ہی گوٹھ میں تو ہم رہتے ہیں...... اب ایسا بھی نہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں۔'' ماما نے اس کی ہمت بندھائی۔

''ماما...... ! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ملوکاں کی چاچی اور میراں ادھر ہی ہمارے پاس آکر رہیں؟'' سانول نے جیسے مفر کی آخری راہ ڈھونڈی۔

''میں نے یہ کہا تھا سکھیو کی بیوہ سے پر اسے یہ منظور نہیں، ویسے اس کی بات درست ہے، تیرا وہاں رہنا تو سمجھ میں آتا ہے پر ان کا یہاں رہنا نہیں...... ویسے بھی تُو اور ملوکاں اس کے مرحوم باپ کی جھگی میں رہو گے، تھوڑے پیسے ہو جائیں گے تو دونوں جھگیوں کو ملا کر پکی دیواریں کھڑی کر کے کچا ہی گھر بنالیں گے۔'' ماما کی بات سن کر سانول چپ ہو رہا۔

☆======☆======☆

آچر خان نے خالقو اور سانول کے خلاف جو خفیہ سازش تیار کی تھی، اسے حتمی شکل دینے کے لیے اس نے اپنے ایک خاص گماشتے بہرام کو بلایا تھا۔ بہرام ماضی میں ایک بدنام اور خطرناک ڈاکو رہ چکا تھا، جس نے دادو اور سیہون کے علاقے میں خاصی دہشت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا، وہ بہرو دھاڑیل کے نام سے مشہور تھا پھر گزشتہ دنوں ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کلین اپ کی وجہ سے زائد خطرناک ڈاکوؤں کے ٹولوں کا قلع قمع کر

دیا گیا تو بہرو روپوش ہوگیا تھا۔ ٹھٹھہ کے اندرونی علاقے میں بہرام بن کر رہنے لگا تھا، اس کے گروہ کا بھی قلع قمع کر دیا گیا تھا، اگرچہ پولیس اب بھی اس کی تلاش میں تھی مگر چونکہ وہ ایک عرصے سے وارداتوں کا سلسلہ موقوف کر کے بظاہر شریفانہ زندگی گزار رہا تھا اس لیے رفتہ رفتہ پولیس اسے فراموش کرنے لگی تھی، اب وہ ٹھٹھہ میں ہی ایک بااثر وڈیرے کا ملازم بن چکا تھا لیکن جیسا کہ مثل مشہور ہے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اسی لئے بہرو، وڈیرے کی پشت پناہی اور اس کے مفادات کے لیے گاہے بگاہے خفیہ مجرمانہ کارروائیوں میں مصروف رہتا تھا۔

آچر خان کے بلاوے پر وہ فوراً آگیا تھا۔ بہرام چالیس پینتالیس سال کا ایک تنومند شخص تھا، رنگ سانولا تھا، چہرے پر ہلکی داڑھی، مونچھیں جو گھنی ہوا کرتی تھیں، اب باریک کرلی تھیں، اس نے شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی اور کاندھوں پر اجرک...... مٹھی میں بیڑی دبی رہتی تھی۔

''حکم کرو سائیں...... ! بہت دنوں بعد یاد کیا، کسی کو لٹانا ہے تو بولو پر میرا حساب صاف رکھنا پڑے گا۔''

آچر خان اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اڑے تُو کیا سمجھتا ہے کہ میں نے تیرے کو اتنی دور سے مفت میں بلایا ہے...... فکر نہ کر، تیرا حساب میں نے پہلے ہی سے باندھ رکھا ہے۔''

اس کی بات سن کر بہرام کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوگئی، وہ بولا۔ ''کام بتاؤ اب...... !''

''کام شاید مشکل ہے پر تیرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر کرنا جلدی ہے......'' آچر خان لمحہ بھر توقف کے بعد دوبارہ مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ''ایک آدمی ہے تھانے کے لاک اپ سے اسے باہر نکالنا ہے اور بس تیرا کام ختم...... !'' اس کی بات سن کر بہرام کو چپ سی لگ گئی۔

''کیوں یارا...... ! چپ کیوں ہوگیا، کوئی ڈسٹرکٹ جیل سے قیدی چھڑانے کا کام تو نہیں لے رہا ہوں میں تجھ سے...... گوٹھ کے تھانے کی کچی دیواروں کے پیچھے ایک قیدی کو باہر نکالنا کیا مشکل ہے تیرے لیے......؟''

''مشکل تو نہیں ہے پر آچر سائیں تُو تو جانتا ہی ہے کہ یہ کام اکیلے کرنے کا نہیں ہے اس کے لیے پورے ٹولے کی ضرورت پڑتی ہے، اور میں اب اکیلا رہ گیا ہوں۔'' بہرام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے عذر تراشا۔

''اڑے یار بہرو......! تُو کیسی باتیں کرتا ہے، تُو خود ایک بڑے گروہ کا سرغنہ رہ چکا ہے، یہ تیرے اکیلے کا ہی کام ہے۔'' یہ کہہ کر آچر خان نے اپنی قمیض کی اندرونی چار جیبوں والی صدری سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور بولا۔ ''پورے بیس ہزار ہیں...... کام کے بعد اتنے ہی اور ملیں گے...... منظور ہے تو بول نہیں تو اور کسی کو دیکھوں؟''

نوٹوں کی ایمان ڈولنے والی جھلک دیکھ کر بہرام کی ساری تاویلیں دھری کی دھری رہ گئیں، وہ جھٹ سے انہیں اپنی جیب میں ڈال کر بولا۔ ''قیدی کا نام بتا......!''

''خالقو......!''

''کس جرم میں سزا کاٹ رہا ہے......؟''

''ابھی اسے سزا تو نہیں ہوئی پر جلد ہی اسے شہر کی بڑی جیل منتقل کیا جانے والا ہے...... ویسے وہ اپنے چاچا کو قتل کرنے کے جرم میں لاک اپ میں ہے۔'' آچر خان نے بتایا۔

''ٹھیک ہے پھر آج رات کو یہ کام ہو جائے گا۔''

''یہ ہوئی ناں یاروں والی بات......!'' آچر خان نے اسے گلے لگا لیا۔

وہ دونوں اس وقت ہوٹل کے ایک اندرونی گوشے میں محوِ گفتگو تھے۔ بہرام وہاں سے نکلا اور سیدھا گوٹھ کے تھانے کی طرف روانہ ہوا تھا، تھانے کے قریب پہنچ کر اس نے اچھی طرح اس کے محلِ وقوع کا جائزہ لیا اور اس کی پولیس نفری کے بارے میں اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ نہیں تھی، تھانے کے عقب میں تین چار رہائشی کوارٹرز بھی تھے جبکہ تھانے کا انچارج انسپکٹر چھتل شاہ اپنے کوارٹر میں ہی رات بسر کرتا تھا اور تھانے کے اندر چند قیدیوں کی وجہ سے رات کو پولیس پہرہ بھی چند ہی افراد پر محمول ہوتا تھا، اپنے طور پر یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے اپنا کام خاصا آسان نظر آنے لگا تھا، اب اسے رات کا انتظار تھا۔

☆======☆======☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی...... ایک سیاہ چادر میں ملفوف سایہ تھانے کی مشرقی دیوار کو پھاند کر اندر کودا...... قریب ہی ایک پولیس کی خستہ حال موبائل پتھروں پر کھڑی تھی، وہ سایہ لپک کر اس کی آڑ میں ہو گیا اور چند ثانیے اس کی آڑ میں دبک کر سامنے عمارت کے

برآمدے کو گھورنے لگا جہاں بیمار سی روشنی پھیلی ہوئی تھی، جب وہاں اسے کوئی ذی نفس گردش کرتا دکھائی نہ دیا تو وہ پُراسرار سایہ جو بلاشبہ بہرام تھا، خستہ حال موبائل کے عقب سے نکلا اور محتاط روی کے ساتھ جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا تھانے کے نیم تاریک برآمدے میں آ گیا، یہاں سامنے ایک سیلن زدہ سی تاریک راہداری تھی جس کے دائیں بائیں سلاخ دار لاک اپ کے دروازے نظر آ رہے تھے باقی راہداری کے سرے پر تین چار کمرے تھے جن پر چقیں جھول رہی تھیں، تھانے میں ویرانی سی مسلط تھی...... کم خطرناک قیدیوں کی وجہ سے شاید تساہل پسند پہرے دار بھی ادھر اُدھر کھسک گئے تھے مگر پھر اچانک بہرام کو دو آدمیوں کے ہنسی ٹھٹے کی آوازیں سنائی دیں، وہ ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، سامنے تاریکی کے بطن سے اسے دو پولیس والے سگریٹ پیتے ہوئے آتے دکھائی دیئے...... ایک کے ہاتھ میں ریڈیو دبا ہوا تھا جس سے مائی بھاگی کے لازوال گیت کے بول ''کھڑی نیم کے نیچے ہوں تو ہیکلی'' ابھر رہے تھے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے قہقہے لگاتے برآمدے کی طرف ہی آ رہے تھے، بہرام نے اندازہ لگایا یہ دونوں شبینہ ڈیوٹی پر تعینات تھے، اسے اپنا کام اور بھی آسان محسوس ہونے لگا، بہرام اپنی جگہ پر دم سادھے بیٹھا اب ان دونوں من موجی سپاہیوں کے کہیں نکلنے کا منتظر تھا پھر وہ دونوں سپاہی کھڑ کھڑاتے بوٹوں کے ساتھ برآمدے کی سیلن زدہ سیڑھیاں چڑھ کر قید خانے والی راہداری میں داخل ہوئے اور دو تین چکر لگانے کے بعد وہیں ایک محرر کے لیے بچھی ہوئی میز اور کرسیوں پر براجمان ہو گئے اور ریڈیو میز پر رکھ کر آواز بڑھا دی...... بہرام شکاری بھیڑیے کی طرح گھات لگائے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا مگر پھر جلدی ہی اسے احساس ہو گیا اسے یہ مناسب وقت خود ہی نکالنا پڑے گا...... یہ سوچ کر اس نے ایک بار پھر تھانے کی اندرونی عمارت اور احاطے کے گرد ایک چکر لگایا، یہ تسلی کرنے کے بعد کہ پورے تھانے میں ان دونوں سپاہیوں کے علاوہ اور کوئی یہاں موجود نہ تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ان دونوں میں سے ایک سپاہی اٹھا اور چق اٹھا کر ایک کمرے کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد باہر آیا تو ہاتھوں میں رلیوں اور چادروں کے بستر دبائے ہوئے تھا، وہ اس نے برآمدے میں بچھا دیئے پھر اندر سے دو بوسیدہ تکیے بھی اٹھا لایا۔

''چل ڑے محمد بخش......! کھاٹ اٹھا لائیں...... آج برآمدے کی بجائے باہر احاطے میں سوتے ہیں، آج بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔'' ایک سپاہی نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''باؤ یار سوہنڑا...... ! آج تو واقعی گرمی بھی کم ہے اور ہوا بھی ہے...... چل پھر......''

دوسرے نے جواباً کہا تو بہرام چوکس ہو کر بیٹھ گیا، اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا، وہ دونوں سپاہی باہر احاطے میں سونے کا ارادہ کر رہے تھے، اس طرح بہرام کے منصوبے میں مزید آسانی ہو سکتی تھی۔

دونوں سپاہی اپنی اپنی کھاٹ اٹھانے باہر کشادہ جگہ پر رلیاں بچھانے لیٹ گئے مگر ابھی وہ سوئے نہیں تھے، بہرام ان کے سونے کا انتظار کر رہا تھا، وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے...... دوسرے سپاہی کو جانے کیا سوجھی، اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اڑے یار محمد بخش...... ! کہیں مروا نہ دینا صبح صاحب نے ہمیں اس طرح پڑے سوتا دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔''

''اڑے یار...... ! کچھ نہیں ہوتا، خود صاحب (انسپکٹر) اپنے کوارٹر سے دس بجے سے پہلے نہیں نکلتا...... ہم اس سے پہلے ہی جاگ جائیں گے۔''

وہ دونوں اس قیامت سے بے خبر تھے جو بہرام کی صورت میں چھپی ہوئی تھی پھر تھوڑی دیر بعد دونوں کے خراٹے گونجنے لگے، ان دونوں نے اپنی قمیصیں اتار کر چار پائیوں کی پائینتی پر ڈال دی تھیں اور بہرام کو یقین تھا کہ لاک اپ کی چابیاں ان دونوں کی قمیضوں کی کسی ایک جیب میں ضرور موجود ہوں گی، نہ بھی ہوتیں تو اس نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا تھا جو مشکل طلب مرحلہ ضرور تھا مگر ناممکن نہ تھا لیکن بہرام نے اپنا کام آسان پاتے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ خاموشی سے ان کے قریب جا کر چابی اڑا لے گا۔ ذرا دیر مزید اپنی جگہ دبکے رہنے کے بعد وہ دبے پاؤں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے چار پائیوں کے قریب آیا پھر دم سادھ کر اس نے پہلے ایک قمیض کی تلاشی لی، وہ خالی تھی پھر دوسری قمیض سے چابیوں کا گچھا اس کے ہاتھ لگ گیا، اس نے چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لیا اور جب واپس پلٹنے لگا تو اچانک ایک سپاہی نے کروٹ بدلی...... بہرام ٹھٹک گیا اور فوراً چوپایوں کی طرح چار پائی کے نیچے سرک گیا، کروٹ بدلنے والا سپاہی تھوڑا کھانسنے لگا...... بہرام دم سادھے بلی کی طرح چار پائی کے نیچے دبکا رہا پھر جب خاموشی چھا گئی تو وہ پنجوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا چار پائی سے نکل کر برآمدے میں آیا اور بے آواز تیزی کے ساتھ چلتا اندر نیم تاریک راہداری میں آ گیا، دائیں طرف دو لاک اپ تھے، دونوں ہی میں قیدی پڑے سو رہے تھے، تیسرے کمرے کا دروازہ لوہے کا تھا جو بند تھا، بہرام نے اندازہ لگایا یہ کمرہ شاید کوئی اسٹور وغیرہ تھا۔

آچر خان نے اسے خالقو کا حلیہ اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا تھا...... بہرام نے ...لیے چلے خالقو کو فوراً پہچان لیا جبکہ دوسرے لاک اپ کے فرش پر لیٹا ہوا شخص ایک ادھیڑ عمر ...قدرے تنومند تھا، بہرام جلدی سے آواز پیدا کئے بغیر خالقو والے لاک اپ کے تالے ...ں چابیاں آزمانے لگا اور بالآخر تالا ہلکی آواز کے ساتھ کھل گیا...... اس کا دل پنپیوں میں ...دھڑک رہا تھا، تالا کھول کر اس نے بغلی دروازہ آہستگی کے ساتھ کھولا اور اندر داخل ہو گیا پھر ...قو کو جگانے لگا، تھوڑی کوشش کے بعد خالقو نے آنکھیں کھول دیں، وہ بری طرح ٹھٹکا مگر بہرام نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور جلدی سے اسے لے کر باہر نکل آیا۔

دونوں دبے پاؤں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کی عمارت سے باہر آ گئے اور پھر کافی ...ہر آ کر راستے میں بہرام نے اسے بتا دیا کہ اسے آچر خان نے بھیجا ہے، خالقو اسے اپنا نام ...بھی بتا چکا تھا، آچر خان کی ہدایت کے مطابق بہرام، خالقو کو لئے اس کے ہوٹل میں آ گیا، ...ہوٹل بند تھا، لکڑی کی میزیں اور کرسیاں ایک دوسرے پر الٹی پڑی تھیں اور ان سے زنجیریں ...بندھی ہوئی تھیں، آس پاس ویرانی کا راج تھا، ایک بلب ہوٹل کے چھپر سے جھول رہا تھا، سامنے ایک کمرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی، دروازہ بھڑا ہوا تھا، یہ دونوں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے، سامنے ایک کھری چار پائی پر آچر خان لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا، آہٹ پر ...چونک کر اٹھا اور بہرام کو کامیاب دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''لے یارا...... ! پکڑ اپنا آدمی...... میں نے تیرا کام کر دیا...... لا اب باقی کی رقم ...ے تو میں اندھیرے میں ہی نکل جاؤں۔'' بہرام نے بہ عجلت کہا تو آچر خان نے اس کا ...ہاتھ دبا کر آنکھوں کا مخصوص اشارہ دیا پھر اس نے جیب سے ایک پستول نکال کر خالقو کو ...تھماتے ہوئے بولا۔

''خالقو...... ! ایک آخری کام کر دے...... بس پھر تیرے وارے نیارے ...ہیں...... !''

''کک...... کون کام سائیں...... !'' خالقو الجھ کر بولا۔

''یہ پستول پکڑ اور اسی وقت سانول کے گھر کی طرف نکل جا...... میں اور بہرام تیرا ...یہاں انتظار کر رہے ہیں۔'' آچر خان نے سنسناتے لہجے میں سرگوشی کی۔ ''تجھے اب سانول ...کا کام تمام کرنا ہے۔''

خالقو اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ آچر خان اسے متذبذب پا کر بولا۔ ''اڑے ...سانول کا کام تمام کرنا ضروری ہے، تو نہیں جانتا تیری بہن ملوکاں اور سانول کی عنقریب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شادی ہونے والی ہے، تیری بیوہ چاچی اور سانول کے ماما اللہ رکھیو نے دونوں کی بات پکی کردی ہے۔ تو اپنا کام پورا کر کے ادھر ہی آجانا پھر بہرام کے ساتھ میں تجھے اس علاقے سے بہت دور بھیج دوں گا...... وہاں تو بہت مزے کی زندگی گزارے گا...... جا ہمت کر......!''

آچر خان کے ہمت دلانے پر خالقو تیار ہوگیا، اس کے پاس اب آچر خان کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا، وہ خود اس علاقے میں نہیں رہنا چاہتا تھا، پولیس کا ڈر بھی تھا اسے چنانچہ وہ فوراً پستول سنبھالے وہاں سے نکل گیا البتہ بہرام کے چہرے پر الجھن آمیز تاثرات صاف عیاں ہو رہے تھے اور پھر خالقو کے وہاں سے جاتے ہی اس نے آچر خان سے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اڑے سائیں......! اس کو میرے گلے کیوں ڈال رہا ہے...... اس طرح پولیس میرے بھی پیچھے لگ جائے گی، کیوں مجھے مروا رہا ہے......؟''

اس کی بات پر آچر خان کے مکروہ لب سیاہ پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہوگئی اور پھر وہ اس کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ دھرتے ہوئے چارپائی پر بٹھا کر بولا۔ ''بہرام......! میری بات سن...... پر پہلے یہ پکڑ اپنے باقی کے پیسے......'' یہ کہہ کر آچر خان نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹوں کی گڈی اسے تھما دی جسے بہرام نے جلدی سے اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لیا اور بدستور مستفسرانہ نظروں سے آچر خان کی طرف دیکھنے لگا تب آچر خان دھیمی آواز میں بتانے لگا۔ ''بہرام......! تو تو یاروں کا یار ہے، بس میرا ایک آخری کام اور کر دے...... یہ خالقو جیسے ہی اپنا کام پورا کر کے لوٹے تو تو اسے اپنے ساتھ لے جانا اور کہیں دور لے جا کر اس کا کام تمام کر دینا۔''

بہرام اس کی بات سن کر بری طرح چونکا مگر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی آچر خان دوبارہ بولا۔ ''تو فکر نہ کر اس کام کے میں تجھے الگ سے پیسے دوں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے آچر خان......! لیکن اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے، اگر خالقو کو قتل کرنا ہی ضروری تھا تو پھر اسے حوالات سے کیوں فرار کروایا تھا؟'' بہرام نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

''مجھے ڈر تھا کہ کہیں خالقو پولیس تشدد سے مجبور ہو کر میرا نام نہ لے دے کہ اس نے میرے ہی کہنے پر سکھیو چاچا کا قتل کیا تھا پھر میں بھی پکڑا جاتا...... اب اس کام کے بعد میرے آگے کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔''

بہرام اس کی بات سن کر دھیرے دھیرے پُرخیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگا۔

آچر خان اور بہرام خالقو کی واپسی کے بے چینی سے منتظر تھے، خالقو کے فرشتوں کو بھی اپنے خلاف تیار ہونے والی اس سازش کا علم نہ تھا کہ موت کا فرشتہ اس کی بھی گھات میں بیٹھا تھا مگر کہاں......؟ آچر خان کے ہوٹل میں یا ادھر جہاں وہ کسی کی زندگی کا چراغ گل کرنے جا رہا تھا، قسمت دونوں طرح سے سفاک آچر خان کا ساتھ دے رہی تھی، چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر...... دونوں ہی صورت میں آچر خان کا کام آسان تھا۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سدھوراں ایک بار پھر اپنی ہمدم دیرینہ ڈاکٹر فوزیہ کے ساتھ رہنے لگی تھی مگر اس بار اس کی گود میں ایک ننھا وجود بھی ہمک رہا تھا۔ یوں سدھوراں کا اپنی محسنہ پر بوجھ بننے پر دل مائل نہیں ہوا تھا مگر وہ مجبور تھی، اس کا شوہر پرویز لا پتہ ہو چکا تھا اور پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یوں تو ڈاکٹر فوزیہ نے گھر آتے ہی موبائل پر انسپکٹر مشتاق احمد سے رابطہ کیا تھا اور پرویز کے سلسلے میں ان سے مدد کی بھی درخواست کی تھی کیونکہ سدھوراں نے ڈاکٹر فوزیہ کو بتا دیا تھا کہ پرویز نے برے کاموں سے کنارہ کشی کر کے جب شریفانہ راہ اپنانا چاہی تو پھر اس کے ساتھی اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔

انسپکٹر مشتاق احمد نے پرویز کے سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ کو اپنے تعاون کا یقین دلایا مگر یہ سب تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب پرویز ہاتھ آتا، وہ تو سرے سے ہی لا پتہ ہو گیا تھا۔ سدھوراں کو جہاں اپنے ماں بننے کی بے حد خوشی تھی۔ وہاں پرویز کی طرف سے بھی اسے شدید پریشانی لاحق تھی۔

جب ڈاکٹر جواد احمد ڈاکٹر فوزیہ کی زبانی اس حقیقت کا علم ہوا کہ سدھوراں اپنے نومولود بچے سمیت پھر ڈاکٹر فوزیہ کی پناہ میں آ گئی ہے تو وہ قدرے ناراض ہو کر بولا۔

''فوزیہ...... ! آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے......؟ میری سمجھ میں نہیں آتا، تم سدھوراں کا چیپٹر کلوز کیوں نہیں کر دیتیں، اس کی وجہ سے تم خود کتنے سنگین حالات سے گزر چکی ہو اور کڈنیپ بھی ہو چکی ہو۔''

فوزیہ کو پہلی بار جواد احمد کی بات ناگوار گزری۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''جواد...... ! میں نے سدھوراں کو اپنی بہن بنایا ہے اور میں آخری دم تک اس کی مدد سے منہ نہیں موڑ سکتی۔''

''مگر فوزیہ ! تم آخر کب تک اس کی دست گیری کرتی رہو گی، اس طرح تو خود ہماری لائف بھی ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا جواد...... ! جب میرے مما، پاپا کو اس بات پر اعتراض نہیں تو پھر تم کیوں معترض ہو؟''

''فوزیہ...... ! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' ڈاکٹر جواد نے متحمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری آگے چل کر اپنی لائف بھی ہو گی، تمہارے مما، پاپا کے گھر کی اور بات ہے، جب ہم دونوں ایک الگ گھر میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے تو...... !''

''تو تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر جواد کے چہرے پر ایک لمحے کو تلخی کے آثار نمودار ہوئے مگر وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بالآخر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''نہیں فوزیہ...... ! اس بات کو ابھی کلیئر ہونا چاہیے۔''

''آف کورس...... میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' ڈاکٹر فوزیہ نے بھی بلا تامل سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''جب تک میرے بازو میں قوت ہے، میں سدھوراں کو مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی اور جب بھی موقع ملا، میں اس کی مدد کرنے سے منہ نہیں موڑوں گی...... میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔''

پھر اس دن کے بعد سے دونوں میں بات چیت بالکل بند ہو گئی حالانکہ اب ان کی منگنی میں صرف دو دن رہ گئے تھے مگر ان کے بڑوں کو ان دونوں کی ناراضی کا قطعاً علم نہ تھا، یہ تو اس وقت پتہ چلا جب ڈاکٹر جواد احمد کی طرف سے منگنی سے انکار ہو گیا، ڈاکٹر فوزیہ تلخی سے مسکرا کر رہ گئی تاہم ان دونوں کے گھر والوں کو شدید حیرانی ہوئی تھی چونکہ یہ خالصتاً لڑکے، لڑکی کا معاملہ تھا اس لیے جب ان سے منگنی سے انکار کی وجہ پوچھی گئی تو راز کھلا کہ معاملہ کیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ کے مما، پاپا نے تو کوئی خاص پروا نہ کی کیونکہ انہوں نے سب کچھ اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کے سپرد کر رکھا تھا، وہ اپنے برے بھلے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی لیکن ڈاکٹر جواد کی والدہ ماجدہ خاتون اس صورت حال سے خاصی حد تک آزردہ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا فرماں بردار بیٹا جواد احمد فوزیہ کو کس قدر چاہتا تھا۔ وہ ایک بردبار اور نیک صالح خاتون تھیں، ان کا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا، شوہر کا انتقال جواد احمد کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا، وہ بینک کے افسر تھے لہٰذا ماجدہ خاتون کی اپنے بیٹے جواد احمد کی پرورش میں زیادہ دقت پیش نہ آئی تھی، گلستان جوہر میں ان کا چھوٹا سا اپنا بنگلہ تھا جو حال ہی میں انہوں نے لیا تھا۔

''بیٹا...... ! فوزیہ ایک اچھی لڑکی ہے، اگر اس کے دل میں کسی کی ہمدردی کا درد ہے تو یہ کوئی ایسی برائی نہیں کہ تم اس سے بالکل ہی ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' ماجدہ خاتون نے پیار

سے بیٹے کو سمجھایا۔

''امی ...! بات ہمدردی کی نہیں ہے، فوزیہ کی حد سے بڑھی ہوئی اس عادت نے اسے خود بھی نقصان پہنچایا ہے، وہ ایک بار اغوا بھی ہو چکی ہے، نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔'' جواد احمد نے کہا۔

''بیٹا .....! تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے ..... چلو چھوڑو اس بحث کو میں آج خود بھائی وصی حیدر شاہ کے ہاں جا کر فوزیہ بیٹی کو سمجھاؤں گی مگر تمہیں اب اپنا انکار اقرار میں بدلنا ہوگا۔''

''نہیں امی ...! آپ وہاں ہرگز نہیں جائیں گی۔'' ڈاکٹر جواد نے گہری متانت سے کہا۔

''بس .....! اتنی ہی محبت تھی تجھے فوزیہ سے .....؟'' ماں نے جیسے اسے جوش دلایا۔

''اسے بھی تو مجھ سے اتنی ہی محبت تھی ورنہ وہ میری بات کیوں ٹھکراتی، ایسی پاگل لڑکی تو آگے چل کر اپنے ساتھ مجھے بھی کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتی ہے، اچھا ہوا یہ معاملہ ادھر ہی ختم ہو گیا۔''

''نہیں جواد .....! تمہارے سر پر بھی اس وقت غصہ سوار ہے، تم نے غصے میں غلط قدم اٹھا لیا ہے، مجھے یقین ہے کہ تمہیں آگے چل کر پچھتانا پڑے گا ..... بتا تو فوزیہ کو بھلا سکے گا .....؟''

ماں کی بات سن کر ڈاکٹر جواد احمد کے دل کو گھونسا سا لگا، وہ لاجواب سا نظر آنے لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے جب فوزیہ کا تلخ لہجہ اسے یاد آنے لگا تو اس کا نرم پڑتا دل دوبارہ پتھر ہونے لگا تاہم وہ ماں کی بات بھی رد کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا لہٰذا وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے امی .....! آپ فوزیہ کو اگر سمجھانا چاہتی ہیں تو فون پر اس سے بات کر سکتی ہیں مگر آپ ان کے گھر نہیں جائیں گی۔''

ماجدہ خاتون خاموش ہو رہیں، ان کے لیے یہی غنیمت تھا چنانچہ انہوں نے اسی دن فوزیہ سے بات کرنے کی ٹھانی، ان کے پاس فوزیہ کا موبائل نمبر موجود تھا، یہ رابطہ انہوں نے اپنے بیٹے جواد کی غیر موجودگی میں کیا۔

''ہیلو بیٹی فوزیہ .....! میں بول رہی ہوں جواد کی امی .....!''

''آداب آنٹی .....! کہیے کیسے فون کیا؟'' ڈاکٹر فوزیہ نے ان کا احترام کرتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹی! مجھے تم سے شکایت ہے۔'' ماجدہ خاتون نے پیار بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔

''کیسی شکایت آنٹی .....؟''

''تمہارے اور جواد کے درمیان اتنی سی بات پر ناراضی ہوگئی اور تم نے مجھے نہیں بتایا ..... مجھے بتاتی تو میں خود اس نالائق کے کان کھینچتی ..... لو بھلا یہ بھی کوئی ناراضی والی بات ہے۔''

''آنٹی .....! کیا آپ کے بیٹے نے آپ سے ہماری ناراضی کا ذکر کیا تھا؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''ہاں .....! جبھی تو میں نے اس نالائق کی خوب خبر لی۔'' ماجدہ خاتون نے کہا اور پھر پیار سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''دیکھو بیٹی .....! تم دونوں ماشاء اللہ سمجھدار ہو اور پڑھے لکھے بھی ہو، کم از کم تم دونوں کو اس معاملے میں اپنے اپنے بڑوں کا مشورہ تو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔''

''آنٹی .....! اس میں بڑوں سے مشورہ لینے کی بھلا کیا بات تھی؟'' فوزیہ نے کہا۔ ''جواد نے خود ہی ایک چھوٹی سی بات کو وجہ تنازع بنا ڈالا۔ اگر اس کی کوئی بہن تکلیف یا مصیبت کا شکار ہوتی تو کیا وہ اس کی مدد نہ کرتا، میں اس کا اس نیک مقصد میں ساتھ نہ دیتی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹی .....! میں تم سے صد فیصد متفق ہوں۔'' ماجدہ خاتون نے مفاہمانہ انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو بیٹی .....! تم غصہ تھوک دو اور بے فکر ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، شادی کے بعد ہم دونوں ساس، بہو مل کر اس نالائق کے کان کھینچیں گے۔'' ماجدہ خاتون کے پیار بھرے لہجے میں پنہاں اپنائیت آمیز یقین پر بے اختیار فوزیہ ہنس پڑی ..... فوزیہ کی ہنسی نے ایک پریشان حال ماں کو مسرور کر دیا اور انہوں نے فون پر ہی فوزیہ کے دو تین بوسے لے ڈالے جس کی چٹ، چٹ کی ہلکی آواز فوزیہ کے کانوں میں بھی پڑی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بیٹی .....! تم نے ایک پریشان حال ماں کا دل خوش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ تم واقعی ایک اچھی، نیک اور فرماں بردار بیٹی ہو، اب تم دیکھنا میں کس طرح اس نالائق کی خبر لیتی ہوں۔'' ماجدہ خاتون نے مسرور لہجے میں کہا پھر کچھ سوچ کر ذرا سنجیدہ لہجے میں فوزیہ سے پوچھا۔ ''بیٹی .....! جواد کے انکار پر کیا تمہارے مما، پاپا تو ناراض نہیں ہیں ..... تم اگر کہو تو میں خود ان سے اپنے بیٹے کی طرف سے معافی .....!''

''نہیں ..... نہیں ..... آنٹی .....! اس کی ضرورت نہیں۔'' فوزیہ نے اچانک ان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات کاٹ کر کہا۔ ''میرے مما، پاپا روشن خیال انسان ہیں، انہیں مجھ سے زیادہ اپنی تربیت پر بھروسہ ہے...... ویسے بھی ان کا ایسا مزاج ہے ہی نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں لئے بیٹھے رہیں...... ویسے میں بھی ان سے ذکر کر دوں گی۔''

ڈاکٹر فوزیہ کی بات سن کر ماجدہ خاتون تو خوشی سے کھل اٹھی تھیں، فوزیہ سے یہ بات کرنے کے بعد انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اپنے لاڈلے کے کان ضرور کھینچیں گی ساتھ ہی انہوں نے اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ ایک نازک مسئلہ افہام و تفہیم کی ہلکی پھلکی گفتگو میں ہی حل ہو گیا۔

☆======☆======☆

پرویز کو ہوش آیا تو اس کے گرد تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر یہ تاریکی اس کے دماغ کی تھی کیونکہ اس نے جب دو تین بار اپنے دماغ کو جھٹکا دیا تو اس کی آنکھوں سے دھند چھٹ گئی تب اسے احساس ہوا کہ وہ ایک نیم تاریک کمرے میں مقید ہے...... رفتہ رفتہ اس کے حواس بحال ہونے لگے اور اسے یاد آنے لگا کہ وہ دلدار کے ساتھ لڑائی میں اس کے گماشتوں کے ہاتھوں اس حالت تک پہنچا ہے...... غصے اور طیش کی ایک آتشیں لہر اس کے مضروب وجود میں اترتی چلی گئی، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، دلدار کے ہٹے کٹے گماشتوں نے اسے خوب پیٹا تھا، بہرطور جب رفتہ رفتہ اس نے اپنی کھولتی ابلتی کیفیت پر قابو پایا تو وہ سوچنے لگا کہ کون سی جگہ ہے، کیا یہ دلدار کے ہوٹل یا جوئے خانے کا ہی کوئی کمرہ ہے۔

اچانک دروازہ کھلا، چوکھٹ پر پرویز نے دو سائے کھڑے دیکھے، اگلے ہی لمحے چٹ کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کی ٹیوب لائٹ جل اٹھی...... روشنی ہوتے ہی پرویز کی نظر سامنے پڑی اور ایک موٹے سے شخص کو دیکھ کر پرویز بری طرح چونکا پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں، وہ ان دونوں کے قریب آنے پر انہیں پہچان گیا تھا۔

ایک تو دلدار تھا جبکہ دوسرا شخص انسپکٹر یاور حیات تھا جو اس وقت وردی میں نہیں تھا...... پرویز انہیں دیکھ کر بے بسی اور غصے سے گھور کر رہ گیا تھا تاہم اسے انسپکٹر یاور حیات کو سادہ لباس میں دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ اس وقت کسی تھانے کی بجائے کہیں اور ہی تھا، انسپکٹر یاور حیات اسے زہرخند نظروں سے دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیوں پرویز...... ! اب کیا کہتے ہو...... میرا کام نہ کرنے کی تجھے

کون سی سزا دی جائے لیکن ابھی تم صرف اس بات کا شکر ادا کرو کہ تم اس وقت کسی تھانے میں نہیں ہو۔''

پرویز اس کے ''کام'' نہ کرنے کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا لہٰذا غصے سے دانت پیس کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''انسپکٹر...... ! تم وردی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو اور میں شکر کس بات کا کروں تم مجھے تھانے لے جا سکتے ہو۔''

''شاوا بھئی شاوا...... ! بڑا شوق ہے رے تجھے سرکاری مہمان بننے کا؟'' اس کی بات پر انسپکٹر یاور حیات مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا پھر دوسرے ہی لمحے ہونٹ چبا کر غراتے ہوئے گویا ہوا۔ ''پرویز...... ! تو نہیں جانتا اگر میں نے وردی میں تجھے اپنے تھانے کی سیر کرا دی تو تو ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا...... میں نے تیرے سارے اڈوں پر چھاپہ مار کر انہیں سیل کر ڈالا ہے اور تیرے آدمیوں کو بھی گرفتار کر لیا ہے، وہ میرے ایک اشارے سے تیرے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جائیں گے۔''

''وہ اڈے میری ملکیت کبھی نہیں رہے۔'' پرویز اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔ ''وہ کسی اور کی سرپرستی میں چلتے تھے، میں تو صرف ایک معمولی کارکن تھا بلکہ اب تو میں نے وہاں جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''زیادہ چالاک کوا بننے کی کوشش کرو گے تو ابھی تھانے لے جا کر گیارہ نمبر کا لتر آزماؤں گا تو تم اپنے سارے جرائم کا فرفر اعتراف کرنے لگو گے...... میں تو پتھروں میں بھی جونک لگا دیتا ہوں، تم تو پھر بھی گوشت پوست کے انسان ہو۔'' انسپکٹر یاور حیات نے روایتی سفاکی سے کہا۔ جواباً پرویز خاموش رہا تھا پھر انسپکٹر یاور حیات اپنے ساتھ کھڑے دلدار کو مخاطب کر کے بولا۔ ''دلدار...... ! پہلے تو یہ ایسا نہیں تھا، اب اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ اپنے گھر کا دانہ ہی چکھانے سے انکاری ہو گیا ہے؟'' پرویز کو اس خبیث انسپکٹر کے لہجے پر طیش تو آیا مگر وہ مصلحتاً چپ رہا۔

''صاحب...... ! اس کی جو دوسری بیوی ہے نا یعنی سدھوراں اس نے اس پر کچھ ایسا جادو کر ڈالا ہے کہ یہ نہ صرف ہماری کوئی بات نہیں مان رہا بلکہ اب تو اس نے شریفانہ زندگی گزارنے کا بھی عہد کر ڈالا ہے۔''

''کیا اتنی ہی حسین ہے اس کی بیوی......؟'' انسپکٹر یاور حیات کے لہجے میں ہوسناکی اتر آئی...... دلدار نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرویز غصے سے دلدار کو گھورتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ ''کیوں رذیل...... ! تیری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی تو بیوی حسین اور جوان ہوگی۔ تو کیوں نہیں اپنے ''صاحب'' کو خوش کر دیتا جس کا تو اتنے عرصے سے غلام بنا ہوا ہے۔''

پرویز کی ترش گوئی پر انسپکٹر یاور حیات کو طیش آ گیا اور اس نے غصے سے بے قابو ہو کر ایک لات پرویز کے منہ پر رسید کرنی چاہی تو پرویز نے پھرتی کے ساتھ اسے پکڑ کر مروڑ ڈالا... دلدار اپنی گماشتہ گیری کے زعم میں اپنے صاحب کو بچانے کے لیے آگے بڑھا تو اس اثنا میں پرویز، انسپکٹر یاور حیات کی ٹانگ پکڑ کر اسے پرے دھکیل چکا تھا، دلدار پر تو وہ شاید ادھار کھائے بیٹھا تھا چنانچہ جیسے ہی دلدار جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تو پرویز نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا پوری قوت سے اس کی ناک پر رسید کرنا چاہا تو دلدار نے ایک طرف کو جھکائی دی، اپنی ناک کو بچاتے بچاتے پرویز کے طاقتور گھونسے نے اس کے دائیں جبڑے کی تواضع کر ڈالی، گھونسے کی ضرب اس قدر شدید تھی کہ دلدار کو اپنی داڑھیں تک ہلتی محسوس ہوئی تھیں، اس اثناء میں انسپکٹر یاور حیات نے سنبھلتے ہوئے فوراً اپنی قمیض کے اندر کمر کے گرد بندھے ہوئے پیٹی ہولسٹر سے اپنا سروس ریوالور نکال کر پرویز پر تان لیا اور غرا کر بولا۔

''خبردار......! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ گولی سے پیٹ پھاڑ ڈالوں گا۔''

ناچار پرویز بے بسی سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا، اس دوران غصے میں بھرے ہوئے دلدار نے پرویز پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تو انسپکٹر یاور حیات نے اسے پیش قدمی سے روک دیا اور دلدار، پرویز کو خون آشام نظروں سے گھور کر رہ گیا۔

''میرا خیال ہے اسے تھانے ہی لے چلنا چاہیے۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بڑبڑایا، اس کی قہر آلود سنسناتی ہوئی نظریں ہنوز پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

تاہم دلدار زہر خند لہجے میں اپنے صاحب کو مشورہ دیتے ہوئے بولا۔ ''میرا تو خیال ہے صاحب...! اس کے ادھر ہی سارے کس بل نکال دینے چاہئیں۔'' مگر انسپکٹر یاور حیات نے اس کی بات پر نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''میں ابھی تھانے فون کر کے موبائل بلواتا ہوں... میں اس سے تھانے میں زیادہ بہتر طریقے سے نمٹوں گا۔'' اس کے زہر خند لہجے میں چھپی سفاکی کو محسوس کر کے پرویز کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی اترتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

مرتا کیا نا کرتا کہ مصداق خالقو، آچر خان کی ہدایت کے مطابق چاچا سکھیو کو قتل کرنے کے بعد سانول کو قتل کرنے کے لیے اس کے گھر کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا، حوالات

سے فرار کروانے کے بعد خالقو کو اب اپنے گرو آچر خان کی طاقت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ ہو چلا تھا، بہر طور رات کے پچھلے پہر کی گہری تاریکی میں خالقو وحشی سائے کی طرح بڑھا چلا جا رہا تھا بالآخر وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا، گلی اس سے ویران تھی، خالقو چار پانچ گھر چھوڑنے کے بعد ایک گھر کے سامنے رک گیا، یہ ماما اللہ رکھیو کا گھر تھا۔

خالقو اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچ کر چند ثانیے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا پھر اس نے اپنی قمیض کے اندر پستول کی موجودگی کا احساس کیا اور مکان کے بالکل ساتھ لگے نیم کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا، پیڑ اگرچہ مکان کی کچی دیوار سے ذرا دور تھا لیکن خالقو کسی طرح آگے کو پھیلے ہوئے موٹے تنوں والی شاخوں پر سرکتا ہوا یکدم جنگلی بلے کی طرح اچھلا اور دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کی منڈیر پر تھا، چند ثانیے وہیں دبک کر اس نے کچے صحن میں دیکھا تو دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں... گرمیوں کا موسم تھا اس لیے آج کل لوگ ویسے بھی ڈربہ نما کوٹھریوں کی بجائے گھر کے صحن میں چار پائیاں ڈال کر کھلے آسمان تلے سوتے تھے بلکہ کچھ لوگ تو گھر کے باہر بھی سونے کے لیے رات میں چار پائیاں ڈال لیتے تھے۔ خالقو کسی ٹھکے ہوئے شکاری بلے کی طرح گارے مٹی والی کچی دیوار کی ٹگر پر ٹکا بغور صحن میں بچھی ان دونوں چار پائیوں پر کسی کو محوِ خواب گھورے جا رہا تھا، اس کے خیال کے مطابق ان میں سے ایک ماما اللہ رکھیو تھا اور دوسرا سانول... شروع کی تاریخوں کا چاند سوگوار سے انداز میں کہیں پرے جھکا ہوا تھا، آسمان پر آج تارے بھی نہیں ٹمٹما رہے تھے یہی وجہ تھی کہ خالقو کو ان دونوں میں سے سانول کو پہچاننے میں دقت کا سامنا تھا، جانے کیا بات تھی کہ اندر کودنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی، اس کی وجہ ظاہر ہے یہی رہی ہوگی کہ وہ چاچا سکھیو کو بھی اس طرح دیدہ دلیری سے قتل کرنے کے بعد پکڑا جا چکا تھا، اب بھی اسے یہی خدشہ پریشان کر رہا تھا مگر نیچے اترے اور سانول کو پہچانے بغیر چارہ نہ تھا تب اچانک خالقو کے دماغ میں بجلی کی سرعت کے ساتھ ایک خیال کوندا، اس نے ایک سفاک فیصلہ کیا یعنی دونوں کا ہی بیک وقت قتل... یقیناً ان دونوں میں ایک سانول ہی ہوگا، جہاں ایک قتل کیا تو دوسرا اور تیسرا بھی سہی... یہ خیال آتے ہی خالقو نے بمشکل دیوار کی منڈیر پر خود کو ذرا مضبوطی سے جمایا پھر پستول والا ہاتھ دھیرے دھیرے سیدھا کیا اور باری باری دونوں چار پائیوں کو نشانہ بناتے ہوئے ٹریگر دباتا چلا گیا۔

پہر رات کے دم بخود سناٹے گولیاں چلنے کے سمع خراش دھماکوں سے گونج اٹھے... خالقو کو اپنے کام کی تسلی سے زیادہ یہاں سے فوراً فو چکر ہونے کی فکر تھی چنانچہ وہ دیوار سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو داور تاریک گلی میں دوڑتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

وہ ہانپتا لرزتا آچر خان کے ویران ہوٹل میں پہنچا تو بہرام تیار بیٹھا تھا، آچر خان نے ان دونوں کے رخصت ہوتے وقت بڑی سفاکی سے بہرام کو اس کا راستے ہی میں صفایا کرنے کا مخصوص اشارہ کیا پھر بہرام بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے خالقو کو لئے تاریکی میں نکل گیا۔ اب خالقو، بہرام کے ساتھ چل رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ بہرام موت کے فرشتے کی صورت اس کے ہمراہ ہے، بہرام کا خالقو کو ٹھکانے لگانے کا کام بہت آسان تھا، خالقو ویسے ہی ایک قاتل اور مفرور قیدی تھا، اس کی لاش دیکھ کر پولیس خود ہی سکھ کا سانس لے گی یا پھر اس کیس سے جان چھڑانے کے لیے کاؤنٹر فائرنگ ڈیتھ قرار دے کر یہ کیس ہی داخل دفتر کر دے گی۔

اب دور مشرقی سمت میں پو پھوٹنے والی تھی، نیشنل ہائی وے سے ذرا قریب لمبی کھجور کی جھاڑیوں کے درمیان ایک بل کھاتی پگڈنڈی نما کچے راستے پر بہرام چلتے چلتے رک گیا اور فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکال کر خالقو پر تان لیا..... خالقو کے چہرے پر حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات ثبت ہو کر رہ گئے، آن واحد میں اسے اپنے گرو گھنٹال آچر خان کی سفاک سازش کا ادراک ہوا مگر اب دیر ہو چکی تھی، بہرام نے اس کے دل کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا، ٹھک کر کے گولی خالقو کے سینے میں دل کے مقام پر سرخ روشندان بنا گئی..... اذیت ناک موت کے بعد اس کے چہرے پر غیر یقینی حیرت کے تاثرات چسپاں ہو کر رہ گئے تھے۔

☆======☆======☆

ان تینوں اہلکاروں بشمول انڈین آفیسر کی گنوں سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھاڑ سے سارنگ نے خود کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی مگر پھر بھی ایک بھولی بھٹکی گولی اس کی بائیں ران کا گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔

سارنگ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس وقت بھوکے بھیڑیوں کے بھٹ میں ہے اور جن کے کئی ساتھی اس کے ہاتھوں لقمہ اجل بن چکے ہیں، ٹانگ کے زخم کو خاطر میں لا کر سپر ڈالنے کا مطلب صرف اور صرف موت تھا..... ایک بھیانک موت.....! اب مارو یا مر جاؤ والی سچویشن تھی چنانچہ اس نے بھی اپنی گن سیدھی کر کے ان تینوں پر جوابی فائرنگ کر ڈالی، انڈین آفیسر کے سوائے باقی دونوں اہلکار کربہہ چیخ کے

ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

انڈین آفیسر پسپا ہو کر راہ فرار اختیار کرنے لگا تو سارنگ نے شیر کی طرح اسے جھپٹ لیا اور غرا کر بولا۔ ''خبیث انسان! تُو نے جان بوجھ کر مجھ بے گناہ کو پھنسانے کی کوشش کی جس کی سزا تیرے ساتھیوں کو بے گناہ بھگتنی پڑی ہے۔ میرے سر پر اس وقت جنون سوار ہے، شرافت سے مجھے بتاؤ میری بھابی اللہ وسائی اور اس کے بچے فریدو، منٹھار کو تُو نے کدھر بند کر رکھا ہے؟'' سارنگ کے بگڑے ہوئے تیوروں اور حتمی لہجے کی سفاکی پر وہ انڈین آفیسر گھگھیا کر رہ گیا۔ ''چل مردود.....! لے چل مجھے وہاں جدھر تُو نے ان کو بند کر رکھا ہے۔''

سارنگ اس کو گھسیٹنے لگا تو انڈین آفیسر اسے عمارت کے بالائی حصے میں لے آیا، اس اثناء میں چار پانچ مزید اسلحہ بدست اہلکار بھی وہاں آ دھمکے تھے مگر اپنے آفیسر کو سارنگ کے خون آشام شکنجے میں دیکھ کر ان میں سارنگ پر فائرنگ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی، سارنگ اپنی رائفل کی نال انڈین آفیسر کی گردن سے چپکائے ہوئے تھا مگر وہ ان چار پانچ مسلح اہلکاروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود ایک عام انسان تھا، ایسے حالات سے اس کا کبھی سابقہ نہ پڑا تھا مگر بہر حال زندگی پر بن آئے تو بلی بھی پنجہ مارتی ہے..... یہ سب لوگ تربیت یافتہ تھے، سارنگ نے ان سب کو اپنی گنیں پھینکنے کا حکم دیا تھا مگر جب انہوں نے اس کی بات پر عمل نہ کیا تو سارنگ نے انڈین آفیسر سے درشت اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''اپنے کتوں سے کہو کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں ورنہ.....!'' اس نے یہ کہہ کر دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

انڈین آفیسر نے اپنے ماتحتوں کو یکدم غیر مسلح ہونے کا حکم دیا پھر سارنگ کی اگلی ہدایت کے مطابق ان سب کو ہاتھ اٹھائے دیوار کے ساتھ چپک جانے کو کہا۔ علاوہ بریں ایک اہلکار کو بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی لانے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرے سہمے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو سارنگ نے دیکھا تب وہ آہستہ آہستہ باہر کو کھسکنے لگا، عمارت سے باہر آ کر سارنگ ایک کھڑی جیپ میں سوار ہوا اور جلدی جلدی بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو بھی اس میں سوار کرایا پھر انڈین آفیسر سے جیپ کی چابی منگوا کر اسے اسٹارٹ کیا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی..... جیپ آگے بڑھانے سے قبل اس نے انڈین آفیسر کا خون کرنا مناسب نہ جانا تھا البتہ اسے ریت میں دھکا ضرور دے دیا تھا، جیپ کے آگے بڑھتے ہی چوکی عمارت سے گولیوں کی برسات اند پڑی مگر سارنگ جیپ کو آندھی طوفان کی طرح دوڑائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جارہا تھا۔ چوڑے اور مخصوص ساخت والے ٹائروں کی وجہ سے جیپ ریت پر صحرائی اونٹ کی طرح دوڑی جارہی تھی پھر خاردار آہنی باڑھ کو توڑتی ہوئی وہ سرحدی علاقے سے نکل گئی۔

مگر سارنگ نے جیپ نہ روکی، وہ اسے اسی طرح ہی طوفانی رفتار سے دوڑائے جارہا تھا، اپنی اس غیر یقینی کامیابی پر اس کا دل مسرت سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

دن کا اجالا اب چہار سو پھیل چکا تھا، سورج کی حدت تیز ہونے لگی تھی، ان کے پاس سفر کے لیے زادِ راہ کچھ بھی نہ تھا مگر سارنگ ہی نہیں بلکہ سب اس بات کا ہی شکر ادا کررہے تھے کہ اب وہ اپنی سرزمین، اپنی دھرتی پر زندہ سلامت قدم رکھ چکے تھے، وہ سب اللہ کے حضور شکر بجالانے لگے جس نے ان سب کو بخیر و عافیت اتنی بڑی مصیبت سے بچالیا تھا...... سارنگ نے جیپ کی رفتار اب قدرے آہستہ کرلی تھی پھر ایک مقام پر جیپ خود ہی رک گئی، فیول بتانے والی سوئی زیرو پر آچکی تھی، سارنگ نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اسٹیئرنگ پر مکا مارا، جیپ کا انجن اب گھر گھرا کر خاموش ہو چکا تھا۔

جیپ میں بیٹھے بیٹھے سارنگ نے گردوپیش کا جائزہ لیا، سورج سوا نیزے پر آچکا تھا، دھوپ تیز ہوگئی تھی اور صحرا تپنے لگا تھا، حدِ نگاہ لق و دق جہنم زار ریگستان کے سوا کچھ نہ تھا، گرمی اس قدر تیز تھی کہ سانسیں گھٹ رہی تھیں۔

''ادا...... !اب کیا ہوگا؟'' بھابی اللہ وسائی نے پریشانی سے کہا۔

''اللہ خیر کرے گا بھابی......! اب تک اس نے ہی ہمیں ہر مصیبت سے نکالا ہے، آگے بھی وہی ہماری مدد کرے گا۔'' سارنگ نے اسے تسلی دی...... ننھے منٹھار کی بھی حالت اس جھلساتی گرمی میں خراب ہو رہی تھی، وہ تو پھر بھی معصوم تھا، روئے چلا جارہا تھا۔ سارنگ کو اب نئی پریشانی نے گھیر لیا تھا، درحقیقت انہوں نے ایسے حالات میں سرحد پار کی تھی کہ زادِ راہ کے لیے کچھ بھی اکٹھا نہ کر پائے تھے۔

''وہ دیکھو ادا......!'' اچانک گیارہ سالہ فریدو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پکارا تو وہ ٹھٹک کر ادھر متوجہ ہوا پھر دوسرے ہی لمحے وہ خوش ہو گیا۔ فریدو نے جس سمت اشارہ کیا تھا، وہ چھ سات اونٹوں کی مختصر قطار تھی، وہ ان سے کافی پرے ہو کر آگے بڑھی چلی جارہی تھی...... سارنگ جان گیا کہ یہ کوئی قافلہ تھا۔

سارنگ نے بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو وہیں جیپ میں بیٹھے رہنے کی تلقین کی اور وہ جیپ سے اتر کر آگے بڑھتے ہوئے قافلے کی طرف دوڑا...... بھابی اللہ وسائی اور فریدو دم

بخود نظروں سے سارنگ کو جاتا دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے دیکھا سارنگ گرتا پڑتا قافلے والوں سے جاملا...... یہ دونوں ہاتھوں کا چھجا بنائے سارنگ اور قافلے والوں کو تکے جارہے تھے، ذرا ہی دیر بعد ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ ایک اونٹ تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا...... وہ شاید انہیں لینے آرہے تھے، ذرا دیر بعد اونٹ ان کے قریب پہنچ گیا، اس کے کجاوے میں سارنگ اور ایک دوسرا شخص بیٹھا تھا...... اس ساربان نے ''ہش...... ہش'' کرکے اونٹ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ایک عورت کو دیکھ کر ساربان ''ہودے'' سے نکل آیا اور اللہ وسائی اور فریدو کو اندر سارنگ کے ساتھ بٹھا دیا پھر ساربان خود اس کی رسی پکڑے قافلے والوں سے جاملا۔

یہ قافلہ ایک ہی خاندان پر مشتمل تھا اور بدین کی طرف جارہا تھا...... سارنگ، بھابی اللہ وسائی اس قافلے کی منزل کا سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے کیونکہ ان کے خاندان تھرپارکر سے ہجرت کرکے اسی طرف ہی گئے تھے...... اگرچہ اس بات کو کئی مہینے گزر چکے تھے مگر سارنگ اور اللہ وسائی کو یقین تھا کہ ان کے ماں، باپ بدین کے ہی کسی گاؤں گوٹھ میں ہوں گے...... اللہ وسائی کی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر خالقو کا چہرہ رقص کرنے لگا اور سارنگ کو اپنی منظورِ نظر میراں کا ملیح چہرہ تصور میں گردش کرتا دکھائی دینے لگا جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

☆======☆======☆

اپنی پاک دھرتی پر قدم رکھتے ہی سارنگ کو اپنے خاندان کے لوگ یاد آنے لگے...... بوڑھے ماں، باپ، بھائی، خالقو، بہن ملوکاں...... چاچا سکھیو، چاچی اور سب سے اہم چہرہ جو اس کے چشمِ تصور میں جم کر رہ گیا تھا، وہ میراں کا تھا...... معصوم اور دل نواز چہرہ...... سارنگ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر اپنوں میں پہنچ جائے۔

دو، تین دنوں کے کٹھن سفر کے بعد یہ لوگ بالآخر بدین کے ایک گاؤں میں پہنچ گئے...... کئی خاندانوں پر مشتمل اس قافلے کی منزل آگئی تھی چنانچہ وہ سارنگ وغیرہ کو یہاں چھوڑ کر آگے روانہ ہوگئے...... یہاں سارنگ نے گوٹھ کے ایک معتبر شخص سے ملاقات کی اور اپنا مدعا بیان کیا...... وہ ایک بھلا مانس زمیندار تھا۔ اس نے انہیں اپنی اوطاق کے مہمان خانے میں ٹھہرایا اور پھر سارنگ کے خاندان کی تلاش شروع کردی گئی۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے...... جہنم واصل خالقو نے اپنے مکافات عمل کی سزا سے گزرنے سے پہلے آچر خان کے کہنے پر جب سوئے ہوئے ماما اللہ رکھیو اور سانول پر فائرنگ کی تو ماما اللہ رکھیو نے اسی وقت دم توڑ دیا تھا جبکہ سانول کے ایک گولی ٹانگ اور دوسری بازو پر لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو سانول اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے زخموں کی پروا کئے بغیر کراہتا ہوا اٹھا تو اس نے اپنے برابر بچھی ہوئی چارپائی پر سوئے ماما اللہ رکھیو کی طرف دیکھا، اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ ماما...... پکارتا بدنصیب اللہ رکھیو کے قریب آیا، اس کا پورا وجود لہو میں تر تھا اور وہ دم توڑ چکا تھا...... سانول کا اس بھری دنیا میں اور کوئی نہ تھا، ایک ماما تھا اسے بھی نجانے کس ظالم نے ختم کر ڈالا تھا۔ سانول بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس دوران آس پاس کے لوگ فائرنگ اور بعد میں سانول کے رونے کی آوازیں سن کر اس کے گھر میں جمع ہونے لگے پھر انہوں نے زخمی سانول کو گوٹھ کے ایک ڈاکٹر کو نیند سے بیدار کر کے اس کی مرہم پٹی وغیرہ کرنے کو کہا...... ڈاکٹر کی چھوٹی سی ڈسپنسری اس کے ایک اوطاق نما کمرے میں تھی جس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا، اگرچہ یہ پولیس کیس تھا اور اس کی پہلے تھانے میں رپورٹ درج کروانا ضروری تھا مگر بہت سارے لوگوں کی موجودگی اور دباؤ کی وجہ سے ڈاکٹر نے مجبوراً سانول کی ٹانگ اور بازو کے زخموں کا معائنہ کیا، وہ اپنے کام میں خاصا ماہر تھا، اس نے بتایا کہ ٹانگ پر لگنے والی گولی گوشت پھاڑ کر نکل چکی ہے البتہ بازو میں لگنے والی گولی ابھی اندر موجود ہے، شکر تھا کہ دونوں لگنے والی گولیوں نے ٹانگ اور بازو کی ہڈیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا، بہرطور اس نے تھوڑی کوشش سے بازو کی گولی نکال کر اس پر پٹی باندھ کر طاقت کی ڈرپ لگا دی۔ کچھ لوگوں نے تھانے جا کر رپورٹ لکھوادی...... ماما اللہ رکھیو کی تدفین عمل میں لائی گئی تو سانول نے بیوہ چاچی اور ملوکاں وغیرہ کو بھی اس اندوہناک واقعے کی اطلاع پہنچانا ضروری سمجھا، وہاں تک یہ اطلاع لے کر جانے والے تین افراد تھے۔

وہاں کا تھانہ انچارج انسپکٹر چھٹل شاہ اس اطلاع پر فوراً حرکت میں آیا کیونکہ خالقو نامی قاتل اس کے لاک اپ سے فرار ہو چکا تھا، اس نے ازراہِ تشویش بھنویں سکیڑ کر سوچا...... کیا یہ اسی مفرور قاتل خالقو کی کارستانی تو نہیں۔

انسپکٹر چھٹل شاہ چند سپاہیوں کے ساتھ موبائل میں سوار ہو کر جائے وقوع پر پہنچا...... لوگوں سے سوالات کئے...... پھر ''پیرا'' اٹھانے والے (کھوجی) کو بلایا گیا، نامعلوم قاتل

کا ''پیرا'' ملتے ہی پولیس تعاقب میں ہولی...... قاتل کا پیرا مقتول ماما اللہ رکھیو کے گھر سے سیدھا آچر خان کے ہوٹل تک پہنچا تو وہاں شور مچ گیا...... آچر خان کو فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ بعد میں قاتل کے پیرے کے ساتھ ایک اور شخص کا بھی پیرا ملا اور انسپکٹر چھٹل شاہ، آچر خان کو ہتھکڑیاں لگائے اپنی پولیس نفری سمیت آگے روانہ ہوا تو انہیں بڑی شارع کے قریب جھاڑیوں میں خالقو کی لاش مل گئی۔ انسپکٹر چھٹل شاہ کی محنت رنگ لائی، اس کے گھاگ ذہن نے یقینی انداز کیا کہ مفرور قاتل جواب خود مقتول ہو چکا تھا، کو قتل کرنے والا وہی شخص تھا جو اس کے ہمراہ آچر خان کے ہوٹل سے نکلا تھا، بعد میں جب مقتول قاتل کے قاتل (بہرام) کے پیروں کے نشان کے تعاقب میں شارع تک آئے تو وہاں اس کا پیرا گم تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قاتل یہاں سے کسی مسافر لاری میں سوار ہو کر آگے نکل چکا ہے، اس کی تلاش سردست ناممکن تھی مگر اب آچر خان کی شامت آ گئی، انسپکٹر چھٹل شاہ اسے لئے آناً فاناً تھانے پہنچا۔

''خالقو کو تو نے ہی رات کو تھانہ لاک اپ سے فرار کروایا تھا؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے پر جما دیں۔

''سس...... سائیں...... میں ایک شریف آدمی ہوں، بھلا میرا خالقو جیسے قاتل سے کیا واسطہ۔'' آچر خان نے مکارانہ انداز میں جواب دیا۔

انسپکٹر چھٹل شاہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیاہ رنگ کا رول زور سے ٹیبل پر مارا اور کڑک دار لہجے میں بولا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو...... ابھی میں ادھر بہت سارے آدمی اکٹھے کرلوں گا جو اس بات کی تصدیق کر دیں گے کہ خالقو، چاچا سکھیو کے قتل سے پہلے تم سے ملتا رہتا تھا، کیا تم انکار کرتے ہو......؟''

آچر خان فوراً جواباً بولا۔ ''برابر سائیں برابر......! میں بھلا اس بات سے کہاں انکار کر رہا ہوں کہ خالقو میرے پاس نہیں آتا تھا مگر اس کی حیثیت صرف میرے گاہک جیسی تھی اور بس......!''

''اچھا......! تو پھر مجھے یہ بتا کہ خالقو تھانے سے فرار ہو کر آدھی رات کو کیا تیرے باپ کی شادی میں شریک ہونے کے لیے تیرے ہوٹل آیا تھا؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے زہرخند لہجے میں گھور کر کہا۔

آچر خان جلدی سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب......! مجھے کیا معلوم...... ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی ساتھی کے ساتھ......!''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''بکواس بند کرو اپنی......'' انسپکٹر چھٹل شاہ دھاڑا۔''اس رات جب خالقو تھانے سے فرار ہو کر تمہارے ہوٹل آیا تھا تو اس وقت تم بھی وہاں موجود تھے اور بعد میں تم نے خالقو کو ماما اللہ رکھیو کے ہاں اسے اور اس کے بھانجے کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا...... جب خالقو اپنا کام نمٹا کر تمہارے پاس واپس پہنچا تو تم نے خالقو سے چھٹکارہ پانے کے لیے اسے اپنے کسی ساتھی کے ساتھ روانہ کر دیا جس نے بعد میں راستے ہی میں خالقو کا خون کر ڈالا اور خود وہ خاموشی سے غائب ہو گیا۔'' انسپکٹر چھٹل شاہ کے پُر اعتماد لہجے اور حرف بہ حرف صورت حال کو بالکل درست خطوط پر بھانپتے پا کر آچر خان کا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا مگر وہ پھر بھی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کرتا رہا۔

انسپکٹر چھٹل شاہ نے بڑی زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔''مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تم چاچا سکھیو کی بھتیجی ملوکاں سے زبردستی شادی کرنا چاہتے ہو اور اس مقصد کے لیے تم مختلف ذرائع سے ان پر دباؤ بھی ڈالتے رہے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ملوکاں کی منگنی مقتول ماما اللہ رکھیو کے بھانجے سانول سے طے ہو چکی ہے۔''

آچر خان کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی، اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ انسپکٹر چھٹل شاہ دوران خانہ اس کے خلاف اپنی تفتیش کا دائرہ بڑی کامیابی سے پھیلاتا رہا تھا تاہم آچر خان اب تک مطمئن تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ چھٹل شاہ ابھی تک اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکا ہے چونکہ وہ اپنے خلاف ایک ثبوت خالقو کو صفحۂ ہستی سے مٹا چکا تھا اور دوسرے ثبوت یعنی بہرام کو کامیابی کے ساتھ فرار کروا چکا تھا۔

تب وہ خاصا پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔''انسپکٹر سائیں......! یہ بات درست ہے کہ میں ملوکاں سے شادی کا خواہشمند تھا مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں اسے حاصل کرنے کے لیے خود کو کسی جنجال میں ڈال دوں...... مجھے بھلا لڑکیوں کی کیا کمی ہے...... جوان اور تندرست ہوں میں...... کماتا ہوں...... مجھے تو چند ٹکوں کے بدلے ہر کوئی اپنی لڑکی دے سکتا ہے۔''

''مگر ملوکاں جیسی چھوکری تیرے جیسے کالے بیل کو کوئی نہیں دے گا نا بابا......!'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رول کو اس کی ٹھوڑی پر ٹکا کر بولا۔''دیکھو آچر خان......! اب تم مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ گے کہ تمہارا وہ دوسرا ساتھی جس

نے تمہارے کہنے پر خالقو کو قتل کیا، وہ کدھر گیا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟''

آچر خان نے ایک نظر انسپکٹر چھٹل شاہ کی طرف دیکھا پھر یکدم کینچلی بدل کر کھرے لہجے میں بولا۔''دیکھو انسپکٹر صاحب...... میں اس گوٹھ کا ایک شریف آدمی ہوں اور میرا کسی بھی تھانے میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ جس کی گواہی پورا گوٹھ دے سکتا ہے، تم مجھے عدالت کے سپرد کر دو، میں اب اپنی صفائی وہاں پیش کروں گا۔''

آچر خان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر انسپکٹر چھٹل شاہ کے تن بدن میں آگ سلگ اٹھی اور اس نے آچر خان کا گریبان پکڑ لیا پھر اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تیرے کو بعد میں عدالت کے سپرد کروں گا پہلے ذرا سرکاری مہمان خانے کی ہوا تو کھا...... میں ابھی عدالت سے ریمانڈ لیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں تیری زبان کس طرح فر فر چلتی ہے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر چھٹل شاہ نے قریب کھڑے دو سپاہیوں سے آچر خان کو لاک اپ کرنے کا حکم دیا۔

آچر خان کھردرے لہجے میں بولا۔''میں ابھی اور اسی وقت وڈیرے علی نواز سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''لے جاؤ اسے...... تم کیا منہ تک رہے ہو کھڑے......؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے آچر خان کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے سپاہیوں سے کہا اور وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح فوراً حرکت میں آئے اور آچر خان کو کھینچتے ہوئے کمرے سے لے گئے۔

☆======☆======☆

ملوکاں کو جب ماما اللہ رکھیو کی اندوہناک موت اور سانول کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو وہ دیوانہ وار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑی...... سانول کے گھر میں لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا، کچے صحن کے وسط میں ماما اللہ رکھیو کی کفن پوش لاش ایک چارپائی پر رکھی ہوئی تھی...... سانول زخمی ہونے کے باوجود ماما کی لاش کی چارپائی سے لگا بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا، اس کے بازو اور ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، چند ایک گوٹھ کے جوان اور بوڑھے اسے تسلی دینے میں مصروف تھے ملوکاں بھی رونے لگی۔ جب وہ سانول کے قریب آئی تو سانول نے اس کی سسکیوں کی آواز سن کر سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا تو یکدم چلا کر نفرت انگیز لہجے میں بولا۔''تت...... تو...... ایک منحوس چھوکری ہے...... تو ڈائن ہے...... تو نے میرے ماما کو کھا لیا...... جا...... چلی جا یہاں سے...... چلی جا...... چلی جا......''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملوکاں، سانول کی اس سنگدلانہ بے رخی پر ڈھے سی گئی اور پھر پلو میں اپنا روتا سسکتا چہرہ چھپائے وہاں سے چلی آئی۔

ماما اللہ رکھیو کو گوٹھ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا...... سانول اب بالکل تنہا رہ گیا تھا، وہ اپنے مرحوم ماما اللہ رکھیو کی خالی چارپائی کی پائینتی لگا نڈھال سا بیٹھا تھا...... ماما کی اس ناگہانی موت نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا...... اپنے ماں، باپ کے بعد دنیا میں ماما ہی اس کے لیے وہ واحد ہستی تھی، جس سے وہ بے تحاشا انسیت رکھتا تھا اور اسے اپنے لیے ایک ٹھنڈی چھاؤں سمجھتا تھا...... ماما کی مشفقانہ باتیں اور ''چھورا...... چھورا......'' کہہ کر محبت سے مخاطب کرنے کا انداز سانول کے دماغ میں بار بار گردش کر رہا تھا۔ سانول کو اپنا یہ گھر ماما کے بغیر قبرستان کی طرح ویران محسوس ہونے لگا تھا، اس نے ماما کے کپڑے، اس کی لاک، صدری، اجرک، ٹوپی اور جوتوں کو بھی سنبھال کر رکھا تھا۔ غرض اسے اپنے ماما سے اس قدر محبت تھی کہ اس کی جدائی کا غم اس سے بھلائے نہیں بھول رہا تھا...... لوگ آخر کب تک اس کے ساتھ چپکے رہتے، غمِ روزگار اور غمِ جہاں کے مارے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے اسے تنہا چھوڑ کر اپنے گھروں کو ہو لئے تھے، گھروں سے آیا ہوا کھانا بھی ویسے ہی پڑا ہوا تھا...... سانول کو اپنا ہوش نہ تھا، اسے بھلا کھانے پینے کا کیونکر ہوش رہتا، اس کا تو کام پر بھی جانے کو دل مائل نہیں ہو رہا تھا...... وہ گھر پر ہی پڑا رہتا۔ اب کون تھا اس کا جو اس کی پروا کرتا، ایک ماما ہی تو تھا جو ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والی ماں کی طرح اس کی خبرگیری رکھتا تھا...... ہاں ابھی ایک ہستی ایسی زندہ تھی جسے سانول کے درد اور غم کا پوری طرح احساس تھا اور وہ ہستی ملوکاں تھی جو اس وقت اپنی جھگی میں پڑی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی، اسے سانول کے رویے پر دکھ ہوا تھا مگر پھر اس نے یہ سوچ کر اپنے دلِ ناصبور کو تشفی دی تھی کہ سانول کا اس میں کوئی دوش نہ تھا، وہ بے چارہ غم سے چور تھا، دل میں بسنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی کوئی بات بھی بری نہیں لگتی، ان کی سنگدلی اور بے اعتنائی برداشت کی جاتی ہے اور ملوکاں بھی سانول کے روکھے اور بے اعتنا رویے کو پیتی چلی آئی تھی، یہ سب جاننے کے باوجود کہ سانول نے اس کی محبت کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا، وہ بے شک اس سے شادی کرنے پر رضامند بھی ہو گیا تھا تو یہ سب ماما اللہ رکھیو کی وجہ سے تھا، اس میں سانول کی اپنی مرضی کا ذرا بھی دخل نہ تھا اور ملوکاں اس کی وجہ بھی جانتی تھی کہ سانول ابھی تک اپنی پہلی محبت سدھوراں کو نہیں بھولا تھا، سانول نے سدھوراں کو لاکھ بھلانے کی کوشش کی تھی اور اس کی بے وفائی پر اس نے اپنے دل میں سدھوراں کے لیے نفرت کا جذبہ بھی

پیدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ سب وقتی اور عارضی ثابت ہوا تھا۔ کسی دل جلے یا من جلے نے صحیح کہا ہے کہ پہلی محبت کبھی دل سے فراموش نہیں ہوتی جسے اگر ایک دیوانہ اور فرزانہ انسان پالے تو پھر گویا اسے ساری دنیا کی خوشیاں مل جاتی ہیں، وہ اگر محبت کھو دے تو پھر عمر بھر کا عذاب ہاتھ آتا ہے اور سانول اب اس عذاب سے دوچار تھا۔ ادھر ملوکاں کا زخمی دل ''سانول...... سانول'' پکار رہا تھا، اس سے ملنے کو تڑپ رہا تھا مگر اب وہ کس کے پاس جاتی، پہلے تو ماما اللہ رکھیو تھا تو وہ اس کے بہانے اپنے سنگ دل محبوب کا دیدار کر لیتی تھی اب...... اب کیونکر یہ ممکن تھا؟ ''نہیں مجھے ہر صورت میں سانول کے پاس جانا چاہیے۔'' اچانک اس کے دلِ مہجور میں بے قراری صدا ابھری اور وہ بے چین ہو گئی۔ اسی اثناء میں اس کی چاچی اور میراں تیار ہو کر کہیں باہر جانے لگیں، ملوکاں نے پوچھا ''چاچی......! کدھر جا رہی ہے تُو......؟''

''دھیئے......! بے چارے پٹ سانول کا غم ابھی تازہ ہے نا...... وہ اکیلا پن محسوس کر رہا ہوں گا، سوچا مل آؤں۔''

''چاچی! میں بھی چلوں تیرے ساتھ......؟'' ملوکاں نے قدرے جھجک کر کہا۔

''نہیں دھیئے......! ابھی تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے...... مجھے اس سے تیرے ہی سلسلے میں ضروری بات کرنی ہے۔''

ملوکاں چپ ہو گئی پھر چاچی اور میراں کے جانے کے بعد ملوکاں اپنی ماں عجیباں کی جھگی میں آ گئی، مائی عجیباں اپنے بیٹے خالقو کی موت کے بعد نیم پاگل سی ہو گئی تھی...... وہ اپنی بیٹی ملوکاں کو دیکھ کر اسے جنونیوں کے سے انداز میں کاٹنے کو دوڑتی تھی مگر اس بار وہ اسے دیکھ کر خاموش رہی تو ملوکاں کو اس بے چاری پر ترس آ گیا اور پہلی بار اس نے اپنی ماں کو بڑے رنجور لہجے میں پکارا تو بے اختیار عجیباں اس کے گلے لگ گئی اور دونوں ماں بیٹیاں رونے لگیں۔

☆======☆======☆

چاچی اور میراں چادریں سنبھالے سیدھی سانول کے ہاں پہنچیں تو وہ چونک پڑیں، انہوں نے دیکھا سانول اپنا چھوٹا موٹا سامان باندھنے میں مصروف تھا، اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کہیں جا رہا تھا، اس کی جب ان دونوں ماں بیٹیوں پر نگاہ پڑی تو اس نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''پت سانول...... !خیر تو ہے...... تُو کہیں جا رہا ہے؟'' چاچی نے تفکر آمیز لہجے میں پوچھا۔

سانول نے ہولے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔''ہاں ماسی......! میں یہ گھر...... یہ گوٹھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں...... اچھا ہوا تُو آ گئی...... میں خود یہ بتانے تیرے پاس آنے والا تھا۔''

اس کی بات سن کر چاچی یکدم پریشان سی ہو گئی اور اسی لہجے میں اس سے بولی۔

''پٹ...... !یہ کیا ہوا تجھے...... کیا تُو ہمیں بھی چھوڑ کر چلا جائے گا...... اور...... اور وہ ملوکاں جو تیری راہ دیکھ رہی ہے، وہ...... اس کا کیا ہو گا؟''

سانول نے ایک ویران سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر دل شکستہ سے لہجے میں بولا۔''ماسی...... ! میں اب شاید اسے خوش نہ رکھ سکوں...... ماما کے مرنے کے بعد میرا اب اس سے کوئی ناتا نہیں رہا ہے اور تُو اچھی طرح جانتی ہے کہ ملوکاں سے شادی کرنے پر ماما نے ہی مجھے راضی کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے مجبوراً...... !''

''سانول...... ! یہ کیا کہہ رہا ہے تُو......؟'' اچانک چاچی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''کیا تیرے ماما کے مرنے کے بعد تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا...... کیا یہ اس کی خواہش نہ تھی کہ تُو ملوکاں سے شادی کر لے...... کیا تیرے اس فیصلے سے اس کی روح خوش ہو گی......؟ نہیں سانول پٹ...... ! یہ ظلم اس بے چاری پر نہ کر...... تُو کیا نہیں جانتا کہ ہم پر اب تک جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، وہ تیری اور ملوکاں کی وجہ سے ہوئی ہیں...... وہ بدبخت آچر خان جو اب تھانے میں بند ہے، اس نے ملوکاں سے شادی کرنے کے لیے یہ ساری گھناؤنی سازش کھیلی تھی، پہلے اس نے میرے شوہر کو قتل کروایا اور پھر بعد میں تجھے بھی ہلاک کروانے کی اس نے کوشش کی مگر خوش قسمتی سے تُو بچ گیا اور تیرا ماما قتل ہو گیا...... اس طرح ملوکاں سے شادی سے انکار کر کے تو تُو اپنے ماما کی قربانی ضائع کر دے گا۔''

''چاچی...... ! یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟'' اچانک سانول نے تڑپ کر گلوگیر لہجے میں کہا تو چاچی نے پھر اسے ساری حقیقت تفصیل سے گوش گزار کر دی کہ کس طرح بدبخت آچر خان نے اپنے مذموم مقصد کی خاطر یہ سارا گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ ساری حقیقت سننے کے بعد سانول کو چپ سی لگ گئی، تب چاچی بڑی محبت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔

''سانول پٹ...... ! کیا تُو اپنے ماما سے اتنی ہی محبت کرتا ہے کہ اس غریب کے

گزرنے کے بعد تجھے تو اس کے وعدے کو پورا کرنے کا بھی یارا نہ رہا...... نہیں سانول پٹ! اتنا کٹھور نہ بن...... غیرت مند لوگ تو اپنے بڑوں کے قول کا مرنے کے بعد بھی پاس رکھتے ہیں...... ماما نے بھی زبان دی تھی اور یہ اسی کا اصرار تھا کہ تیری اور ملوکاں کی شادی کر دی جائے...... تو خود سوچ تیرے اس طرح ملوکاں کو ٹھکرا کر جانے سے اس بے چاری کی کیا حالت ہو گی...... میں اسے جانتی ہوں وہ تو غریب جیتے جی مر جائے گی۔''

''نہیں ماسی نہیں...... ! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں ماما کا وعدہ پورا کروں گا...... مجھے معاف کر دینا، بس دکھ اور پریشانی نے میرا دماغ چڑیا کر دیا تھا...... میں اب ملوکاں سے شادی کے لیے تیار ہوں۔'' سانول نے یکدم تڑپ کر کہا اور دونوں ماں، بیٹیاں خوش ہو گئیں۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد کی منگنی والا معاملہ سنگین دوراہے پر پہنچ کر یکدم سنبھل گیا تھا اور اسے سلجھانے میں بلاشبہ ڈاکٹر جواد کی ماں ماجدہ خاتون کی معاملہ فہمی اور خوش اسلوبی کا دخل تھا۔ بہر طور قصہ مختصر...... دونوں کی منگنی ہو گئی اور شادی اور رخصتی وغیرہ کی تاریخ دونوں کی ہاؤس جاب مکمل ہونے تک موقف رکھی گئی۔ یہ منگنی سے ایک دو روز پہلے کی بات تھی، ڈاکٹر جواد نے ڈاکٹر فوزیہ کو فون کیا تو فوزیہ نے پُرشوخ لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں جناب...... ! ہوش ٹھکانے آ گئے...... آخر تم آنٹی کو بیچ میں لے آئے۔''

''ظاہر ہے تم جو میری بات سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔''

''وہ تو میں اب بھی نہیں سمجھ رہی...... کیا میں بچی ہوں؟''

''بچی تھیں تب ہی اتنی سی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔'' جواد نے شرارتی لہجے میں کہا۔ فوزیہ چڑ کر بولی۔''او...... اچھا...... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... ناراضی کی ابتداء تم نے کی تھی کہ میں نے......؟''

''اچھا کوتوالی صاحبہ...... ! اب اس بندۂ ناچیز کو معاف کر دو اور اس کڑواہٹ کو یہیں دفن کرو...... آج موسم اچھا ہے اور اس گنڈڈے کے موقع پر پیزا ہٹ چلتے ہیں...... کیا خیال ہے؟''

سدھوراں کو ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر جواد کی ذاتی چپقلش اور پھر فوراً ہی حالات معمول پر آ جانے کا بخوبی علم تھا لہٰذا وہ اب سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اسے ڈاکٹر فوزیہ سے خاموشی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ساتھ دور ہو جانا چاہیئے تھا اسے اب اپنی ہمدرد دیرینہ اور محسنہ پر اس قدر بوجھ نہیں بننا چاہیئے کہ اس کی گھریلو زندگی بھی تلپٹ ہو کر رہ جائے مگر چونکہ ابھی تک انہیں پرویز کو تلاش کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے سدھوراں کو اپنے شوہر کی گمشدگی یا فرار پر بھی پریشانی لاحق تھی مگر پھر ایک دن اس نے اپنی محسنہ سے گزارش کر ہی دی کہ وہ اسے اب اس کے اپنے گھر جانے دے کیونکہ گھر کو اتنا لمبا عرصہ خالی چھوڑنا مناسب نہیں...... دوسرے کیا خبر پرویز بھی کسی وقت اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو پھر اسے وہ سمجھا سکے کہ وہ اپنی رضا کارانہ گرفتاری دیدے تاکہ بعد میں اس کی ضمانت یا عام معافی کی کوشش کی جا سکے۔

سدھوراں کی اس توضیح پر ڈاکٹر فوزیہ نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

☆======☆======☆

عیاش صفت انسپکٹر یاور حیات، پرویز کو انسانیت سوز تشدد کی دھمکی دے کر اپنے گماشتے دلدار کے ساتھ کمرے سے جا چکا تھا، اس بار پرویز کے ہاتھوں، پیروں کو جکڑا نہیں گیا اور نہ ہی جاتے وقت انہوں نے کمرے کی بتی گل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

ان دونوں رذیلوں کے کمرے سے جاتے ہی پرویز کے دماغ میں راہِ فرار کی تدبیریں تیزی سے ابھرنے لگیں لہٰذا اس نے بغور کمرے کا جائزہ لیا، کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا، سیمنٹ کی سیدھی سپاٹ دیواریں تھیں اور ایک چار بائی چھ کا مستطیل نما روشندان تھا جو خاصی اونچائی پر نظر آ رہا تھا، جس پر ڈھکن نما شیشے دار پٹ لگا ہوا تھا جبکہ روشندان کی چوبی چوکھٹ پر آہنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں...... کمرے کا دروازہ بھی سنگل مگر مضبوط پٹ سے بنا ہوا تھا۔

پرویز اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف آ کر اس کی ناب گھما کر کھینچنے کی کوشش کی تو اسے حسبِ توقع بند پایا...... وہ تھوڑی دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اچانک اسے دروازے پر آہٹ سنائی دی، وہ جلدی سے دوبارہ اپنی جگہ آ کر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا، دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہاں اسے دلدار نظر آیا، وہ تنہا تھا، اسے اکیلا دیکھ کر پرویز ایک لمحے کو چونکا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح گردش کرنے لگا۔

دلدار اپنے عقب میں دروازہ بند کر کے اس کی طرف نظریں گاڑے آگے بڑھنے لگا پھر ذرا اس کے قریب آتے ہی ڈرامائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا ہو گیا، پرویز خونی نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورے جا رہا تھا، چند ثانیے

بعد دلدار کی گونجدار آواز ابھری۔ ''پرویز......! میں تیری یاری کو آج بھی نہیں بھولا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں آخری بار تجھے محض اسی دوستی کے ناتے سمجھانے آیا ہوں کہ اپنا دشمن نہ بن...... انسپکٹر یاور حیات کو تُو نہیں جانتا جتنا میں اسے جانتا ہوں...... وہ تیرے بارے میں کیا فیصلہ کر چکا ہے، میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کی نظریں بدستور پرویز کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور پرویز مصلحتاً اپنی غیظ ناکی پر بمشکل قابو کر کے اس کی طرف خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا...... وہ ابھی اسے بولنے کا پورا پورا موقع دینا چاہتا تھا۔ دلدار نے لحہ بھر توقف کیا اور پرویز کو اپنی طرف متوجہ پا کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''پرویز......! میں نہیں چاہتا کہ تُو بے موت مارا جائے کیونکہ تُو میرے لئے بہت اچھا دوست ثابت ہوتا آیا ہے پرنجانے کیوں اس بار تُو ایک عورت کے معاملے میں ہم سے دور ہو گیا ہے...... میں تجھے کھونا نہیں چاہتا اور اسی لئے آخری بار اور وہ بھی انسپکٹر یاور حیات کو بڑی مشکلوں سے راضی کرنے کے بعد ہی تمہیں سمجھانے آیا ہوں کہ اب بھی وقت ہے، ہماری بات مان لو کیونکہ انسپکٹر یاور حیات نے تجھے تھانے لے جانے سے پہلے ہی کاؤنٹر فائرنگ کر کے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' دلدار یہ سنسنی خیز انکشاف کرنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

پرویز کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے غصے کی بجائے خوف کی سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ادھر مکار دلدار نے اپنی بات کی اثر پذیری کو اس کے چہرے پر بھانپتے ہوئے دوبارہ اس سے کہا۔ ''پرویز......! تیرے پاس اب سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے، تُو ہماری طاقت سے واقف نہیں ہے، تُو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے مرنے کے بعد کیا ہم تیری حسین وجمیل بیوی سدھوراں کو چھوڑ دیں گے...... وہ تو خود ہی میرے رحم وکرم پر آ جائے گی۔ اس لیے تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ انسپکٹر یاور حیات کی ضد کے سامنے سر جھکا دو اور اپنی بیوی سدھوراں کو......!'' اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ انسپکٹر یاور حیات کی خصلت اور طاقت سے بخوبی واقف تھا، وہ وردی کے بھیس میں ایک جلاد صفت پولیس افسر تھا اور اپنے ناجائز اختیارات کے بل بوتے پر وہ کچھ بھی کر سکتا تھا لہٰذا اس بھاری بھرکم ہاتھی کو طیش اور جوش سے زیر کرنے کی بجائے چونٹی بن کر اس کی سونڈ میں گھس کر مارنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر پرویز نے آناً فاناً پُرجوش حکمت عملی کو مکارانہ خو میں بدلتے ہوئے اپنے چہرے پر دکھاوے کا خوف طاری کر لیا اور الجھن آمیز پریشانی سے اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہونٹ کاٹنے لگا۔

دلدار اپنی مکارانہ نظروں سے اس کے چہرے کو کھوجتا ہوا بولا۔ ''ہاں پرویز.....! اب کیا کہتے ہو ہماری بات مانتے ہو تو بولو..... ابھی میں انسپکٹر صاحب سے تمہاری گلوخاصی کرائے دیتا ہوں اور تمہارے جو اڈے سیل ہو چکے ہیں، وہ بھی چالو ہو جائیں گے۔''

''دلدار.....! یار یہ حقیقت ہے کہ میری اس دوسری بیوی نے مجھ پر نجانے کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ اس کے حسن میں اندھا ہو کر اپنے یاروں کو بھی بھول گیا۔'' بالآخر پرویز نے کینچلی بدلتے ہوئے بڑے سراسیمہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''عورت کے بارے کسی نے صحیح کہا ہے کہ یہ عورت انسان کی عقل خبط کر کے رکھ دیتی ہے پر..... اب میں کیا کر سکتا ہوں..... انسپکٹر تو مجھ پر اب بھروسہ نہیں کرے گا۔''

اس کی بات پر دلدار کے مکروہ چہرے پر جیسے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی..... وہ گرم جوشی سے آگے بڑھا اور پرویز کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ارے تُو گھبراتا کیوں ہے..... میں ہوں نا..... انسپکٹر کا پرانا نمک خوار..... بس تُو اپنی بیوی کو راضی کر لے.....''

''پر یار دلدارے..... اس کے لیے مجھے تھوڑی سی مہلت تو ملے گی ناں..... آخر کو اسے سمجھانا پڑے گا..... بلکہ سدھوراں کو باقاعدہ ڈرانا دھمکانا پڑے گا۔ اب تو وہ ایک بچے کی ماں بن گئی ہے.....'' پرویز نے دل ہی دل میں دلدار اور انسپکٹر یاور حیات پر لعنت بھیج کر کہا۔

دلدار نے پُرسوچ انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ درحقیقت پرویز کو سدھوراں کی طرف سے فکر بھی لاحق ہونے لگی تھی کہ..... جب سے اسے میٹرنٹی ہوم چھوڑ کر آیا تھا، اس کے بعد سے اسے اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی اور نہ ہی وہ دوبارہ اس بے چاری کی خیر خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔

جب دلدار وہاں سے جانے لگا تو پرویز نے کسی خیال کے تحت اسے روک کر پوچھا۔

''یار دلدارے.....! میری ایک مشکل ہے.....؟''

''کیسی مشکل ہے۔ کھل کر بول..... میں تیرا پرانا دوست ہوں ناں یار.....؟''

پرویز نے ایک بار پھر اندر ہی اندر اس کی مکروہ دوستی پر لعنت بھیجتے ہوئے دہرے دل سے چالاکی سے کہا۔ ''یار..... صاحب نے تو میرے خلاف پورے علاقے کی پولیس کو لگا دیا ہے..... اور میں جن اڈوں پر کام کرتا تھا..... اسے بند کر دیا ہے..... کیا یہاں سے جاتے ہی

پولیس مجھے گرفتار کر لے گی.....؟''

اس کی بات سن کر دلدار اسرار بھری مسکراہٹ کے ساتھ ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''ارے یار..... وہ سب ڈرامہ تھا۔ اپنا صاحب کوئی بیوقوف تھوڑا ہے کہ تجھے تھانے لے جائے۔ اس نے تو یہ معاملہ صرف اپنے تک ہی محدود رکھا ہے۔ باقی رہا سوال تیرے اڈوں کا وہ بھی چل رہے ہیں البتہ اس کا ''چارج'' اب میں نے سنبھال لیا ہے۔ پر تُو بے فکر ہو جا..... یہاں سے جانے کے بعد اپنا ہوٹل بھی دوبارہ آرام سے کھول لینا اور اڈے بھی اپنے سنبھال لینا۔''

پرویز نے ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد بالآخر مطمئن ہو کر اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر اس مردود دلدار کے وہاں سے جانے کے بعد پرویز سنجیدگی سے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ پرویز اچھی طرح جانتا تھا کہ دلدار اور انسپکٹر یاور حیات کو آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتا ہے..... یہ ٹھیک تھا کہ وہ دونوں اپنی طاقت کے زعم میں اسے چھوڑ تو دیں گے..... مگر اس کی کڑی نگرانی بھی ساتھ ساتھ کرتے رہیں گے اور انہیں ذرا بھی اس کی طرف سے کسی چالاکی کا شبہ ہوا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے..... اور پھر سدھوراں کو تر نوالہ بنانے میں بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ لہٰذا پرویز نے اب سوچ سمجھ کر آگے قدم بڑھانا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو دلدار دوبارہ کسی شیطان کی طرح نازل ہوا۔ اس بار پرویز نے دیکھا کہ اس کے مکروہ چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی..... چند ثانیے پرویز کو سپاٹ نظروں سے دیکھتا رہا پھر بالکل بدلے ہوئے لہجے میں اسے متنبہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ پرویز.....! اپنا صاحب تجھے چھوڑنے پر راضی تو ہو گیا ہے مگر اس نے تجھے خبردار کرتے ہوئے پیغام دیا ہے کہ اگر تُو نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پھر میں تجھے مارنے میں ذرا بھی دیر نہ لگاؤں گا۔ اس کے بعد ہمارا کام خود ہی آسان ہو جائے گا کیونکہ سدھوراں اکیلی رہ جائے گی اور خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آ گرے گی۔''

دلدار کے مکروہ لہجے سے پرویز کے رگ و پے میں ایک لمحے کو موت کی سرسراہٹ ابھری تھی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے فوراً کہا۔ ''نہیں..... اب میں تم لوگوں کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں..... میں نے پہلے ہی تم لوگوں سے بھاگ کر غلطی کی اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ سدھوراں بھی میری دربدری کی وجہ سے کب تک تنہا مصیبت جھیلے گی..... میں اب اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کروں گا آخر کو وہ میری بیوی ہے..... اپنے لئے اور میری خاطر اسے اب میری بات ماننا ہی پڑے گی۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرویز کے بہ ظاہر مستحکم لہجے پر دلدار خوش ہو گیا۔ پھر اس کے بعد پرویز کو خاموشی کے ساتھ انسپکٹر یاور حیات کے اس دور افتادہ علاقہ میں واقع نو تعمیر شدہ بنگلے سے روانہ کر دیا گیا۔ پرویز نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے قیوم آباد والے مکان کی طرف روانہ ہوا۔

اب اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سرتاپا آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس کی رگ رگ میں خون لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ اس نے اب یہ پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اسے جیسے ہی موقع ملا...... تو ان دونوں شیطانوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مگر...... اب وہ ہر قدم نہایت ہوشیاری کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بہت مہلت تھی۔

جب ٹیکسی گورا قبرستان سے کالا پل کی طویل سڑک پر مڑی تو پرویز کو اچانک اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ اسے شاید یہ بات دیر سے معلوم ہوئی تھی کہ ایک ہرے رنگ کی ہائی روف مسلسل ذرا فاصلے سے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ پہلے تو پرویز نے اسے محض اپنے وہم سے محمول کیا مگر اچھی طرح تصدیق کرنے کی خاطر اس نے محمود آباد چورنگی سے ٹیکسی والے کو بائیں جانب مڑنے کا اشارہ دیا اور پہلے اعظم بستی اور پھر منظور کالونی کے علاقہ میں بے مقصد ٹیکسی کو گھمانے کے دوران اس نے دیکھا کہ وہ ہرے رنگ کی ہائی روف مسلسل اس کے تعاقب میں ہے تو اس نے ایک گہری سانس لے کر ٹیکسی والے کو سیدھا قیوم آباد کا رخ کرنے کو کہا۔

قیوم آباد کے اسٹاپ پر ہی پرویز نے ٹیکسی کو رکنے کا کہا۔ پھر اسے اجرت دینے کے بعد وہ پیدل آبادی کی طرف بڑھ گیا۔

اپنی گلی کے نکڑ پر بنے ایک کیبن سے اس نے گولڈ لیف کے دو سگریٹ خریدے اور اسے پان بنانے کو کہا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے کن انکھیوں سے اپنے عقب میں دیکھا تو وہاں ہرے رنگ کی ہائی روف اس سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پرویز نے ایک لمحے کے اندر انہیں تاڑا۔ ہائی روف کے اندر چار افراد موجود تھے۔ اس میں سے دو شخص اس کا ''سلائیڈنگ ڈور'' کھول کر نیچے اتر آئے تھے۔ پرویز کیبن والے کو پیسے دیتا ہوا بہ ظاہر لاتعلق سا آگے بڑھ گیا۔

اب اپنے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے سدھوراں گھر پر ہی موجود ہو۔ پھر جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو اس کا دل خوشی سے دھڑکا۔ دروازے پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سدھوراں

نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یعنی اس نے کہیں اور رہنے کی بجائے اپنے گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی...... اس طرح پرویز اس سے ملنے کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔

پرویز نے خوشی اور تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دروازے پر دستک دی تو اندر سے فوراً ہی سدھوراں کی مترنم آواز ابھری۔ ''کون ہے؟''

''س...... سدھوراں......! دروازہ کھول...... میں ہوں پرویز......''

اور اگلے ہی لمحے دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ سامنے سدھوراں کا متغیر چہرہ جیسے صدیوں سے اس کا منتظر تھا۔ پرویز غڑاپ سے اندر گھس گیا۔ اپنے شوہر کو زندہ سلامت پا کر اس بیچاری سدھوراں کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

''پ...... پرویز...... یہ تم ہو...... مجھے یقین نہیں آ رہا......''

''ہاں سدھوراں......! یہ میں ہوں...... چل آ...... اندر تیرے سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' پرویز نے کہا۔ سدھوراں اس وقت کپڑے دھو رہی تھی۔

وہ دونوں اندر کمرے میں آ گئے تو اچانک پرویز کی نگاہ سامنے مسہری پر ایک ننھے منے بچے پر پڑی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''سدھوراں......! یہ ٹھیک تو ہے...... اور...... اور...... تیری طبیعت کیسی ہے...... تجھے ابھی کام تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔''

پرویز کو بچے کی طرف سے خوش ہوتا پا کر سدھوراں کا ہنستا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

''یہ بالکل ٹھیک ہے...... اور میں بھی ٹھیک ہوں......'' پھر اس نے بچے کا نام اسے بتاتے ہوئے مزید کہا۔ ''تمہارے جانے کے بعد پہلوان جی اور بعد میں ڈاکٹر فوزیہ بھی آئے تھے پھر ڈاکٹر فوزیہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھیں مگر میں چند دن وہاں رہنے کے بعد اس خیال سے دوبارہ ادھر آ گئی کہ تم میرے پاس ضرور آؤ گے...... کہیں گھر پر تالا پڑا دیکھ کر لوٹ نہ جاؤ......''

''یہ تم نے بڑی عقلمندی کا کام کیا۔'' پرویز نے کہا۔ پھر اس نے بچے کی پیشانی کو دھیرے سے چوما۔ بچہ سو رہا تھا۔ پرویز بولا۔ ''بھئی اس بچے کا نام کچھ بھی ہو...... میں اسے ''کاکا'' کہوں گا......''

سدھوراں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی مگر پھر دوسرے لمحے متفکر لہجے میں پرویز سے بولی۔ ''پرویز......! تم اب کہیں نہیں جاؤ گے ناں...... تمہارے پیچھے تو پولیس لگی ہے ناں...... مگر تم بالکل بے فکر ہو جاؤ...... ڈاکٹر فوزیہ نے تمہاری قبل از وقت گرفتاری ضمانت کے لیے ایک وڈے پولیس افسر سے بات رکھی ہے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی بات پر پرویز کے ہونٹوں پر بڑی زہر خند مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں سدھوراں سے بولا۔ ''میرے پیچھے کوئی پولیس ویلس نہیں لگی ...... یہ سب اس کمینے شیطان دلدارے کی بدمعاشی تھی۔ انہوں نے اپنے مکروہ مقصد کی خاطر یہ سارا ڈرامہ رچایا تھا۔ اب میری بات غور سے سن......''

پھر پرویز نے اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کیا پھر بولا۔ ''دیکھو سدھوراں ......! تجھے اب ذرا ہمت سے کام لینا ہوگا...... ہمارے اردگرد بھوکے بھیڑیوں کا جمگھٹا ہوگیا ہے......اس وقت بھی دشمنوں کے کچھ کتے باہر ہماری نگرانی کررہے ہیں۔ ہمیں بہت جلد یہ علاقہ بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دینا ہوگا......'' پرویز نے اپنی بات مکمل کرتو بے چاری سدھوراں کا دل دھک سے رہ گیا۔

☆======☆======☆

زمیندار رحیم بخش، گوٹھ رمضان پور کا ایک معتبر شخص تھا۔ سارنگ نے اس کی اوطاق میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ اس کی بھابی اللہ وسائی اور فریدو کو اندر حویلی کے ملازموں والے زنان خانے میں رکھا گیا تھا۔ زمیندار رحیم بخش ایک نیک طینت اور خداترس انسان تھا...... وہ جمعرات کے جمعرات اپنی اوطاق میں اللہ واسطے لنگر (خیرات وغیرہ) کرتا رہتا تھا۔ نیز مصیبت کے ماروں کے بھی کام آتا تھا۔ ایسے نیک شخص کی شہرت بھی نیک ہوتی ہے۔ ایک مقامی آدمی کے مشورے پر ہی سارنگ نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ پھر بہت جلد ہی سارنگ کو معلوم ہو کہ چند گھروں پر مشتمل قریبی گوٹھوں میں تھر سے آئے ہوئے قافلوں میں ایک کارواں سائیں بخش کا بھی تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی زمیندار رحیم بخش نے فوراً اپنے دو آدمیوں اور ایک بیل گاڑی کا بندوبست کیا پھر سارنگ اور بھابی اللہ وسائی وغیرہ کو اس میں سوار کروا کر روانہ کردیا۔

یہ لوگ علی الصباح زمیندار رحیم بخش کی اوطاق سے روانہ ہوئے تھے۔ سڑک پار کرنے کے بعد دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ فضا میں حبس اور گرمی کا عنصر غالب تھا......سارنگ اور بھابی اللہ وسائی کے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہو رہی تھی۔ سارنگ کے چشم تصور میں بار بار میراں کا گلنار چہرہ رقصاں تھا جو بے چاری جانے کب سے اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ پھر اسے اپنی ماں عجیباں، باپ مٹھل، بہن ملوکاں بھی یاد آنے لگے اور مسرور دل سے سوچنے لگا کہ یہ سب لوگ اسے دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ ادھر بھابی اللہ

وسائی کو اگرچہ صرف اپنا شوہر خالقو ہی نہیں اپنی ساس اور نندیں بھی یاد آرہی تھیں۔ مگر اپنے آلی موالی شوہر خالقو کو یاد کرکے ایک عجیب سا دکھ محسوس کررہی تھی۔ اسے وہ عبرت انگیز گھڑیاں یاد تھیں جب گھر سے نکلتے وقت ایک پُراسرار بیماری کی وجہ سے نہ صرف قافلے سے علیحدہ کردیا گیا تھا بلکہ اس کے شوہر خالقو نے اسے بری طرح دھتکار دیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ اس کا دیوار سارنگ اس کے بعد اس کے بچے کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا تھا اور اس کے دل نے یہ گوارا نہ کیا تھا کہ اپنی بھابی اور معصوم ننھے منے بھتیجے کو تھر کے تپتے ہوئے ویران ریگزار میں بھٹکنے کو چھوڑ دے۔

اللہ وسائی کو اب جہاں اپنوں کے عنقریب ملنے کی خوشی ہورہی تھی وہاں اسے یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ نجانے اس کا شوہر خالقو اسے قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔

''کیا سوچ رہی ہو...... بھابی...... کیا تجھے خوشی نہیں ہورہی کہ اب ہم بہت جلد اپنوں سے ملنے والے ہیں؟'' سارنگ نے اس کے چہرے کے پریشان کن تاثرات کو بھانپتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

اللہ وسائی جلدی سے اپنی آنکھوں میں اتری ہوئی نمی کو اجرک نما چادر کے پلو سے پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں ادا......! مجھے بھلا کیسے نہیں خوشی ہوگی ...... ساس ماں، بہن ملوکاں، پیو اور چاچا سکھیو، میراں یہ سب مجھے یاد آتے ہیں، میں انہیں کیسے بھلا سکتی ہوں......''

''......اور...... ادا خالقو......؟'' سارنگ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اللہ وسائی کے چہرے کا چھپا ہوا دکھ آزردگی کی صورت میں نمایاں ہوگیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے اداس لہجے میں بولی۔ ''ہاں...... ہاں وہ بھی یاد تو آتا ہے......مگر پتہ نہیں اب مجھے قبول کرتا بھی ہے کہ نہیں......''

''کیسے نہیں کرے گا تجھے قبول......'' سارنگ تنک کر حوصلہ افزا لہجے میں بڑی رسان سے بولا۔ ''تُو اس کی بیوی ہے، اس کے بچے کی ماں ہے......اور ویسے بھی اب کون سا تجھے کوئی بیماری ہے ...... میں ہوں نا......مت دل چھوٹا کر...... میں سمجھاؤں گا ادا خالقو کو...... اب پہلے والے حالات نہیں رہے...... مجھے یقین ہے یہ لوگ سب اب سکھی ہوں گے بلکہ بے چینی سے ہمارا انتظار کررہے ہوں گے...... تو دیکھنا ہمیں دیکھ کر وہ لوگ سب کتنا خوش ہوں گے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارنگ کی تسلی تشفی پر بھابی اللہ وسائی کے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ وقت نے ان سے اب تک کتنا خراج وصول کیا تھا......؟ خالقو اپنے اعمالوں کی سزا بھگت کر اس جہان سے کوچ کر گیا تھا اور مٹھل اور چاچا سکھیو بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ بہر طور...... انہی سوچوں اور باتوں کے درمیان سفر جاری رہا۔ مین شارع کو پار کرنے کے بعد کلر اور سیم زدہ زمین کا سلسلہ اختتام کو پہنچا تو چھدری چھدری جھاڑیوں والا چٹیل میدان شروع ہوا۔ پھر مختصر سے ایک کیکر اور آسریں کے گنجان جنگل کو پار کرنے کے بعد کھیتوں کے سلسلے شروع ہوئے کہ انہیں دور سامنے کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے دل خوشی کے مارے بے طرح دھڑکنے لگے۔ پھر سب سے پہلے جس گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے وہاں سانول رہتا تھا...... اتفاق سے دور ایک قریبی کھیتوں میں بے دلی کے ساتھ کام میں مصروف تھا اور سب سے پہلے ان لوگوں نے اس سے ہی مٹھل اور چاچا سکھیو کے بارے میں پوچھا تو سانول چونک کر انہیں تکنے لگا۔ پھر گاڑی بان نے سانول کو سارنگ اور اللہ وسائی کے بارے میں بتایا کہ سارنگ مٹھل ہاری کا بیٹا ہے اور اللہ وسائی اس کے بڑے بیٹے خالقو کی بیوی ہے۔ سانول نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مٹھل اور چاچا سکھیو کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مگر سردست اس نے سارنگ اور بھابی اللہ وسائی کو چاچا سکھیو اور مٹھل کی موت کے بارے میں نہیں بتایا۔ اب سانول بھی ان کے ساتھ بیل گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔

قصہ مختصر...... سانول انہیں لے کر جھگیوں قریب پہنچا...... پھر گاڑی بان اور زمیندار کا شکریہ ادا کر کے سانول نے انہیں روانہ کر دیا۔ اگرچہ اس نے روایتاً ان سے کھانے پینے کا پوچھا تھا مگر انہوں نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی تھی اور لوٹ گئے تھے۔

سب سے پہلے سارنگ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جھگی میں قدم رکھا تو اسے پوری جھگی میں عجیب سی سوگوار ویرانی سی محسوس ہوئی...... جھگی کے بوسیدہ صحن میں اس کی بوڑھی ماں عجیباں حقہ پینے اور کھانسنے میں مصروف تھی۔ سارنگ اپنی ماں کو پہلے تو پہچان نہیں پایا تھا، جو پہلے سے کہیں زیادہ ضعیف اور ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ سارنگ کا دل ماں کی حالت پر کڑھ سا گیا۔ تب پھر اچانک رسوئی میں کام کرتی ہوئی سارنگ کی بہن ملوکاں کی نظر سب سے پہلے...... اپنے بھائی پر پڑی اور بے اختیار خوشی سے چلائی۔

''ادا سارنگ۔'' پھر وہ دیوانہ وار خوشی سے دوڑتی ہوئی سارنگ سے لپٹ گئی۔

''سارنگ'' کا نام سن کر حقہ جمائے بیٹھی عجیباں بھی ایک لمحے کے لئے چونک گئی...... اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیچاری کو تو اب دکھائی بھی کم دینے لگا تھا۔ مگر اپنی ملوکاں کے منہ سے ''سارنگ'' اس کی سماعتوں تک پہنچ گیا تھا، جو تڑپ کر کپکپاتے ہوئے اٹھنے لگی۔

''میڈا پٹ...... سارنگ......؟ کدھر سے لوٹا تو......'' مائی عجیباں کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

سارنگ آہستگی سے ملوکاں کو علیحدہ کرتے ہوئے ماں کی طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ ''اور امڑ گودی......! کیسی ہے تو...... یہ تجھے کیا ہو گیا ہے......''

''ہائے پٹ......! تو کدھر تھا...... تجھے دیکھے ہوئے تو میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔'' عجیباں زار وزار روتے ہوئے لرزاں لہجے میں بولی۔ اسی اثناء میں ملوکاں بھی بھائی کے قریب آگئی اور اس سے لپٹ کے رو پڑی...... سارنگ اپنی بہن کو اس طرح رنجور خاطر ہوتے روتا دیکھ کر پریشان سا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا...... جھگی کے باہر کھڑے سانول نے پکارا۔ ''بابا...... اب میں چلتا ہوں......''

سانول کی آواز سن کر ملوکاں چونک سی گئی...... سارنگ کو بھی یاد آیا کہ باہر وہی بھلا مانس جوان ابھی تک کھڑا تھا جو انہیں یہاں تک لایا تھا۔ بھابی اللہ وسائی...... اپنی ساس عجیباں کو سنبھالے ہوئے تھی۔ ننھے منٹھو کو ملوکاں نے اپنی گود میں بھر لیا تھا۔ فرید والبتہ ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔

''ادا...... یہ سانول...... تمہارے ساتھ آیا ہے......'' اچانک ملوکاں نے بھائی سے پوچھا۔

سارنگ چونکا، وہ بولا۔ ''تو اسے جانتی ہے......؟''

''ہاں ادا......!'' ملوکاں اتنا کہہ کر شرما سی گئی۔ تب پھر مائی عجیباں نے بتایا کہ سانول اس کا ہونے والا بہنوئی ہے...... اب تو سارنگ کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ فوراً باہر لپکا اور ایک طرف خاموشی سے سر جھکائے سانول کے گرمجوشی سے گلے لگ گیا۔ اسے یہ سیدھا سادا اور شریف النفس نوجوان اچھا لگا تھا جو اس کا ہم عمر تھا۔

سارنگ، سانول کو لئے اندر آگیا۔ اندر...... کیا دیکھتا ہے بھابی اللہ وسائی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اب صورت حال بدل گئی تھی۔ اب عجیباں اور ملوکاں بھابی اللہ وسائی کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سارنگ کو حیرت کو جھٹکا لگا۔ اسے دیکھ کر اللہ و... روتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ ''ادا سارو......! بابا گزر گیا۔ میرا سر کا سائیں خالقو اس دنیا میں نہیں رہا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارنگ کے دل کو جیسے گھونسہ لگا اور پھر ملوکاں نے رفتہ رفتہ اپنے بھائی سارنگ کو باپ اور بھائی کی اندوہناک موت کے بارے میں بتا دیا...... سانول تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر لوٹ گیا تھا۔ جھگی میں سوگواری چھائی رہی۔ اسی اثناء میں ملوکاں چاچی اور میراں کو بھی اپنی جھگی میں لے آئی۔ سب نے مل کر مرنے والوں پر آنسو بہائے اور پھر ان کی مغفرت کی دعائیں کیں۔ مرنے والوں پہ صبر آ ہی جاتا ہے کیوں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے، جس کا ہر شخص نے ذائقہ چکھنا ہے۔

سارنگ کو دیکھ کر میراں کے دل کی دنیا جیسے دوبارہ آباد ہو گئی تھی۔ اس کا بجھا بجھا سا رہنے والا گل گلزار چہرہ اب دوبارہ بہار کی طرح کھل اٹھا تھا۔ خود سارنگ بھی اس کیفیت بہار سے گزر رہا تھا۔ میراں کا رخ روشن دیکھے جیسے صدیاں بیت گئی تھیں۔

مائی تھیاں کو اب عقل آ گئی تھی اور ویسے بھی اب عمر کے ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ عقل ٹھکانے ہو یا نہ ہو، زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ بہر طور...... میراں اور سارنگ کی بات پکی کر دی تھی۔ مگر اب سب سے پہلے ملوکاں کو رخصت کرنا تھا۔

پھر سانول اور ملوکاں کی شادی کا دن آ پہنچا۔ سہیلیاں سکھیاں گانے لگیں۔ تنگ و تاریک جھگی میں خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے...... خوشیاں منانے اور شادیانے بجانے والے کتنے سادہ دل ہوتے ہیں...... انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ خوشیاں تھوڑی غم بہت ہے۔

☆======☆======☆

انسپکٹر چھٹل شاہ کی اپنی سی پوری کوشش تھی کہ بدبخت آچر خان کا رابطہ وڈیرے علی نواز سے نہ ہو مگر باوجود کوشش کے ایسا نہ ہو سکا...... لاک اپ میں ہونے کے باوجود آچر خان کا ایک ملاقاتی کسی طرح آچر خان سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا بس پھر کیا تھا، اس دن وڈیرے علی نواز کا ایک خاص آدمی چند ساتھیوں سمیت تھانے آن پہنچا۔

''انسپکٹر سائیں...... ! ہمیں سائیں بھوتار نے بھیجا ہے، وہ آپ کو سلام کہتا ہے، اس کا ایک آدمی آپ نے پکڑ رکھا ہے آچر خان...... !''

''ہاں تو میں کیا کروں بابا...... ! چھوڑ دوں اسے...... ؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ طنزیہ لہجے میں وڈیرے کے حواری کی بات کاٹ کر بولا۔

وہ حواری قدرے جز بز سا نظر آنے لگا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ہاں...... ! وڈیرے سائیں نے اس کی ضمانت بھیجی ہے۔''

''مجرم قتل کے جرم میں مطلوب ہے، اس کی ضمانت صرف عدالت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''پر انسپکٹر سائیں! قتل کا جرم ابھی ثابت تو نہیں ہوا ناں...... ؟ آپ اپنی تفتیش جاری رکھیں، آپ کو کون منع کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب کھڑے آدمیوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ ''اڑے جانو...... ! آگے آؤ۔''

اس کے حکم پر ایک شخص نے اپنی قمیض کی اندرونی صدری کی تھیلا نما جیب سے ایک موٹا اور ذرا بڑا لفافہ نکال کر اسے فوراً میز پر انسپکٹر کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے...... ؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے لفافے پر اچٹتی سی نظر ڈال کر پوچھا۔

حواری اپنے ہونٹوں پر مکارانہ انداز کی مسکراہٹ بکھیر کر بولا۔ ''یہ کچھ نوٹ بھوتار سائیں نے آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں، اسے قبول کر لیں۔''

''تم مجھے رشوت دے رہے ہو؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے اس کا اشارہ سمجھ کر گھورتے ہوئے کہا۔

''نانا سائیں نا...... ! یہ رشوت نہیں ہے، یہ تو ضمانت ہے صرف پچاس ہزار ہی تو ہیں۔''

اس کی بات سن کر انسپکٹر چھٹل شاہ کو جیسے کرنٹ لگا اور وہ غصے سے بھناتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ ''کھڑے ہو جاؤ...... !''

وڈیرے کا خاص آدمی جس کا نام یار خان تھا، یکدم گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ لفافہ اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ ورنہ رشوت دینے کے الزام میں تمہیں بھی اندر کر دوں گا سمجھے تم...... ؟'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ اس کے چہرے تناؤ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے غصے پہ بمشکل قابو پائے ہوئے ہے۔

''مگر سائیں بھوتار نے تو یہ روپے...... !''

''تم نے سنا نہیں...... ؟ یہاں سے دفع ہو جاؤ...... حرام کھانے والے دوسرے پولیس افسر ہوتے ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔'' انسپکٹر چھٹل شاہ نے بدستور گرم لہجے میں کہا تو وڈیرے کے حواری نے خاموشی سے لفافہ اٹھایا اور پھر ایک نگاہ انسپکٹر چھٹل شاہ کے چہرے کی طرف ڈالتے ہوئے اپنے دانت بھینچتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وڈیرے علی نواز کے آدمیوں کے تھانے سے رخصت ہوتے ہی انسپکٹر چھٹل شاہ نے فوراً محرر نبی بخش کو اپنے کمرے میں بلایا...... اسے آچر خان کے خلاف چالان تیار کرنے کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکم صادر کیا۔

انسپکٹر چھٹل شاہ صحیح معنوں میں قانون کا رکھوالا تھا، دیانتدار اور فرض شناس..... وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا تھا، اگرچہ دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر نہ لینے کا محاورہ اسے بھی معلوم تھا مگر ایسے مگرمچھوں سے وہ نمٹنا اچھی طرح جانتا تھا۔

وڈیرے علی نواز کے خاص آدمی یار خان کو گئے ابھی ذرا ہی دیر گزری تھی کہ اچانک باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری پھر چند لمحوں بعد ہی ایک بھاری بھرکم اور رعب دار آدمی چق اٹھا کر اندر داخل ہوا۔ یہ وڈیرا علی نواز تھا، اس کے چہرے پر روایتی کرختگی اور آنکھوں میں رعونت کھنڈی ہوئی تھی، اس نے بے داغ کڑکڑاتی ہوئی سفید شلوار، قمیض زیب تن کر رکھی تھی، سر پر شیشے کے کام والی سرخ ٹوپی اور کاندھوں پر اجرک نے اس کی شخصیت کو مزید بارعب بنا رکھا تھا، اس کی بغل میں ہولسٹر کی پٹی بھی جھول رہی تھی۔

اس کے ہمراہ چھ سات بندوق بردار حواری تھے، ان میں یار خان بھی تھا جو اب کینہ توز نظروں سے انسپکٹر چھٹل شاہ کو استہزائیہ انداز میں تکے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''اب بولو..... ذرا ہمارے بھوتار سائیں کے آگے .....''

انسپکٹر چھٹل شاہ، وڈیرے علی نواز اور اس کے بندوق بردار حواریوں کو دندناتے ہوئے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ذرا بھی مرعوب نہ ہوا، وہ اپنی جگہ لاپرواانداز میں بیٹھا رہا۔

''اڑے بابا..... تم نے ہمارے آدمی (یار خان) کو کیوں واپس کر دیا؟'' وڈیرے نے جھٹکے دار لہجے میں انسپکٹر چھٹل شاہ سے کہا۔ انسپکٹر نے ابھی تک اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا تاہم وہ اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے غصے سے اردلی کو مخاطب کر کے بولا، جو وڈیرے اور اس کے آدمیوں سمیت گھبرایا ہوا اندر آ گیا تھا اور اس کے ہمراہ تین چار پولیس والے بھی در آئے تھے۔

''محمد بخش! تم کو ابھی تک دروازے پر ڈیوٹی سنبھالنی نہیں آئی ہے۔'' پھر وہ ساتھ کھڑے پولیس والوں سے بولا۔ ''کیا میں تم لوگوں کو بھی تمہاری ڈیوٹی سمجھاؤں.....؟''

اردلی محمد بخش اور دیگر پولیس والے نظریں چرانے لگے تو وڈیرا علی نواز دانت پیستے ہوئے انسپکٹر سے بولا۔ ''انسپکٹر..... تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا.....؟''

''وڈیرا علی نواز..... یہ تھانہ ہے، تمہاری اوطاق نہیں..... تمیز سے بات کرو، میں ہوں ذرا اور قسم کا تھانیدار..... سمجھے تم.....!'' انسپکٹر چھٹل شاہ کو بھی طیش آ گیا۔

وڈیرا علی نواز اس کے چہرے پر اپنی سنسناتی ہوئی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

''انسپکٹر..... یہ پورا علاقہ ہماری اوطاق ہے اور ہم جب چاہیں اپنی اوطاق سے تم جیسوں کو نکال باہر کر سکتے ہیں۔'' اس کے واضح الفاظ پر انسپکٹر چھٹل شاہ کو بھی غصہ آ گیا۔

''وڈیرا علی نواز..... اپنے آنے کا مقصد بیان کرو، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''وقت تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وڈیرا علی نواز کرسی کھینچ کر براجمان ہو گیا پھر ذرا معتدل لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھو بابا بیٹھو..... تم سے آرام سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں سن رہا ہوں..... تم بات کرو۔''

''انسپکٹر..... آچر خان کو تم نے کس جرم میں لاک اپ کر رکھا ہے؟'' وڈیرے نے پوچھا۔

''وہ دہرے قتل کی واردات میں ملوث پایا گیا ہے۔''

''کوئی ثبوت ہے اس کا تمہارے پاس.....؟''

''مقتول خالقو کا پیرا اس کے ہوٹل تک پایا گیا ہے جو اللہ رکھیو کو قتل کر کے بھاگا تھا، شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں ثبوت مٹانے کی خاطر آچر خان کے ہی ایک گمنام ساتھی نے اس کے کہنے پر خالقو کا بھی قتل کر دیا۔''

''ہونہہ..... شواہد.....'' وڈیرا علی نواز استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''انسپکٹر..... تم کس دنیا میں رہتے ہو بابا..... صرف پیرا ملنے سے کیا ہوتا ہے، اچھا چلو چھوڑو تم اپنی تفتیش جاری رکھو، میں آچر خان کی تحریری ضمانت دیتا ہوں، اسے چھوڑ دو اور جب بھی اس کی تمہیں ضرورت پڑے، وہ تھانے آ جائے گا ورنہ مجھے دوسری صورت میں اوپر والوں سے بات کرنا پڑے گی اور تم نے تو ابھی تک عدالت سے ریمانڈ بھی نہیں لیا ہے۔''

اس کی بات سن کر انسپکٹر چھٹل کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے پھر وہ بولا۔

''وڈیرا علی نواز..... تم مجھے قانون پڑھانے کی کوشش مت کرو..... میں نے ابھی آچر خان کا چالان تیار کیا ہے، عدالت سے ریمانڈ بھی لے لوں گا۔''

''اڑے بابا انسپکٹر صاحب..... ہم نے کہا ناں تم اپنی تفتیش جاری رکھو جیسے ہی آچر خان کے خلاف ثبوت تمہارے ہاتھ لگا، ہم خود اسے کان سے پکڑ کر ادھر حاضر کر دیں گے..... اب کم از کم تمہیں ہماری آمد کا تو خیال کرنا ہی پڑے گا ناں.....'' وڈیرے نے متحمل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور پھر انسپکٹر چھٹل شاہ نے چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد سپاہی کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آچر خان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔

''بہت مہربانی انسپکٹر صاحب......! تم نے ہماری عزت رکھ لی۔'' یہ کہتے ہوئے وڈیرا علی نواز اٹھ کر اس سے مصافحہ کرنے لگا۔

☆======☆======☆

شادی کا ہنگامہ تھما تو ملوکاں، سانول کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔

ماما اللہ رکھیو کے بغیر ملوکاں کو یہ گھر ویران ویران سا محسوس ہوا تھا، ایک سوگواریت سی چھائی ہوئی تھی، سانول کی دلہن بننے کے بعد ملوکاں کو یوں لگا جیسے اس کی برسوں کی آرزو پوری ہوگئی ہو...... سانول کی صورت میں اسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا اور وہ اب اس کے ساتھ ساری زندگی بتانے کی آرزو رکھتی تھی۔

وہ دلہن بنی کوٹھری میں ایک صاف ستھری رلی بچھی چارپائی پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور اپنے سانول کے آنے کی شدت سے منتظر تھی پھر دفعتاً اس کی دم بخود ساعتوں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی، اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا مگر یہ کیا...... آنے والا ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کر کے ساتھ والی چارپائی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔

ملوکاں نے سر نہوڑ رکھا تھا...... کوٹھری میں لالٹین روشن تھی، چند لمحے کوٹھری میں اسرار بھرا سناٹا طاری رہا پھر اس کے بعد دوسری چارپائی پر چرچرانے کی آواز ابھری اور ملوکاں عجیب سی الجھن کا شکار ہوگئی کیونکہ اب اس کی منتظر ساعتوں میں کسی کے واپس جانے کے قدموں کی آواز ابھری تھی۔

ملوکاں نے بے چین سی ہو کر ذرا گھونگھٹ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا تو سانول باہر جا رہا تھا، وہ اچنبھے کا شکار ہوگئی، چند ثانیے وہ اسی طرح خاموشی سے بیٹھی رہی پھر جب خاصی دیر تک سانول دوبارہ اندر نہ آیا تو وہ پریشان سی ہوگئی تب وہ شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چارپائی سے اٹھی اور کوٹھری سے نکل کر صحن میں آ گئی...... سامنے شکستہ صحن کے وسط میں بچھی کھری چارپائی پر سانول سر جھکائے گم صم سا بیٹھا تھا...... آسمان پر ٹکے طباق چاند کی روشنی میں ملوکاں، سانول کی طرف بڑھی پھر دھیرے سے اس کے کاندھے پر اپنا حنائی ہاتھ دھرتے ہوئے اسے پکارا۔'' سانول......؟''

سانول نے جو پاؤں لٹکائے چارپائی پر گم صم سا بیٹھا تھا، دھیرے سے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو ملوکاں کو اس کا چہرہ اداس سا دکھائی دیا، اس نے کچھ کہے بغیر دوبارہ

اپنا سر جھکا لیا۔

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی سائیں......؟'' ملوکاں نے ہولے سے پوچھا۔

سانول اسی طرح جھکے جھکے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔'' ماما یاد آ رہا ہے، آج وہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا، تیرے سے شادی میں نے اس کے کہنے پر ہی کی تھی۔'' اس کے لہجے میں اداسی گھلی ہوئی تھی مگر ملوکاں اس کی بات سن کر اپنا دل مسوس کر رہ گئی پھر وہ شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

''کیا مجھ سے شادی کرنے میں تیری اپنی مرضی شامل نہ تھی......؟''

''نہیں......! یہ بات نہیں ہے دراصل میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا پر ماما......!''

اتنا کہہ کر وہ رکا پھر جیسے فوراً ملوکاں کی دلجمعی غرض سے چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولا۔'' چلو اندر چلتے ہیں۔''

☆======☆======☆

وڈیرے علی نواز کی ضمانت پر رہائی پاتے ہی آچر خان کا دماغ جیسے یکدم آسمان پر پہنچ گیا تھا، وہ اب اکڑ کر چلنے لگا تھا مگر جب اسے ملوکاں کی سانول سے شادی کا علم ہوا تو جیسے اس کے پورے وجود میں انتقام کی آگ سی بھر گئی۔

اس نے ملوکاں کی سانول سے شادی کو اپنی انا اور غیرت کا مسئلہ بنا لیا بس پھر کیا تھا، وہ اسی رات اپنی دونالی بندوق سنبھالے تاریکی میں خاموشی کے ساتھ اور تن تنہا سانول کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ادھر سارنگ اپنی بہن ملوکاں کو رخصت کرنے کے بعد چپکا نہیں بیٹھا تھا...... حالات نے اسے محتاط اور بے جگر بنا ڈالا تھا، اسے مردود آچر خان کی چیرہ دستیوں کا بخوبی علم ہو چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آچر خان ضمانت پر آج ہی رہا ہوا تھا، وہ جانتا تھا کہ آچر خان اس کی بہن ملوکاں سے شادی کرنے کے لیے کیسی کیسی گھناؤنی سازشوں کے تانے بانے بنتا رہا تھا اور اس نے کس طرح اس کے لالچی بھائی خالقو کو اپنا آلہ کار بنایا تھا جو بعد میں خود بھی آچر خان کی بربریت کا نشانہ بن کر مکافاتِ عمل کا شکار ہوگیا تھا چنانچہ اب سارنگ، آچر خان سے غافل نہیں رہنا چاہتا تھا لہٰذا جب اس نے دیکھا کہ آچر خان بھی آج ہی کے دن رہا ہوا ہے تو سارنگ نے اس موذی کی ٹوہ لینا شروع کر دی تھی، اس کی چھٹی حس کی خطرے کا الارم بجا رہی تھی...... رات ہوتے ہی وہ کلہاڑی سنبھالے بطور محافظ اپنی بہن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملوکاں کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر سانول اور ملوکاں بے خبر اپنی کوٹھری میں سو رہے تھے، رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی، اچانک صحن کی ایک دیوار پہ سایہ لہرایا، یہ آچر خان تھا، اس کی کمر سے بندوق جھول رہی تھی، وہ جنگلی بلے کی طرح چند ثانیے دیوار پر دبکا اندر صحن میں گھورتا رہا پھر میدان صاف دیکھ کر وہ اندر کود گیا، چند ثانیے وہ دم بخود اپنی جگہ کھڑا رہا پھر سامنے والی کوٹھری کی جانب دبے پاؤں بڑھنے لگا...... کوٹھری کے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا اور اپنی کمر سے بندوق اتار کر ہاتھ میں تھام لی پھر دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازے کو ذرا اندر کی طرف دھکیلا...... دروازے کا ایک پٹ کھلتا چلا گیا، سامنے لالٹین کی مدھم لو میں اس نے چارپائی پر سانول اور ملوکاں کو بے خبر سوتے پایا تو جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے قہر آلود نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا پھر یکدم بندوق دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سیدھی کر لی۔

ادھر سارنگ اپنی کلہاڑی سنبھالے سانول کے گھر کے باہر آن موجود ہوا اور گہری نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا، اسے وہاں کوئی مشکوک بات محسوس نہ ہوئی تب اس نے خاموشی کے ساتھ واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ آچر خان ملک الموت کی صورت میں اندر قدم رکھ چکا تھا اور جو اپنی بندوق تانے سانول کے سینے کا نشانہ لئے ہوئے تھے، معانجانے کس طرح ملوکاں کی آنکھ کھل گئی، وہ آچر خان کو تو نہ پہچان سکی تاہم اس نے ہیولے کی شکل میں کسی کو سانول پر بندوق تانے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی...... سانول نے بھی فوراً آنکھیں کھول دیں، ادھر آچر خان نے بندوق کی لبلبی دبا دی، ادھر ملوکاں ایک ہذیانی چیخ کے ساتھ سانول کی ڈھال بن گئی، دم بخود فضا میں ایک دھماکہ ابھرا اور ملوکاں لہولہان ہو گئی، سانول فوراً خون میں لت پت ملوکاں کو اپنے اوپر سے ہٹا کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چارپائی سے اٹھا اور آچر خان پر جست لگائی...... آچر خان نے سنبھل کر سانول کا نشانہ لیتے ہوئے دوسرا فائر کیا، ایک اور کان پھاڑ دھماکا ہوا مگر اس وقت تک سانول، آچر خان کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ آچر خان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کی نال اوپر کر دی تھی نتیجتاً کارتوس کے مہلک چھرے چھت کی چوبی کڑیوں میں پیوست ہو گئے...... سانول نے ایک زوردار گھونسا آچر خان کے جبڑے پر رسید کیا، آچر خان کو اپنی داڑھ ہلتی ہوئی محسوس ہوئی مگر وہ بھی اتنی آسانی سے ڈھنے والا کہاں تھا، اس نے درد کی پروا کئے بغیر سانول کے پیٹ پر لات رسید کرنی چاہی مگر سانول پر اس وقت خون سوار تھا

لہٰذا اس نے آچر خان کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے مروڑنے لگا، آچر خان ایک ٹانگ پر ناچنے لگا، سانول نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا، آچر خان کو اپنی ٹانگ جوڑ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے حلق سے ہلکی کراہ نکل گئی، سانول نے اسے پھر سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور جنونیوں کے سے انداز میں آچر خان پر تابڑ توڑ لاتوں اور مکوں کی بارش کر دی...... آچر خان کے حلق سے غراہٹ آمیز کراہیں خارج ہونے لگیں، مار کھاتے کھاتے اچانک اس کا داؤ چل گیا اور اس نے لیٹے لیٹے سانول کے پیٹ پر لات رسید کر دی پھر وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا، ادھر باہر مطمئن ہو کر واپس لوٹتے ہوئے سارنگ کو بندوق چلنے کی دو مرتبہ آواز سنائی دی تو وہ ایک لمحے کو اپنی جگہ ٹھٹک کر رکا اور پھر تیزی کے ساتھ واپس دوڑا...... پھر وہ جیسے ہی سانول کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے کسی کو اچانک دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا پھر ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ ایک ہیولہ اس سے ٹکرا گیا، یہ آچر خان تھا، اس نے کلہاڑی بدست سارنگ کو دیکھا تو اسے دھکا دے کر گلی میں دوڑ لگا دی پھر اس کے عقب سے سانول غصے میں بپھرا ہوا نمودار ہوا۔

دونوں ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ ''سارنگ...... اس مردود کو پکڑو، یہ جانے نہ پائے۔'' سانول نے ہانپتی ہوئی پُرجوش آواز میں کہا۔ پھر دونوں آچر خان کے پیچھے دوڑ پڑے۔

☆======☆======☆

دونوں نے جلدی جلدی اپنا مختصر سا بوریا بستر لپیٹا، اس کے بعد پرویز نے سدھوراں سے کہا ''سدھوراں...... تم ادھر ہی رہنا، دروازے پر مت آنا، میں ابھی لوٹتا ہوں۔''

''تم...... تم کہاں جا رہے ہو اب......؟'' سدھوراں نے کسی خیال کے تحت تفکر سے پوچھا۔

''میں ابھی آجاتا ہوں...... تم بالکل پریشان مت ہونا'' پرویز نے اسے تسلی دی۔ ''آؤ دروازہ بند کر لو۔'' یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکلا۔

گلی کے اختتام پر میدان سا تھا جس کے سرے پر قطار در قطار سبزی اور گوشت وغیرہ کی دکانیں تھیں...... پرویز بغور آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے گلی سے نکلا تو اسے میدان کے وسط میں وہی سبز رنگ کی بائی روف کھڑی نظر آئی جو انسپکٹر یاور حیات کی رہائش گاہ سے بدستور اس کے تعاقب میں یہاں تک آ پہنچی تھی...... اس میں سوار چاروں افراد اب باہر اتر کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، پرویز یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ لوگ ہنوز ادھر ہی موجود تھے یا دفعان ہو چکے تھے تاہم پرویز اب جلدی واپس گھر لوٹ کر انہیں کسی تشکیک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ بظاہر ان کی طرف سے لاپرواہ ہو کر ایک سبزی کی دکان پر پہنچا اور ہلکی پھلکی خریداری کرکے وہ واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا۔

گھر آکر اس نے سدھوراں کو بتایا۔ ''سدھوراں......! دشمن ابھی تک ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے، یہ لوگ جب تک یہاں سے دفع نہیں ہو جاتے، ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

سدھوراں کے چہرے پر گہری تفکیر کے آثار نمودار ہو گئے پھر اس نے اسی لہجے میں پرویز سے پوچھا۔ ''پرویز......! آخر کون لوگ ہیں یہ......اور......تم......''

پرویز اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''یہ سارا چکر پولیس کا نہیں ہے سدھوراں......!'' یہ کہہ کر پرویز نے اسے ساری حقیقت تفصیل سے بیان کر دی۔

سدھوراں بولی۔ ''پرویز......! ہمیں اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ سے ضرور مشورہ کر لینا چاہئے، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہماری پوری پوری مدد کریں گی کیونکہ ایک بڑے پولیس افسر سے ان کی اچھی خاصی جان پہچان ہے۔''

پرویز اس کی بات سن کر چند ثانیے کسی پُر سوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد بولا۔ ''نہیں سدھوراں......! اس طرح حالات مزید خراب ہو جائیں گے، میں اس کمینے دلدار اور انسپکٹر یاور حیات کے خفیہ گٹھ جوڑ سے اچھی طرح واقف ہوں......وہ دونوں پھر بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر اندرون سندھ کے کسی دور پرے کے شہر میں چلے جائیں۔''

پرویز کی بات سن کر سدھوراں نے خاموشی اختیار کر لی مگر وہ پرویز کے اس اقدام سے پوری طرح متفق نہ ہوئی تھی۔

وقت، اندیشناک لمحوں کی اسرار بھری دھمک دیتا ہوا گزرنے لگا پھر تین چار گھنٹے اسی طرح گزر گئے تو پرویز گھر سے باہر نکلا، اس وقت رات کے آٹھ بجنے والے تھے، وہ سیدھا میدان کی طرف آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا......سبز رنگ کی وہ ہائی روف اب وہاں موجود نہ تھی پھر پرویز نے اچھی طرح تسلی کرنے کے لیے پورے محلے اور آس پاس کے علاقے کا ایک چکر لگایا، اس کے بعد اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے گھر لوٹ آیا، اس کے بعد دونوں نے اپنا مختصر سا بوریا بستر سمیٹا، پرویز نے اپنا پستول قبضے میں کیا۔ سدھوراں نے بچے کو اٹھایا اور اس کے بعد یہ دونوں گھر کو تالا لگا کر ٹیکسی میں آبیٹھے،

سدھوراں بچے کو گود میں لئے عقبی سیٹ پر بیٹھی جبکہ پرویز ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر پرویز نے ٹیکسی والے کو قدیم سکوائر چلنے کا کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے مختلف کوچز اور لاریاں اندرون سندھ کی طرف چلتی ہیں اور یہاں ان کا آخری اسٹاپ تھا۔ اس کے بعد یہ بسیں بغیر رکے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ یوں تو کینٹ اور صدر سے بھی لگژری کوچز چلتی تھیں مگر پرویز نے دانستہ ادھر کا رخ نہیں کیا تھا بلکہ اول تو اس کا ارادہ کسی لگژری کوچ میں سوار ہونے کا ہی نہیں تھا، وہ درحقیقت کسی عام سی مسافر لاری میں سوار ہونا چاہتا تھا، پرویز کا ارادہ جامشورو کے راستے دادو سے سیہون کی طرف نکلنے کا تھا جہاں اس کا ایک دور پرے کا رشتے دار رہتا تھا، وہ کھاد اور اناج کا کاروبار کیا کرتا تھا......ٹیکسی قیوم آباد کا چوک کراس کر چکی تھی، پرویز بظاہر خاموش مگر اردگرد سے محتاط ہو کر بیٹھا ہوا تھا، اسے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہو، پسنجر سیٹ پر موجود سدھوراں کے دل میں بھی طرح طرح کے پُراندیش خیالات امڈ رہے تھے......بچہ اس کی گود میں ہمک رہا تھا۔ سدھوراں اپنے دل میں یہی دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا کرے وہ بچے اور شوہر کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے بخیر و عافیت نکل جائیں۔ ٹیکسی کراچی کی گنجان شاہراہوں سے ہوتی ہوئی اپنی منزل کے قریب پہنچنے لگی تو ایک قدرے ویران جگہ پر اچانک عقب سے ایک گاڑی تیزی کے ساتھ ان کی ٹیکسی کو کراس کرتی ہوئی آگے کو نکلی اور پھر دوسرے لمحے ذرا آگے جا کر ان کا راستہ روکے سڑک پر ترچھی کھڑی ہو گئی، ڈرائیور نے فوراً بریک لگا دیے۔ پرویز بھی بری طرح چونک کر اس سڑک پر کھڑی ترچھی گاڑی کو دیکھنے لگا، وہ سبز رنگ کی ہائی روف تھی، ٹیکسی کے ٹائر رات کے سناٹے میں زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی، پرویز کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی، اس کی نظریں ہائی روف پر جم کر رہ گئیں، جب اس نے چار افراد کو بیک وقت ہائی روف سے نیچے اترتے دیکھا تو اس نے بھی جلدی سے اپنا پستول نکال لیا، وہ چاروں مسلح نظر آرہے تھے، ٹیکسی ڈرائیور بھی بے چارہ اس اچانک صورت حال پر پریشان سا ہو گیا تھا، پرویز نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پستول سیدھا کرکے ونڈ اسکرین سے ہی ان چاروں کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو تین فائر جھونک مارے، ونڈ اسکرین کا شیشہ کرچیوں کی صورت میں بکھر گیا، پستول سے شعلے ابھرے، چار افراد میں سے دو تیورا کر گرے باقی یکدم واپس ہائی روف کی طرف آڑ لینے کو دوڑے، ٹیکسی ڈرائیور خوف زدہ ہو کر اپنی طرف کا دروازہ کھولے بھاگ اٹھا، پرویز بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر سرک گیا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی آگے بڑھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دی، عقب میں گولیوں کی بھیانک بوچھار سنائی دی مگر پرویز ٹیکسی کو نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا، وہ اب اندھا دھند ٹیکسی کو دوڑائے چلا جا رہا تھا، اردگرد بنے مکانوں کا سلسلہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا، بائی روف بھی مسلسل تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی، وہاں سے اکا دکا گولیاں بھی چلائی جا رہی تھیں، سدھوراں، پرویز کی ہدایت کے مطابق بچے سمیت سیٹ پر لیٹ گئی تھی، دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی ویران علاقے میں آ گئی تھیں۔ یہ سپر ہائی وے سے پرلی طرف کا ایک نیم پختہ ذیلی راستہ تھا، اب عقب سے متواتر فائرنگ ہونے لگی دفعتاً ٹیکسی کا پچھلا شیشہ دھماکے سے ٹوٹ گیا، عقبی سیٹ پر اپنے بچے کو سینے سے بھینچے دبکی ہوئی سدھوراں کے حلق سے بے اختیار چیخ خارج ہو گئی، شیشوں کی نوکیلی کرچیوں کی بارش نے اسے یکدم بوکھلا سا دیا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں سدھوراں......؟'' معاً پرویز نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں......! میں ٹھیک ہوں۔'' سدھوراں نے لرزتی آواز میں کہا۔

تب پھر اچانک ٹیکسی کا پچھلا ٹائر ایک دھماکے سے پھٹا، شاید پیچھے آنے والوں کی مسلسل فائرنگ کی کسی بھولی بھٹکی گولی کا یہ شاخسانہ تھا، ٹائر کے فلیٹ ہوتے ہی ٹیکسی کا توازن بگڑ گیا اور وہ ایک طرف کو جھک گئی...... پرویز پریشان ہو گیا، اس نے بمشکل گاڑی قریب کی خودرو جھاڑیوں میں روکی اور سدھوراں کو باہر اترنے کا کہا پھر وہ بڑی پھرتی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سامنے عقب میں اسے بائی روف کی ہیڈ لائٹس نظر آئی جو آندھی طوفان کی طرف دوڑتی ہوئی قریب تر آ چکی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کے ٹائرز زور سے سمع خراش آواز میں چرچرائے تھے، پرویز نے اپنی گاڑی کی آڑ سے نشانہ لے کر فائر جھونک مارا، بائی روف کی ونڈ اسکرین ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹی تھی، پرویز کو اگلی سیٹ میں صرف دو افراد کے ہیولوں کی جھلک دکھائی دی تھی تاہم اس کے فائر کرنے سے پہلے ان دونوں نے فوراً اپنے سر نیچے جھکا لئے تھے، اس دوران سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے باہر نکل آئی تھی، پرویز کے پاس محدود تعداد میں فاضل راؤنڈ تھے اس لیے اس نے دشمن کے سامنے ڈٹے رہنے کی بجائے فرار کی حکمتِ عملی پر عمل کیا اور پھر سدھوراں کا ہاتھ پکڑے تاریکی میں دوڑتا چلا گیا۔

چند قدموں کے فاصلے پر یہ گنجان جھاڑیوں کا ذخیرہ تھا، وہ فوراً سدھوراں کو لئے اس کے عقب میں آ گیا، آڑ میسر آتے ہی اس نے بائی روف کی طرف دیکھا، وہ دونوں دشمن

دائیں بائیں کا دروازہ کھول کر نیچے رینگ گئے تھے، پرویز نے ان پر باری باری دو فائر جھونک دیئے مگر کوئی گولی نشانے پر نہ گئی، پرویز نے بڑی پھرتی سے سامنے نظر رکھتے ہوئے اپنی جیب سے فاضل راؤنڈ نکالے اور پستول کا میگزین فل کرنے لگا، اس دوران دشمنوں نے بیک وقت دو سمتوں سے برسٹ داغے، ایک گولی جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی پرویز کی ران میں پیوست ہو گئی، پرویز کو یوں لگا جیسے کسی نے گرم سلاخ اس کی ران میں گھسیڑ دی ہو، اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، سدھوراں ہراساں ہو گئی۔

''سس...... سدھوراں......! تو بچے کو لے نکل جا...... میں دشمنوں کو روکے ہوئے ہوں۔''

سدھوراں دہل گئی۔ ''نہیں پرویز......! میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' سدھوراں نے دکھ کے کرب ناک احساس کے ساتھ کہا۔

پرویز جھلا کر بولا۔ ''سدھوراں......! مجھے کچھ نہیں ہوگا...... وقت ضائع مت کرو ورنہ کچھ نہیں بچے گا...... دشمن تجھے اور تیرے بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

ٹھیک اسی وقت دوبارہ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور پرویز کے حلق سے اذیت ناک چیخیں خارج ہو گئیں، اس کا دایاں شانہ دشمنوں کی گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ سدھوراں، پرویز کو لہولہان دیکھ کر چلا اٹھی۔

پرویز نے اپنی اذیت ناک تکالیف پر قابو پاتے ہوئے تین چار جوابی فائر داغ دیئے۔

''سدھوراں......! تت...... تجھے بچے کی قسم، بھاگ جا میری قربانی ضائع مت کر...... جا...... جا۔'' پرویز نے بمشکل سدھوراں سے کہا تو سدھوراں کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا، اس نے ایک گہری اور دکھ بھری گویا آخری نگاہ اپنے زخمی شوہر پر ڈالی اور پھر وہ آنسوؤں بھرے غمناک چہرے کے ساتھ بچے کو سینے سے لگائے تاریکی میں دوڑ پڑی۔

پرویز اب زمین پر گر چکا تھا اور مسلسل دشمنوں پر فائرنگ کئے جا رہا تھا پھر اچانک وہ بے دم سا ہو کر زمین پر ڈھیلا سا پڑ گیا، پستول اس کے ہاتھ میں ہی دبا رہ گیا تھا۔ ادھر دونوں دشمنوں نے یہ سمجھا شاید پرویز مر چکا ہے پھر وہ دونوں فائرنگ روک کر اپنے دونوں ہاتھوں میں رائفلیں تانے محتاط روی کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگے، وہ دونوں جیسے ہی پرویز کے قریب پہنچے، پرویز کے بے حس و حرکت وجود نے غیر محسوس جنبش لی اور اس نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستول سے ان دونوں پر تلے اوپر تین چار فائر کر ڈالے۔ تاروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی مدہم روشنی میں دشمنوں کو پرویز سے اس جان لیوا حرکت کی بالکل توقع نہ تھی نتیجتاً ایک نے تو خود کو فوراً بچالیا جبکہ دوسرے کا پیٹ چھلنی ہوگیا اور وہ بھیانک آواز نکال کر زمین بوس ہوگیا جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے پرویز پر پورا برسٹ فائر کردیا، پرویز حلق سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

☆======☆======☆

سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے ایک ویرانے میں دوڑی چلی جارہی تھی، اس کی کوئی منزل نہیں تھی، کوئی پناہ نہیں تھی بس صرف ایک اندھی سمت تھی اور وہ تھی۔ اس کے سر کی چادر کھسک چکی تھی اور پاؤں جوتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے، اس کی سانس بے تحاشا پھولی ہوئی تھی، وہ دوڑتے دوڑتے بے حال سی ہورہی تھی لیکن اس نے دوڑنا ترک نہیں کیا تھا، جب ایک مقام پر وہ گرتے گرتے بچی تو اس کا دم بے دم ہو چکا تھا، وہ گر پڑنے کے ڈر سے ذرا رک گئی اور اپنی سانسیں بحال کرنے لگی، اس نے عقب میں دیکھا تو اسے پُرہول تاریک سناٹے کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا، حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے راستے کا تعین کرنے کی سعی کرتے ہوئے سوچا کہ وہ جس اندھی سمت میں دوڑ رہی تھی، وہ اسے ویرانوں کی طرح بھٹکا سکتی تھی چنانچہ اس نے بڑی اور پختہ سڑک کا تعین ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی سمت تبدیل کی اور پھر سیدھے رخ پر دوڑنے کی بجائے اس نے اب تیز تیز قدموں سے اپنی بائیں سمت چلنا شروع کردیا پھر دفعتاً اسے اپنے عقب میں گولیوں کے برسٹ چلنے کی خوفناک گرج سنائی دی، اس کے حلق سے غیر ارادی چیخ خارج ہوگئی اور پھر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک بار پھر اندھا دھند دوڑنا شروع کردیا تب اسے چانک یہ جاں گسل احساس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں دوڑا چلا آرہا تھا جو یقیناً اس کے دشمن کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی ہانپتی ہوئی بلند غراہٹ سے مشابہہ للکار سنائی دی۔

''رک جاؤ لڑکی......! ورنہ میں گولیوں سے تمہارا وجود چھلنی کردوں گا...... تم میرے نشانے پر ہو۔'' اس آواز کے ساتھ ہی عقب سے دوبارہ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور سدھوراں کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آن اٹکا اور وہ اس ڈر سے رک گئی کہ تعاقب میں آنے والے دشمن کہیں اسے اور اس کے معصوم بچے کو اپنی بربریت کا نشانہ نہ

بنالیں چنانچہ وہ بے چاری شکست خوردہ انداز میں رک گئی اور ہراساں ہرنی کی طرح متوحش نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھنے لگی تو اسے تاروں کی مدہم روشنی میں ایک رائفل بدست شخص اپنی طرف دوڑ کر آتا ہوا نظر آیا۔

سدھوراں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی، اس کا دل خوف سے بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا، اتنے میں رائفل بدست دشمن اس کے قریب آکر رک گیا، وہ اب قہر آلود نظروں سے سدھوراں پر اپنی رائفل تانے اسے گھور رہا تھا، سدھوراں کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزہ براندام تھا۔

''چلو میرے ساتھ......اگر تو نے ذرا بھی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو تیرے شوہر پرویز کی طرح تجھے اور تیرے بچے کو بھی گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔'' دفعتاً دشمن نے سفاک لہجے میں اسے حکم دیتے ہوئے کہا اور بے چاری سدھوراں، پرویز کے اس دنیا سے کوچ کر جانے پر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رودی...... اسے روتا دیکھ کر دشمن غصے سے اس کے قریب آیا اور اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ رونا دھونا چھوڑ اور چل میرے ساتھ ورنہ......؟''

سدھوراں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

دونوں تاروں بھری مدہم روشنی میں دم بخود ہیولوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔

ہائی روف کے قریب پہنچ کر رائفل بدست نے اسے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر سوار کرایا اور پھر گاڑی آگے بڑھادی۔

☆======☆======☆

سانول اور سارنگ نے تاریک گلی کے اختتام پر ہی آچر خان کو پکڑ لیا۔

''سارنگ......! اس مردود کو لے چلو واپس...... ملوکاں کی حالت نازک ہے، اللہ سائیں خیر کرے۔'' سانول نے دکھ سے بھری ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر آچر خان کو دبوچے یہ دونوں واپس گھر پہنچے تو ملوکاں اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکی تھی، سارنگ نے اپنی بہن کو خون میں لت پت مردہ حالت میں دیکھا تو وہ غم و غصے سے پاگل ہوگیا تب اس نے آچر خان کو فرش پر دھکا دیا اور غضب ناک انداز میں اپنی کلہاڑی بلند کرلی۔

مارے دہشت کے آچر خان اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا رہ گیا مگر سانول نے فوراً آگے بڑھ کر سارنگ کا کلہاڑی والا ہاتھ پکڑ لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''نہیں سارنگ ...!اس مردود کے غلیظ خون سے اپنے ہاتھ مت خراب کر......''

''نہیں سانول ...!اس کتے نے میری معصوم بہن کا قتل کیا ہے، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، تو پرے ہٹ جا بھرا...!'' سارنگ شدت غیظ وغضب سے دھاڑا مگر سانول نے سارنگ کے ہاتھوں سے کسی طرح کلہاڑی چھین ہی لی۔

''ہوش کر سارنگ ...! ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے، کیا اس کو مار کر تو پھانسی چڑھے گا؟'' سانول نے ایک بار پھر اسے سمجھایا اور پھر غصے سے آچر خان کو گھورتے ہوئے گریبان سے کھینچ کر کھڑا کر دیا اور وہ اسے تھانے کی طرف لے چلے۔

تھانے پہنچے تو ڈیوٹی پر متعین ایک سپاہی نے آچر خان کو اس حالت میں دیکھا اور پھر سانول اور سارنگ کی زبانی آچر خان کے قتل کی واردات میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر فوراً حرکت میں آیا اور اپنے دو ساتھی سپاہیوں کی مدد سے پہلے آچر خان کو ہتھکڑیاں لگا دیں پھر ایک سپاہی تھانے کے احاطے میں ہی بنے کوارٹر میں محو استراحت انسپکٹر چھٹل شاہ کو خبر دینے چلا گیا۔

ذرا دیر بعد سانول اور سارنگ، انسپکٹر چھٹل شاہ کے سامنے اپنے بیانات قلمبند کروانے لگے۔ ''اب اس مردود کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا، میں خود کل عدالت لے جا کر اس کا ریمانڈ لے کر رہوں گا۔'' بیانات مکمل کرنے کے بعد انسپکٹر چھٹل شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

☆======☆======☆

وہ بدمعاش، سدھوراں کو یرغمال بنائے اپنی ہائی روف میں اڑا جا رہا تھا۔

سدھوراں اپنے بچے کو سینے سے لگائے مضطرب سی برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی، اپنے شوہر پرویز کے قتل کا سن کر اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہے چلے جا رہے تھے، اس کا چہرہ غم واندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا، وہ بار بار کن انکھیوں سے اپنے ساتھ بیٹھے دشمن کو دیکھ رہی تھی اور اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں کیونکہ اسے اس کی زبانی اس کربناک حقیقت کا علم ہوا تھا کہ اس بدبخت نے اس کے شوہر پرویز کو قتل کر دیا ہے اور غم واندوہ میں مبتلا ہونے کے باوجود سدھوراں کا دل اس مردود خونی قاتل کے لیے نفرت، انتقام کے مارے جل رہا تھا۔ سدھوراں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل اس مردود کا خون پی جائے، دشمن کی رائفل اس کے قریب ہی سیٹ کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک لمحے کو سدھوراں کے جی میں یہ جارحانہ خیال ابھرا کہ وہ فوراً اس کی رائفل پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے مگر وہ اپنے معصوم بچے کی وجہ سے اس جارحانہ اور خطرناک خیال سے گریزاں رہی چنانچہ سردست اس نے خود کو دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ بالکل ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کہاں اور کس کے پاس لے جایا جا رہا تھا، بچہ اس کی زنجیر بنا ہوا تھا اور خود سدھوراں کی اپنی عزت اس کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی، وہ دل ہی دل میں آنکھیں موندے اللہ سے اس مشکل گھڑی سے نجات پانے کی دعائیں کرنے میں مصروف ہوگئی، عزت اور بچہ......! اس وقت دونوں ہی اس کی مجبوری تھے۔

ہائی روف پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی، وہ اب ویران اور بنجر علاقے سے نکل کر شاہراہ عام پر آ کر ٹریفک کے روشن سیلاب میں دوڑنے لگی پھر مزید گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ہائی روف ایک متمول علاقے میں داخل ہوگئی، یہاں ہر سو گہرا سناٹا طاری تھا، سدھوراں اس علاقے کو پہچان کر دھک سے رہ گئی، یہی تو وہ نوتعمیر شدہ مکانوں اور بنگلوں کا علاقہ تھا جدھر اس شیطان صفت انسپکٹر یاور حیات کی نئی رہائشگاہ تھی۔

ہائی روف ایک نوتعمیر شدہ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی، دشمن نے جلدی جلدی دو تین بار ہارن بجایا تو ذرا ہی دیر بعد ایک چوکیدار نے گاڑی اور گاڑی والے کو پہچان کر گیٹ وا کر دیا، ہائی روف ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور اندر داخل ہوگئی، سدھوراں کی کنپٹیاں اندیشناک وسوسوں کے مارے سائیں سائیں کرنے لگیں اور دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح دھڑکنے لگا۔

ہائی روف اندر پورٹیکو میں جا کھڑی ہوئی۔

اس بدمعاش قاتل نے ایک بار پھر ہارن بجایا اور پھر سدھوراں کو درشت لہجے میں اترنے کا کہہ کر خود بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولے نیچے اتر آیا، ناچار سدھوراں بھی لرزتی کانپتی ہوئی نیچے اتر آئی، مسلح چوکیدار بدمعاش کے قریب آیا تو اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

''صاحب کیا کر رہا ہے۔''

''وہ تو آرام کر رہے ہیں۔'' چوکیدار نے کھردرے لہجے میں کہا۔

بدمعاش کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے...... اس چھوکری کو پچھلے کمرے میں لے جا کر بند کر دو...... میں صاحب سے ملتا ہوں جب تک......''

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سدھوراں کو بازو سے پکڑ کر بنگلے کے بعد ترین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گوشے میں ایک اسٹور نما کمرے میں لے آیا اور پھر اسے اندر بند کر دیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا، سدھوراں کو یہاں وحشت سی ہونے لگی، اس نے کسی طرح اپنے ایک ہاتھ کی مدد سے سوئچ بورڈ کو ٹٹولا اور کمرے کی بتی جلا دی، کمرے میں جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا، سدھوراں کا ویسے ہی تھکن سے برا حال تھا، وہ وہیں گندے فرش پر ایک خالی کونے میں بچے کو لے کر بیٹھ گئی، بچے نے رونا شروع کر دیا، سدھوراں نے ایک ممتا بھری پریشان کن نگاہ اپنے روتے ہوئے ہلکان بچے پر ڈالی اور پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا، اس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے پریشان کن وسوسے سر اٹھانے لگے، وہ اس منحوس بنگلے کو پہچان چکی تھی، یہ اس مردود اور عیاش انسپکٹر یاور حیات کا ہی بنگلہ تھا جہاں وہ پہلے بھی ایک بار قید ہو چکی تھی، اس وقت اس کے ہمراہ پرویز بھی تھا پھر وہ دونوں انسپکٹر یاور حیات اور دلدار کی قید سے فرار ہو گئے تھے، پرویز کا خیال دل میں آتے وہ رنجوری ہو گئی اور فرطِ غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ اپنے بچے کی خاطر جینا چاہتی تھی اور چاہے جیسے بھی حالات ہوں، وہ ان سے بے دھڑک ٹکرا جانے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی، بچہ سو چکا تھا، سدھوراں نے گہری نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیا پھر وہ اٹھ کر دروازے کی طرف آئی، اسے ہلکا سا کھینچ کر دیکھا تو حسب توقع اسے باہر سے بند پایا، وہ ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹی، ننھے سے بچے کو اس نے زمین پر لٹا دیا تھا، خود وہ کاٹھ کباڑ سے کوئی کار آمد شے ڈھونڈنے لگی، جلد ہی اسے ایک سریا نما ایک ٹیڑھی میڑھی سلاخ نظر آ گئی، اس نے لپک کر اسے کھینچ کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی، اب وہ کسی کے اندر آنے کی منتظر تھی۔

کافی دیر گزر گئی کوئی اندر نہ آیا تو سدھوراں اپنے بچے کے قریب ہی بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

☆======☆======☆

ملوکاں کی تدفین کو آج آٹھواں روز تھا، سانول کو اب اپنے بھائیں بھائیں کرتے گھر سے وحشت سی ہونے لگی تھی بلکہ اس کا تو اب پورے گوٹھ سے ہی دل اچاٹ ہو چکا تھا، اب تو ماما اللہ رکھیو رہا تھا اور نہ ہی ملوکاں ...... ! سانول کا یہاں کوئی بھی تو نہ رہا تھا سوائے غمناک اور دکھ بھری یادوں کے جو ہر وقت اس کی آسیبی تنہائیوں میں اسے ڈستی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن یوں ہوا سانول نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور خاموشی سے اس گوٹھ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

وہ شہر جانے والی شاہراہ پر آن کھڑا ہوا تھا، اس وقت صبح صادق تھی، سانول نے

کراچی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بڑا مہربان شہر ہے، اس کی آغوش وسیع تھی جس کی بانہوں میں کھو کر انسان سب کچھ بھول جایا کرتا ہے۔ پھر وہ کراچی جانے کے ارادے سے ایک مسافر لاری میں سوار ہو گیا۔

لگ بھگ کوئی دو تین گھنٹوں کے بعد وہ کراچی جیسے بھرے پرے شہر میں داخل ہو چکا تھا، یہاں آ کر اسے عجیب سا احساس ہونے لگا، اسے یوں لگا جیسے یہاں اس کا کوئی اپنا بھی موجود تھا، کوئی ایسا اپنا شخص، ایک ایسی ہستی جسے اس نے دل سے چاہا تھا، ایک بے چینی تھی جو اسے بے کل کیے دے رہی تھی، وہ پھر جیسے بے سروسامانی کے عالم میں بے مقصد مصروف شاہراہوں میں آوارہ گردی کرنے لگا۔

☆======☆======☆

سدھوراں کی اچانک آنکھ کھلی، کمرے کے روشندان سے سورج کی تیز روشنی اندر داخل ہو رہی تھی، وہ تڑپ کر یکدم اٹھی، قریب ہی لیٹے اپنے سوتے ہوئے بچے کو اٹھایا تو وہ کسمسا کر جاگ اٹھا اور رونے لگا، سدھوراں نے اسے فوراً سینے سے لگا لیا۔

سریا اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا، بچے کو دودھ پلانے کے دوران اس نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا، تھوڑی دیر اسی طرح گزر گئی تھی کہ معاً دروازے پر آہٹ ہوئی، سدھوراں کا دل یکبارگی زور سے دھڑکنے لگا، وہ فوراً اٹھی تو اس کے ہاتھ میں سریا تھا، وہ جلدی سے لپک کر کاٹھ کباڑ کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ گئی اور اوٹ سے اس نے دروازے کی طرف نظریں جما دیں، اس نے نہایت آہستگی سے اپنے بچے کو فرش پر ڈال دیا تھا، وہ معصوم ان کڑے حالات سے بے خبر اپنے ننھے منے ہاتھوں، پیروں کو ہلا جلا رہا تھا، سدھوراں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ آہنی سریا مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا پھر اچانک اس نے دیکھا کمرے کا دروازہ ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک شخص کو اندر آتا دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئی، یہ دلدار تھا، وہی منحوس شخص جس نے اس کی اچھی بھلی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا اور ہنستی بستی زندگی کڑے موسموں کی زد پر آ چکی تھی، دلدار تنہا تھا، وہ حیرت اور الجھن آمیز متلاشی نظروں سے دائیں بائیں گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

پھر جب وہ مزید اندر آیا تو سدھوراں ہمت کر کے محتاط روی سے کاٹھ کباڑ کی آڑ لیتی ہوئی اچانک اس کے عقب میں نمودار ہوئی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے آہنی سریئے کی بھرپور ضرب اس کے سر کے پچھلے حصے پر رسید کر دی، دلدار کے حلق سے وحشیانہ چیخ ابھری اور وہ لڑکھڑا سا گیا، اس نے ڈگمگاتے قدموں سے اپنا خون آلود سر تھام لیا مگر سدھوراں پر تو اس وقت ہسٹریائی جنون سوار تھا، وہ انتقام کے جذبے سے مغلوب ہوئی جا رہی تھی، اس نے پھر اوپر تلے تین چار ضربات کے ساتھ دلدار کا سر کھول کر رکھ دیا... دلدار کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا، اس کے سر کا کچومر نکل چکا تھا، سدھوراں کا جنون کم ہوا تو اس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا اور لپک کر اپنے بچے کو گود میں لے لیا پھر دلدار کے بے سدھ پڑے کپڑوں کی تلاشی لی تو حسب توقع اس کی جیب سے ایک سیاہ نال والا خوفناک پستول نکل آیا، آتشیں ہتھیار کے ہاتھ میں آتے ہی سدھوراں کا دل اور بڑھ گیا، وہ ایک ہاتھ سے اپنا بچہ سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں پستول لئے کمرے سے نکلی تو ٹھٹک کر رک گئی، سامنے بنگلے کے وسیع احاطے میں اسے انسپکٹر یاور حیات سادہ لباس میں آتا ہوا دکھائی دیا، اس کے ہمراہ رات والا وہی بدبخت قاتل بھی تھا جس نے پرویز کا قتل کیا تھا، اس کی کمر سے ابھی تک رائفل جھول رہی تھی، وہ دونوں سدھوراں کو دیکھ کر چونک کر رکے پھر جیسے ہی اس بدمعاش قاتل نے اپنی رائفل سنبھالنے کی کوشش کی، سدھوراں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول سے دو تین تلے اوپر فائر کر ڈالے، تینوں گولیاں اس قاتل بدمعاش کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

انسپکٹر یاور حیات کے چہرے پر یکایک موت کی زردی چھا گئی، سدھوراں نے اسے للکارا ”خبردار......! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تیرا بھی یہی حشر کروں گی۔“

اس نے یکدم اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے، اس اثناء میں دھماکوں کی آواز سن کر چوکیدار بھی وہاں آ گیا تو سدھوراں نے اسے بھی دھکا کر دونوں کو دیوار کے ساتھ لگ جانے کا حکم دیا، وہ دونوں سدھوراں کا بلاچوں چراں حکم ماننے پر مجبور تھے پھر سدھوراں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی اور بنگلے کے گیٹ کو باہر سے بند کر دیا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو ایک طرف پھینکا اور دیوانہ وار اپنا بچہ سنبھالے دوڑ پڑی پھر جلدی ہی اسے ایک ٹیکسی مل گئی، وہ اس میں سوار ہو گئی، ٹیکسی والے کو اس نے فی الحال یہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔

ٹیکسی والا کوئی بھلا مانس تھا، وہ اس کی مجبوری سمجھ کر اپنی ٹیکسی کو دوڑاتا ہوا مصروف شاہراہ پر لے آیا، دفعتاً سدھوراں کی نگاہ فٹ پاتھ کے کنارے ایک شخص پر پڑی تو جیسے وہ دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اس نے سانول کو دیکھ لیا تھا، پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ٹیکسی والے کو رکنے کا کہا اور پھر خود جلدی سے اتر کر دوڑتے ہوئے سانول کو دیوانہ وار پکارتی ہوئی فٹ پاتھ پر دوڑ پڑی، ادھر سانول بھی رک گیا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی بچھڑی ہوئی، صدیوں سے بچھڑی ہوئی کائنات دوڑی چلی آ رہی ہو۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، سانول کو سدھوراں سے جو شکوہ تھا، کڑے حالات کی مجبوری نے دونوں بچھڑے ہوئے دلوں کو بالآخر سمجھوتے پر مائل کر دیا تھا، سانول نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کیا، سدھوراں نے جلدی جلدی اسے اپنے خطرناک حالات کے بارے میں آگاہ کیا تو سانول کو پھر یہ شہر بھی نامہربان محسوس ہونے لگا۔

پھر تھوڑی دیر بعد دونوں نے ہمیشہ کا ساتھ نبھانے کے لیے اس شہر کو خیرباد کہنے کا آخری فیصلہ کر لیا۔

وہ دونوں اب نامعلوم منزل کی طرف بڑھ چکے تھے، انہیں یقین تھا کہ وہ نامعلوم منزل ان کے لیے خوشیوں اور راحت کا باعث ہو گی جہاں پھر کوئی غم، کوئی خوف اور ڈر نہ ہو گا، بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اور وہ ہوں گے۔

☆====== **ختم شد** ======☆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : **www.iqbalkalmati.blogspot.com**